
ماہنامہ
کرن
فروری 2024
www.pklibrary.com
www.pklibrary.com
پی کے لائبریری

www.pklibrary.com

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

www.pklibrary.com



واٹس ایپ
03172266944

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) —— 1,800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ — 25000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

کرن کتاب

مستقل سلسلے

فروری 2024
جلد 45 شمارہ 11
قیمت 150 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

www.pklibrary.com

مُدیرہ

اداریہ

جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت کو کبھی استحکام نصیب نہ ہوا، مسلسل بحرانوں سے گزرتے رہے، وطن دولخت ہوگیا۔ پھر بھی سنبھل گئے، لیکن جس فتنہ پرور دور سے آج گزر رہے ہیں ۔ یہ صورت حال تو کبھی نہ ہوئی تھی ایک طرف معاشی حالات ہیں ۔ مہنگائی، بے روزگاری ہے دوسری طرف اخلاقی اقدار کا زوال ہے۔ جو زیادہ خطرناک ہے۔ اگر آپ قوموں کے زوال کے اسباب پر غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان قوموں میں اخلاقی اقدار ختم ہوگئی تھیں ۔ وہ بد دیانتی اور بے راہ روی کا شکار تھے۔

پچھلے کچھ سالوں سے ہمارے ہاں تو جوانوں میں غصہ اور اشتعال بڑھتا جارہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ گالم گلوچ، بدزبانی پر اتر آتے ہیں۔ اس کی بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن بنیادی وجہ مایوسی ہے۔ یہ لوگ اس نظام سے مایوس ہیں ۔ ان کو کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا ہے۔ بے سمتی کی یہ کیفیت بڑھ جائے تو کتنی خطرناک ہوسکتی ہے۔ ہم سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔

سالگرہ نمبر

کرن نے ایک اور سال کا سفر طے کیا۔ اس شمارے کے ساتھ کرن نے اپنی عمر عزیز کے 25 سال مکمل کر لیے ہیں ۔ ایک طویل مسافت لیکن اللہ کا کرم شامل حال رہا اور ہم کامیاب ٹھہرے۔

مارچ کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ مصنفین سے التماس ہے اپنی تحریریں جلد از جلد بھجوادیں تا کہ سالگرہ نمبر میں جگہ پاسکیں۔

اس شمارے میں

☆ اداکارہ ''عائزہ خان'' سے ملاقات
☆ اس ماہ ''اقصیٰ شہزاد'' کے ''مقابل ہے آئینہ''
☆ ''تاش گھر'' ایمل رضا کا سلسلہ وار ناول
☆ مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول ''دامن سحاب''
☆ ''کسوف'' قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول
☆ عقیلہ ہاشمی کا مکمل ناول ''اک لمحہ جاوداں''
☆ ''سپاس گزار'' میمونہ صدف کا ناولٹ
☆ ام اقصیٰ کا ناولٹ ''شب ہجر''
☆ عطیہ خالد، عندلیب زہرہ، جویریہ مریم، ہاجرہ عمران ناز نمین فردوس اور تیشہ فرہاد کے افسانے اور مستقل

www.pklibrary.com

حمد باری تعالیٰ

تو ہی رحمان ہے یارب، جہانوں پر تیری رحمت
زمینوں آسمانوں پر، زمانوں پر تیری رحمت

نبیؐ کے جانثاروں اور پیاروں پر تیری رحمت
ہدایت کے میناروں چار یاروں پر تیری رحمت

جوانوں، بوڑھوں، بچوں، مرد و عورت پر تیری رحمت
برستی ہے سدا آقاؐ کی اُمت پر تیری رحمت

جہاں بھر کی بہاروں، آبشاروں پر تیری رحمت
ہے سورج کی شعاعوں، چاند تاروں پر تیری رحمت

فضاؤں، کہکشاؤں پر، ہواؤں پر تیری رحمت
نظر آتی ہے ماؤں کی دعاؤں پر تیری رحمت

مؤذن کی اذانوں، سب زبانوں پر تیری رحمت
نبیؐ کے شاعروں اور نعت خوانوں پر تیری رحمت

نعت رسول مقبولؐ

اے عشقِ نبیؐ میرے دل میں بھی سما جانا
مجھ کو بھی محمدؐ کا دیوانہ بنا جانا

جو رنگ کہ جامی پر رومی پہ چڑھایا تھا
اس رنگ کی کچھ رنگت مجھ پہ بھی چڑھا جانا

قدرت کی نگاہیں بھی جس چہرے کو تکتی تھیں
اس چہرۂ انور کا دیدار کرا جانا

جس خواب میں ہو جائے دیدارِ نبیؐ حاصل
اے عشق کبھی مجھ کو نیند ایسی سُلا جانا

دیدارِ محمدؐ کی حسرت تو رہے باقی
جز اس کی ہر اک حسرت اس دل سے مٹا جانا

دُنیا سے ریاضؔ ہو جب عقبیٰ کی طرف جانا

www.pklibrary.com

عائزہ خان سے ملاقات

شاہین رشید

عائزہ خان آج کل بہت ایکٹو ہیں تو اتر سے ڈراموں میں بھی نظر آ رہی ہیں اور کمرشلز میں بھی...... ایک دو کمرشلز کمپنی کی برانڈ ایمبیسڈر بھی ہیں۔ آج کل آپ انہیں ڈرامہ سیریل "میں" میں دیکھ رہے ہوں گے اور ہاں "جان جہاں" بھی آن ایر ہے۔

"کیسے مزاج ہیں عائزہ صاحبہ؟"

"الحمدللہ۔"

"آج کل تو ماشاءاللہ خوب کام کر رہی ہیں۔ گیپ کیوں دیا تھا۔ اور اب کیسا لگ رہا ہے؟"

"گیپ کا تو خیر سب کو پتا ہے کہ کیوں دیا۔ بچے چھوٹے تھے، گھر سنبھالتی یا بچوں کو! خیر اب دوبارہ آ کر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے اپنا گھر اپنے بچے اور اپنے شوہر سے بہت پیار ہے اور میں اپنے شوہر کا خیال بھی ایسے ہی رکھتی ہوں جیسے بچوں کا۔"

"کیا ایک ورکنگ وومن گھریلو وومن سے زیادہ اچھی ماں ثابت ہوتی ہے؟"

"اس کے بارے میں مجھے کچھ زیادہ علم نہیں ہے البتہ میں یہ ضرور جانتی ہوں کہ جب میں اس فیلڈ میں دوبارہ آئی تو مجھے معلوم تھا کہ یہ فیلڈ میرا کیریئر ہے۔ میری جاب ہے اور بچوں کو کس طرح مینج کرنا ہے اور میں نے کیا۔ الحمدللہ مجھے یاد ہے کہ جب میں

کو سب کچھ پتا ہوتا ہے خاص کر ورکنگ وومن کو کہ کس طرح مینج کرنا ہے۔"

"پھر صبح تو جلدی ہو جاتی ہوگی آپ کی؟"

"کوئی یقین نہیں کرے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں صبح چھ بجے اٹھ جاتی ہوں۔ بچوں کا ناشتا بناتی ہوں۔ ان کا لنچ تیار کرتی ہوں اور سات بجے انہیں اسکول لے جاتی ہوں۔"

"دانش کیا کرتے ہیں ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"مت پوچھیں ان کے بارے میں، انہیں تو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ سب کچھ مجھے ہی معلوم ہوتا ہے۔ کس کی شادی قریب ہے۔ کس کی سالگرہ قریب ہے۔ کس کو کیا تحفہ دینا ہے۔ اور جب میں انہیں بتاتی ہوں تو حیران رہ جاتے ہیں کہ اچھا تم نے یہ سب کچھ کر لیا اور مجھے معلوم ہی نہیں ہوا۔ پھر وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور دل سے خوش ہوتے ہیں۔"

"دانش صاحب کو آپ کی کون سی بات بہت بھاتی ہے؟"

"یہی کہ میں ہر چیز کو ہر مسئلہ کو بڑی آسانی سے مینج کر لیتی ہوں۔ اور جب وہ میری تعریف کرتے ہیں تو دل اندر سے خوش ہوتا ہے۔"

"آپ کو خود اپنی کون سی بات متاثر کرتی ہے؟"

www.pklibrary.com

رکھتی ہوں۔"

"آپ کی ایسی خوبی جس کا ابھی تک کسی کو علم نہ ہو؟"

"علم تو خیر تھوڑا بہت سب کو ہی ہے کہ میں ڈانس بہت اچھا کر لیتی ہوں اور جب میں جم جا کر ایکسر سائز کرتی ہوں تو میں ڈانس کر کے ہی کرتی ہوں۔ شوق بھی پورا ہو جاتا ہے اور ایکسر سائز بھی ہو جاتی ہے۔"

"پھر تو آپ کو موی میں کام ضرور کرنا چاہیے اور اگر موی کریں گی بھی تو کیا موضوع ہونا چاہیے؟"

"یہ آپ نے تھوڑا مشکل سوال کر دیا۔ موی ابھی تک اس لیے نہیں کی کہ مجھے ابھی تک ایسے سبجیکٹ کی موی ملی ہی نہیں کہ میں خوشی خوشی کام کر سکوں۔ میں کسی آسان کام والی موی نہیں کرنا چاہتی بلکہ ایسی فلم میں کام کرنا چاہتی ہوں جس میں بہت محنت ہو۔ مطلب ایسا کردار...... اور آپ نے موضوع کی بات کی تو میں شدید والی Love story میں کام کرنا چاہتی ہوں لوگ رونے لگیں۔ اور ہیرو یا ہیروئن کو مرتا ہوا دیکھ کر رونے لگیں۔"

"اور آپ کو خود بھی رونا آ جائے؟"

"سچ بتاؤں ...... ڈراموں میں تو مجھے رونا آتا ہی نہیں ہے۔ رونا میرے لیے بہت مشکل کام ہے۔ اور اگر میں آپ کو ڈراموں میں روتی ہوئی نظر آؤں تو وہ میری اداکاری ہو گی۔ مجھے کسی کے سامنے رونا آتا ہی نہیں ہے۔"

"کون سا رول کرنا آسان ہے؟"

"کوئی بھی نہیں، کیونکہ نہ رونا آسان کام ہے اور نہ ہی ہنسنا۔ آپ لوگ اداکاری کو ہلکا نہ لیں۔"

"کس فنکار کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل ہے؟"



میں "پیارے افضل" کر چکی ہوں۔ پیارے افضل کا رول بہت چیلنجنگ تھا۔ اس کے بعد جتنے بھی رول کیے وہ آسان لگے مجھے......"

"کس رائٹر کی تحریر بہت اچھی لگتی ہے؟"

"اچھے تو سب ہی ہوتے ہیں۔ البتہ "خلیل الرحمٰن قمر" کے اسکرپٹ بہت مشکل اور چیلنجنگ ہوتے ہیں میرے لیے۔ اور انہیں مجھ پر بھروسا بھی بہت ہوتا ہے کہ بس یہ کردار تم نے ہی کرنا ہے اور لازمی کرنا ہے...... اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ رونے والا ہے تو اس طرح کرنا ہے اور اگر غصہ ہے تو لوگوں کو تم پر غصہ بھی آنا چاہیے۔"

"عائزہ...... آپ خلیل الرحمٰن قمر کی بات کر رہی تھیں کہ وہ اپنے ہر سیریل میں آپ کو ضرور لیتے ہیں تو "میرے پاس تم ہو" کا کردار آپ کو کرنا آسان لگا تھا؟"

"بالکل بھی نہیں کافی مشکل رول تھا۔ کیونکہ کردار کے دو تین شیڈز تھے۔ کیونکہ مجھے لگژری لائف پسند تھی اور رہتی میں مڈل کلاس میں جہاں محبت کرنے والا شوہر تو تھا مگر وہ آسائشیں نہیں تھیں جو کہ ہونی چاہئیں۔ تو بس اس لیے

www.pklibrary.com

کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا تھا "میرے پاس تم ہو" کے حوالے سے بات اس لیے کر رہی ہوں کہ یہ سیریل آج بھی سب کے ذہنوں میں محفوظ ہے؟"

"جی ...... جی بالکل "پیارے افضل" ہو۔ "میرے پاس تم ہو" یہ سیریلز لوگوں کے دلوں میں محفوظ ہیں ...... اور یہ میرا خلیل الرحمن قمر صاحب کے ساتھ چوتھا سیریل تھا ...... اور چاروں سیریلز میں میرا کردار بڑا مختلف اور شیڈز والا تھا۔ اور آپ کا یہ سوال کہ سینئرز کے ساتھ کام کرنا کیسا لگا تو بہت اچھا کیونکہ ریکارڈنگ سے پہلے ہماری کافی ریہرسلز ہوتی تھیں تو سینئرز کے ساتھ تھوڑی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ اس لیے ان کے ساتھ پرفارم کرنا زیادہ مشکل نہیں لگا۔ ویسے سینئرز کے ساتھ کام کرنا میرے لیے بڑا چیلنجنگ تھا۔ شکر الحمدللہ کہ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ اور آج تک لوگ اس سیریل کو یاد کرتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ وہ کردار اچھے لگتے ہیں جن میں میری شخصیت کا عکس بھی نہ ہو۔ بہت ورائٹی ہو میرے رول میں اور میں اسے مہارت سے ادا کرتی رہوں۔ اور آپ نے فلم کی بات کی تو فلم میں نے اس لیے بھی نہیں کی کہ فلم دیکھنے جو لوگ جاتے ہیں وہ پیسہ دے کر ٹکٹ خرید کر جاتے ہیں تو پھر ان کو اچھی اسٹوری نہ ملے تو کیا فائدہ وہ صرف اپنی پسندیدہ فنکارہ کو دیکھنے تو نہیں آئیں گے میں نہیں چاہتی کہ لوگوں کو مایوسی ہو۔"

"ڈراموں میں جو کپڑے اور جیولری آپ پہنتی ہیں کیا وہ آپ کی اپنی ہوتی ہیں یا پروڈکشن ہاؤس والے دیتے ہیں؟"

"شادی سے پہلے بھی اور اسٹوڈنٹ لائف میں بھی مجھے کپڑے، جوتے اور جیولری پہننے کا بہت شوق تھا۔ تو امی اکثر ناراض ہو جاتی تھیں کہ تم بہت فضول خرچ ہو۔ تو جب میں اس فیلڈ میں آئی تو اماں نے بے ساختہ کہا کہ تم بالکل ٹھیک جگہ پر آئی ہو۔ کیونکہ تم بہت فضول خرچ ہو۔ اور پھر یہ بھی دیکھیں کہ ایک سیریل کے کپڑے دوسری سیریل تاکہ میں پرفیکٹ نظر آؤں۔"

"اتنے ڈھیروں ڈھیر کا کیا کرتی ہیں؟"

"کچھ تو پڑے رہتے ہیں۔ اور اب تو میں اپنے ڈیزائنرز سے لیتی ہوں۔ سین میں پہن کر واپس کر دیتی ہوں۔ اور بعض اوقات تو خود ڈیزائن کروا کے پہنتی ہوں۔ جیولری بھی میری اپنی ہوتی ہے۔"

"آپ کو "فوبیا" ہے، مطلب کس بات سے خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

"ہاں مجھے فوبیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کلاس ون میں تھی تو واش روم جانا پڑ گیا اور اسکول کا واش روم کافی دور تھا تو چھٹی کے وقت میں واش روم چلی گئی۔ ابھی آئی ہی تھی کہ مجھے کلاسز اور واش روم بند کرنے کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ مجھے لگا کہ جیسے میرا واش روم بھی لاک کر دیا جائے گا کیونکہ کسی کو پتا ہی نہیں تھا کہ میں واش روم میں ہوں۔ تب میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ اور باہر آ گئی۔ بس اس دن کے بعد جب بھی کہیں جاتی ہوں اور واش روم جانا پڑ جائے تو باہر کسی کو کھڑا کر کے جاتی ہوں۔ ایسا خوف دل میں بیٹھ گیا ہے۔"

"اچھا یہ تو بتائیں کہ اگر کوئی ڈرامہ دوبارہ کرنا پڑ جائے تو کون سا کریں گی؟"

"پیارے افضل بہت پسند ہے مجھے اور کاسٹ میں بھی انہی فنکاروں کو لوں گی جو میرے ساتھ اس سیریل میں کام کر چکے ہیں۔"

"اور آخری سوال فٹنس کا راز کیا ہے آپ کی؟"

"ویری سمپل ...... اسکن کو فریش رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آئل اور چکنی کو اپنی لائف ہی دور کر دیں۔ ٹھنڈے پانی سے اپنا چہرا دھوئیں اور نیچرل چیزیں اپنے چہرے پر لگائیں جیسے "دہی۔ بالائی ۔شہد اور بیسن وغیرہ امی کہتی ہیں کہ یہ کیا تم ہر وقت

www.pklibrary.com

مقابل ہے آئینہ

اقصیٰ شہزاد

ادارہ

س "آپ کا پورا نام؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

ج۔ "اقصیٰ ناز۔ لیکن ناز لکھنا پسند نہیں، اس لیے اقصیٰ کے ساتھ "شہزاد" لکھتی ہوں۔ "بھائی" "بجیل" ہمیشہ بلاتا تھا۔ جبکہ امی اور بڑا بھائی عیشی اور بچپن میں لوگ "تونی" اور "ربڑ" بلاتے تھے۔ (ہاہاہا)"

س۔ "آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟"

ج۔ "آئینہ تو نہیں...... ہاں لوگ تعریف کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہنسنے سے میری آنکھوں کے نیچے لکیریں پڑتی ہیں جو میری کزن کو اچھی لگتی ہیں۔"

س۔ "حسین صورتیں دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

ج۔ "کچھ کچھ جیلسی فیل ہوتی ہے۔ (ہاہاہا) مطلب کچھ تھوڑا بہت حسن اللہ ہمیں بھی دے دیتا...... زیادہ نہیں بس جتنا کہانی میں ہیروئن کا ہوتا ہے۔ تاکہ ہمیں بھی دیکھ کے کسی کی دھڑکنیں رک جائیں (ہاہاہا)"

س۔ "اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟"

ج۔ "کچھ پیسے، جیولری، کچھ کارڈز اور سال چھ مہینے میں جب کھاریاں کا چکر لگتا ہے تو ڈائجسٹ"

س۔ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

ج۔ "جب میں پانچوں وقت کی نماز پڑھتی ہوں...... (اور اب تو تہجد بھی شروع کی ہوئی ہے اللہ ہمت دے۔ اور جب ڈائجسٹ میں خط لگتا ہے یا

ج۔ "ہر وہ چیز جو دوسروں کے پاس ہو (ہاہاہا) مذاق نہیں...... اپنی چیز بے شک کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو لیکن پسند دوسروں کی چیزیں ہی آتی ہیں (اور کس کے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ ذرا بتانا)۔"

س۔ "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج۔ "بے شک چھوٹا ہو، لیکن خوب صورت ہو۔ تاکہ دیکھنے والے اچھا فیل کریں۔ بڑی بڑی کوٹھیاں مجھے باہر سے اچھی لگتی ہیں۔ ان میں رہنا پسند نہیں......"

س۔ "کوئی ایسی خواہش جو نہ پوری ہوئی ہو؟"

ج۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ میری زندگی کی تین بڑی خواہشیں (چھوٹی چھوٹی تو بہت ساری ہیں) پہلی کو چھوڑ کے دوسری دو بتا دیتی ہوں۔ میں نے تمام مکمل ناولز پڑھنے ہیں۔ اور تیسری خواہش ماریہ نذیر، ثناء شہزاد، فوزیہ ثمر بٹ اور فائزہ بھٹی سے بات کرنی ہے۔ یہ خواہش شدید ترین ہے۔ بس میری پہلی خواہش پوری ہو جائے پھر ان شاء اللہ ہر خواہش پوری ہو جائے گی۔"

س۔ "آپ کیا چاہتی ہیں؟"

ج۔ "ناولوں سے بھری لائبریری چاہتی ہوں میری سادگی دیکھ میں کیا چاہتی ہوں۔"

س۔ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج۔ "کوئی بھی اپنے آپ کو برا نہیں کہتا۔ ویسے امی کے بقول ضدی بہت ہوں۔ چھوٹی بھابھی

www.pklibrary.com

کے ساتھ اچھی ہوں (اور جو برا کرے وہ پراں مرے۔) ہاہاہا۔"

س۔ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج۔ "میرے والدین اور میری دعائیں (بہت قیمتی ہیں میرے لیے)

س۔ "آپ کا غرور؟"

ج۔ "(ہے کوئی) جب وہ میری دسترس میں ہوگا۔ (پھر بتاؤں گی)۔"

س۔ "متاثر کن کتاب۔ مصنف۔ مووی یا ڈرامہ؟"

ج۔ "کتاب قرآن مجید، قراقرم کا تاج محل بیلی کی راجپوتاں کی ملکہ (اور بھی بہت ساری) مصنف نمرہ احمد، فرزانہ کھرل، افشین نعیم، منعم ملک، مووی، ڈرامہ کچھ بھی نہیں دیکھتی۔"

س: "محبت آپ کی نظر میں کیا ہے؟"

ج۔ "محبت بہت خوب صورت جذبہ ہے۔ آخری سانس تک سچی ہونی چاہیے۔"

س۔ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

ج۔ "بہت ضروری (تو ضروری سا ہے مجھ کو زندہ رہنے کے لیے)۔"

س۔ "برسات کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج۔ "چیزیں سمیٹتے ہوئے آدھی بارش تو ہوجاتی ہے۔ باقی آدھی دروازے میں کرسی ڈال کر ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے۔"

س: "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"

ج۔ "جب میری کزن کی ڈیتھ ہوئی جب میرے بھائی شہزاد کے بچے فوت ہوئے (دو بیٹے اور دو بیٹیاں) لیکن ان سب پہ بھاری وہ دن جب میرے بھائی جیلی کا ایکسیڈنٹ ہوا اور پھر تیسرے دن ان کی ڈیتھ ہوئی۔ بہت تکلیف دہ دن تھے۔"

س۔ "ماضی کی کون سی ہستی کے ساتھ دن گزارنا چاہتی ہیں؟"

ہوگئے تھے۔ جس کی وجہ سے اماں سے صلواتیں سنتی ہوں کہ آتے ساتھ ہی میرے ابا کو رخصت کردیا...... (لے دسو میری کوئی غلطی ہے اس میں)۔"

س۔ "کون سے خوب صورت لمحے کی منتظر ہیں؟"

ج۔ "جب میری شادی ہوگی (ہی ہی ہی)۔" پہلے بھائی جیلی کی شادی کا انتظار تھا اب وہ تو ہیں نہیں...... تو اپنی ہی......!!"

س۔ "اگر آپ کو ایک مہینہ باہر جانا پڑے تو کون سے ملک جائیں گی؟"

ج۔ "گاؤں کی مسجد تک تو کوئی جانے نہیں دیتا۔ آپ بات کرتی ہیں باہر کے ملک جانے کی...... خیر بندہ خواب میں تو جا ہی سکتا ہے نا...... تو ایسے میں میں جانا پسند کروں گی...... ترکی...... افق ارسلان کے ملک...... جہاں سکندر کے ملک...... آہاہ۔"

س۔ "آپ جو ہیں یہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

ج۔ "اگر میں جو ہوں یہ نہ ہوتی...... تو میں فوجی پائلٹ ہوتی ہاہاہا...... یا فوجی ڈاکٹر ہوتی...... یا پھر کسی فوجی کی بیوی ہوتی ہاہاہا اتنے پسند ہیں فوجی۔"

س۔ "زندگی سے کیا سیکھا؟"

ج۔ "بڑے وثوق سے دنیا فریب دیتی رہی
بڑے خلوص سے ہم اعتبار کرتے رہے"

س۔ "کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟"

ج۔ "کفایت شعار کہہ سکتے ہیں فضول خرچ بالکل نہیں ہوں۔ جب کچھ لینا ہو تو امی یا بھائی لادیتے ہیں۔ اپنے پیسے تو بڑے سوچ سوچ کے خرچ کرتی ہوں ہاہاہا۔"

س۔ "گھر میں سب سے زیادہ ڈانٹ کس سے پڑی؟"

ج۔ "آپ خود بتائیں جو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہوگا۔ اس کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہوگا۔ (بس میرا بھی وہ ہی حال ہے)۔ لیکن میں بھی کسی سے کم نہیں۔ پہلے بھی بتایا نا کسی کا ادھار نہیں

www.pklibrary.com

عندلیب زہرا

آٹھواں دن



بعض لوگ مٹی میں ہاتھ ڈالتے ہیں وہ سونا بن جاتی ہے۔ جو قدم اٹھاتے ہیں، کامیابی مقدر بنتی ہے۔ وہ رزق کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ رزق بے حساب انہیں عطا ہوتا ہے۔ نیک نامی نعمت کی طرح ان کے کردار کی زینت بن جاتی ہے۔

سیٹھ صاحب بھی ایسے ہی تھے۔ ان سے وابستہ تمام افراد فیض یاب ہوتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی دعا ہے جو ان کے تعاقب میں ہے۔

''آپ پر کرم ہے، آپ نوازے ہوئے ہیں۔'' ملنے جلنے والے کہتے۔

وہ مسکرا دیتے اور ایک ہی جملہ کہتے۔

''میں تو کھوٹا سکہ تھا۔ بس ایک دعا......'' وہ آبدیدہ ہو جاتے واقعی بس دعائیں تعاقب کرتی ہیں۔ ابر کرم بن جاتی ہیں۔

☆☆☆

ثمینہ بڑی بااصول خاتون تھیں۔ وضع دار کسی حد تک سخت مزاج ...... یہ سوچ ان کی زندگی اور شخصیت پر حاوی تھی۔ اس کا نمایاں اثر بچوں کی تربیت پر نظر آتا تھا۔

اشعر، منیر ڈھلے ڈھلائے سانچے میں تھے۔ لائق، فائق، باادب، ایسی اولاد جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ ثمینہ ان کی کامیابیوں پر فخر کرتیں۔

www.pklibrary.com

گھڑی کی ٹک ٹک کے مطابق زندگی رواں تھی۔
ثمینہ مطمئن ہو جاتیں اگر اشعر...... منیر کے بعد روحیل نہ ہوتا وہ اپنے بھائیوں کی قابلیت کا "نظر بٹو" تھا۔ کھوٹا سکہ۔ لاپروا، کھیلنے کا شوقین، پڑھائی سے نالاں۔
بڑے بھائی جس قدر کامیابیاں سمیٹ کر لاتے وہ اسی قدر لوگوں کی شکایتیں نقصان کی خبریں، گلے شکوے اپنے دامن میں بھر کر لاتا۔ ثمینہ کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی تربیت کے جو اصول اشعر اور صغیر اپناتے...... کیسے روحیل رد کر دیتا۔ اس پر ان کی ہر بات کھوٹی ثابت ہوتی تھی۔
چکنا گھڑا، ڈھیٹ، ناخلف، وہ یہ خطاب دینے میں بجا تھیں۔
روحیل اچھا تھا اگر اسے باقی بھائیوں کی کامیابیوں سے ہٹ کر دیکھا جاتا۔ لیکن یہ مسئلہ تھا کہ سب اسے اسی تناظر میں دیکھنے کے عادی تھے۔ وہ کھیلوں میں اچھا تھا۔ خوش مزاج تھا۔ خدمت خلق کا شوقین...... اپنوں کے لیے حساس لیکن کسی کو یہ خوبیاں نظر نہ آتی تھیں۔ بھائیوں کی کامیابی نے اس کی خوبیوں کو گہنا دیا تھا یا شاید ماند کر دیا تھا۔
بیٹوں کی ماں ہونا اعزاز ہے۔ قابل بیٹوں کی ماں ہونا ایک فخر ہے سو وہ اپنی محنت کا پھل کھا رہی تھیں لائق فائق بیٹوں کے لیے ویسی ہی بہوئیں لائیں۔ یہ اپنا باغ دیکھ کر خوش ہوتیں۔
دل کے معمولی اٹیک سے شوہر خالق حقیقی سے جا ملے۔ پہلے اشعر اور پھر منیر اپنی بیویوں کے ساتھ الگ ہو گئے۔ بہانہ یہ تھا کہ علاقہ نہیں ٹھیک سسرالی عزیز باتیں بناتے ہیں...... آفس دور ہے۔ وغیرہ وغیرہ...... ثمینہ ڈبڈبائی نظروں سے دیکھتی رہیں۔
پرندے اڑان بھر چکے تھے بوڑھی چڑیا کا گھونسلا خالی ہو چکا تھا لیکن نہیں...... ابھی ایک

کی خاموش نظریں دروازے کی جانب اٹھتیں کبھی گھڑی کی جانب۔ آنکھوں میں انتظار ہمکتا رہتا۔ آس و نراس کے عالم میں۔ قابل بیٹے بس کھڑے کھڑے آتے اور حال چال پوچھ کر چلے جاتے۔ اب وہ ثمینہ کے بیٹے نہیں اپنی حسین طرح دار بیویوں کے شوہر تھے۔ اعلیٰ ہاؤسنگ سوسائٹی میں رہتے جنہیں اس کالونی کا تعارف کرواتے شرم آتی تھی۔ ایسے میں روحیل کا وجود ان کا سہارا تھا۔ اس کا وجود دوسرہٹ کا احساس دلاتا۔
وہ من موجی تھا بس، بے حس نہ تھا۔ ماں کے لیے فکر مند رہتا۔ کھانا پکا کر رکھتا۔ معمولی جاب تھی۔ آزاد منش بندہ تھا۔ سو شادی کے جھنجٹ سے ابھی تک آزاد تھا۔
انہی دنوں ثمینہ گر گئیں۔ چلنے پھرنے سے معذور۔ ساری زندگی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ متحرک رہتے ہوئے پھرکی کی طرح گھومتی تھیں۔ اب ایک کمرے تک محدود ہو گئی تھیں۔ محتاج، لاچار، بے بس۔ سیانے کہتے ہیں کہ بیماری، پریشانی، آزمائش ہوتی ہے دونوں فریقوں کی۔ بیمار اور تیماردار دونوں کو۔
روحیل نے جان لڑا دی۔ بیٹیوں کی طرح خدمت کی۔ بیٹا بن کر ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا۔ دوائیں لاتا۔ تحفظ کا احساس دلاتا۔ سہیلی کی طرح دکھ سکھ سنتا۔ ماں کی طرح نخرے، چڑچڑاپن سہتا، تھراپی کرواتا، اس نے اپنی تمام جمع پونجی تھی سب ماں پر لگا دی۔
اشعر اور منیر فارن ٹرپ پر تھے۔ ماں کی بیماری کی خبر ملی تو دل رنجیدہ ہو گیا۔ لیکن فاصلے بہت تھے سو وہ پیسے بھیج کر مدا ادا کر دیتے۔
"منے! امی کا اچھے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ......" وہ ہر بار دو حرف تسلی کے ادا کرتے۔
روحیل بنا کوئی شکوہ کیے ماں کو سنبھال رہا تھا۔ ثمینہ کیا سوچتیں۔ یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ دل کی بات کبھی کسی سے شیئر نہ کی تھی۔ مسلسل علاج معالجے سے طبیعت میں یہ

www.pklibrary.com

کاچہرہ تھام کر کہا۔ اس نے ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔

"میں تو بہت غریب ہوں۔ کون دے گا اپنی بیٹی؟" اس نے ہنسی میں بات ٹال دی۔

"تو میرا سب سے قیمتی بیٹا ہے...... انمول رتن ہے تو۔" ماں کے چہرے پر بیٹے کی محبت پر فخر سجا تھا اور تشکر بھی۔ "اللہ تجھے رنگ لگائے گا روحیل۔"

انہوں نے روحیل کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

رات کو اچانک بادلوں نے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ گھن گرج کے ساتھ بجلی کی کڑک بھی تھی۔

"یا اللہ خیر۔" وہ بار بار ورد کرتا۔

اپنے کمرے کی لائٹ بجھا کر وہ ماں کے کمرے میں آ گیا۔ اسے علم تھا کہ اس کی ماں کا دل اب کمزور ہو گیا ہے۔ ثمینہ بے سدھ سو رہی تھیں۔ وہ کاؤچ پر لیٹ گیا۔ کتنی یادیں ذہن پر دستک دے رہی تھیں۔ باپ کی وفات کے بعد وہ بات بات پر روتا تھا۔ بچپن میں تیز بارش سے خوف زدہ ہو جاتا۔ ثمینہ ساری رات جاگتے ہوئے دعائیں پڑھ کر پھونکیں مارتیں۔

انہی سوچوں میں نیند کی دیوی مہربان ہو گئی۔ جب اچانک کسی احساس کے تحت اس کی آنکھ کھل گئی۔ ثمینہ کے لبوں سے بے معنی آوازیں نکل رہی تھیں۔

"امی! امی۔" وہ متوحش ہو گیا تھا۔ اس نے پانی پلایا چند گھونٹ پی کر اسے تکنے لگیں۔ پھر ہاتھ اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا۔ ان کے لب ہل رہے تھے۔ روحیل نے سمجھنا چاہا تو کچھ ٹوٹی پھوٹی دعائیں تھیں اس کے لیے۔ پھر ثمینہ نے آنکھیں موند لیں۔ اب وہاں خاموشی تھی۔

روحیل ماں کا ہاتھ تھام کر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں کو چوم رہا تھا۔ ماں کے بستر پر

تدفین پر دل کھول کر پیسہ خرچ کیا گیا۔ سوئم، چالیسواں، دنیا کھانے کی ہے۔ دکھاوے کی ہے۔ سو انہوں نے خوب واہ واہ سمیٹی اور آخر اپنی منزل کی طرف عازم سفر ہو گئے۔

روحیل ماں کی یادوں کے سہارے وقت گزارتا۔ جب ایک دور پار کی عزیزہ نے اپنی بیٹی کے لیے خواہش ظاہر کی اور ایک گلابی شام کو نسوانی وجود اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ بعض فیصلے زندگی میں ٹرننگ پوائنٹ لے کر آتے ہیں۔ روحیل کی زندگی بھی بدل گئی تھی۔

☆☆☆

وقت رواں رہتا ہے۔ بہتی ندی کی طرح...... بتا کچھ احساس دلائے۔ روحیل کی زندگی میں رنگ آ رہے تھے۔

عزت کے...... کامیابی کے...... محبت اور نیک نصیب کے۔ کہتے ہیں دعاؤں کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا لیکن زندگی میں رنگ لے آتی ہیں۔ اس نے شریک حیات کے مشورے سے ایک بزنس کی ابتدا کی۔ اور پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ زندگی میں نشیب و فراز آئے۔ لیکن وہ عافیت میں رہا۔ عزت، نیک نامی، پیسہ ہر شے اس کی دسترس میں تھی۔ اس کے قابل افسر بھائی سب کچھ ہو کر بھی اس سے دس قدم پیچھے تھے۔ پورے دس قدم۔

کیسے...... کیوں...... کس طرح اشعر اور منیر اکثر سوچتے۔

☆☆☆

سیٹھ صاحب سے سب پوچھتے کہ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے۔ بظاہر عام سے شخص ہیں لیکن وہ پھر بھی نوازے ہوئے لگتے ہیں۔

وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ ایک ہی بات کہتے۔

www.pklibrary.com

ایمل رضا

تماشاگر

اکیسویں قسط

سیلون کی نئی برانچ کی اوپننگ پر نبیلہ بہت مصروف تھی۔ نئی برانچ میں رش بھی کافی زیادہ تھا۔ کافی ماڈلز مدعو تھیں وہاں...... میڈیا کے ساتھ ساتھ وہ تمام لوگ جو میک اپ انڈسٹری کے ساتھ کسی نہ کسی حوالے سے منسلک تھے۔ سب کے سب وہاں موجود تھے۔ اتنا بڑا فنکشن تو باریشہ نے حویلیاں میں کسی شادی کا بھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ یہاں ایک پارلر کی اوپننگ پر دیکھ رہی تھی۔

جس وقت وہ نبیلہ کے پاس پہنچی وہ اخباری نمائندوں کے ساتھ بات چیت کر رہی تھی اور کافی مصروف نظر آ رہی تھی۔ ان سے بات کرنا خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔ باریشہ ان سے مل کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ نبیلہ میم نے جو کام کیا تھا اس کے لیے تو تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرنا بنتا تھا۔ وہ ان کی اسسٹنٹ کے پاس گئی تھی۔ جو میک اپ کے درست ریک کو خواہ مخواہ درست کر رہی تھی۔ اس طرح شاید وہ خود مصروف اور ذمہ دار ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

''مجھے نبیلہ میم سے ملنا ہے۔ وہ کب تک فری ہو جائیں گی۔؟''

''تھوڑی دیر میں ریفریشمنٹ رکھ دی جائے گی۔ اس کے بعد رش خاصا کم ہو جائے گا۔'' اسسٹنٹ نے



www.pklibrary.com

اس کی طرف دیکھے بنا کہا تھا۔
''کیا پھر میں ان سے مل سکتی ہوں۔؟''
''بالکل......ویسے کیا بات کرنا ہے تمہیں ان سے......؟''
''مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔''



www.pklibrary.com

"کس بات کا......؟" اسسٹنٹ نے رخ اس کی طرف کیا تھا۔ وہ باریشہ کی بات کو سمجھی نہیں تھی۔
"وہ انہوں نے شیزہ کی جگہ مجھے اپنے شوٹ کے لیے منتخب کیا، اس لیے......" باریشہ نے کہا۔ اسسٹنٹ نے ہاتھ میں پکڑی میک اپ کٹ کو بند کر کے واپس شلف پر رکھا۔ اور پوری توجہ سے باریشہ سے مخاطب ہوئی۔
"کس کی بات کر رہی ہو تم......؟"
"شیزہ کی......"
"وہ کون ہے۔ کیا کوئی نئی ماڈل ہے۔؟ میں نہیں جانتی اسے......"
"نہیں......وہ ماڈل نہیں ہے۔ کومل آنٹی کے گھر میں رہتی ہے۔ نبیلہ میم نے شوٹ کے لیے اسے ہی تو بک کیا تھا۔"
"پتا نہیں تم کس کی بات کر رہی ہو۔ لیکن اس شوٹ کے لیے مشہور ماڈل صدف کو بک کیا گیا تھا۔ بلکہ وہ تمہارے شوٹ کرنے کے بعد نبیلہ میم سے خاصی ناراض بھی ہو چکی ہے۔" اسسٹنٹ نے اسے بتایا تھا اور باریشہ نے حیرت سے اس کی ساری بات سنی تھی۔
"لیکن......"
"کومل میم کی طرف سے ریکوسٹ آئی تھی کہ اس شوٹ کے لیے تمہیں چانس دیا جائے......" اسسٹنٹ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ باریشہ مزید کیا پوچھنے والی تھی۔ "نبیلہ میم تو تمہارے لیے مان ہی نہیں رہی تھیں۔ تم نے تو پہلے بھی پرنٹ میڈیا کے لیے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ یہ تو تمہاری آنٹی تھیں جنہوں نے نبیلہ میم سے تمہارے لیے اصرار کیا اور اس طرح نبیلہ میم تمہیں شوٹ پر لینے کے لیے راضی ہوئیں۔"
"لیکن کومل آنٹی نے تو مجھے بتایا تھا کہ اس شوٹ کے لیے شیزہ کو بک کیا گیا تھا۔"
"وہ تم انہی سے پوچھ لینا کہ انہوں نے تمہارے ساتھ یہ جھوٹ کیوں بولا۔" اسسٹنٹ نے کچھ منہ بناتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔ باریشہ ناسمجھی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اسلام آباد کی صاف ستھری سڑک پر بارش کی بوندیں اتنی نرمی سے گر رہی تھیں جیسے زور سے گرنے پر دھرتی کے خراب ہو جانے کا ڈر ہو۔ یہ بوندا باندی ایسی تھی کہ زمین کو پوری طرح سے بھگو بھی نہیں رہی تھی اور خشک بھی نہیں رہنے دے رہی تھی۔ کار میں بیٹھی باریشہ کو اس بوندا باندی کا شاید پتا بھی نہ چلتا لیکن اس نے گاڑیوں کی فلش لائٹ میں ننھے ننھے قطروں کو چمکتے ہوئے دیکھ لیا تھا جس کی وجہ سے اسے احساس ہوا تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے۔
واپسی کا سفر خاموشی سے کٹ رہا تھا۔ کومل بیگم، نتاشہ اور باریشہ تینوں ہی خاموش تھیں۔ نتاشہ تو اس لیے کہ وہ فیشن میگزین کو دیکھ رہی تھی۔ کومل بیگم، باریشہ کے کچھ بولنے کی منتظر تھیں، اور باریشہ اس لیے خاموش تھی کیونکہ وہ بے چین تھی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے ساتھ جھوٹ کیوں بولا گیا تھا۔ کومل آنٹی نے تو کہا تھا کہ نبیلہ میم نے اس شوٹ کے لیے شیزہ کو بک کیا تھا۔ اور شیزہ کے راولاکوٹ چلے جانے سے وہ بہت پریشان بھی ہو گئی تھیں۔ ان کی پریشانی کی وجہ سے ہی تو باریشہ نے یہ کام کیا تھا۔ اگرچہ شوٹ دیکھ کر اسے اچھا لگا تھا۔ لیکن نبیلہ کی اسسٹنٹ کی باتوں نے اسے بے چین کر دیا تھا۔
"تمہیں اپنا شوٹ کیسا لگا باریشہ......" باریشہ کے کچھ کہنے کا انتظار جب کافی طویل ہو گیا تو کومل بیگم نے خود ہی اس سے پوچھ لیا تھا۔ وہ جو کھڑکی کے باہر رواں دواں سڑک کو دیکھتے ہوئے سوچوں میں گم تھی۔ کومل بیگم کی بات پر چونکی تھی۔
"جی......کیا کہا آپ نے......؟"

www.pklibrary.com

''کہاں کھوئی ہوئی ہو تم......؟'' کومل بیگم کو باریشہ کا غائب دماغی سے بیٹھنا برا لگا تھا۔ یہ بات اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''نہیں...... کہیں نہیں......''

''شوٹ پسند آیا تمہیں اپنا......؟''

''جی...... بہت اچھا لگا۔''

''مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی ریزلٹ آئے گا۔ میں تمہاری خوب صورتی کو پہچان گئی تھی......'' کومل بیگم ہنسی تھی۔ باریشہ مدھم سا مسکرائی تھی۔ ''یہ تصاویر اپنی نانو کو سینڈ کر دو...... دیکھنا وہ تو پریشان ہی ہو جائیں گی۔'' کومل بیگم ہنستی چلی گئی تھی۔

''ایسا تو میں ہرگز نہیں کر سکتی۔''

''لیکن انہیں معلوم ہو ہی جائے گا۔''

''شاید...... ہو جائے۔''

''لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی ہیں۔ اب تمہارے گارجین ہم ہیں۔ ویسے بھی تم بالغ ہو چکی ہو۔ اور اپنی مرضی سے جہاں چاہے رہ سکتی ہو۔''

وہ خاموش رہی تھی۔ کومل بیگم کی بات پر اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ تبصرہ بات چیت کو بڑھا سکتا تھا اور اس کا مزید بولنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ باقی کا سفر خاموشی سے گزرا تھا۔ جس پر کومل بیگم کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔ شوٹ کے منظر عام پر آنے کے بعد وہ باریشہ کی ایکسائٹمنٹ کی توقع کر رہی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ کیوں نہیں ہوا تھا یہ بات اسے پریشان کر رہی تھی۔ لیکن وہ جلد ہی اس کا پتا کروا لینے والی تھی۔

''میں بہت تھک چکی ہوں باریشہ...... سونا چاہتی ہوں۔ تم بھی جلد سو جانا...... نیند پوری کرنا اسکن کے لیے بہتر ہوتا ہے۔''

اسے ہدایت دے کر وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی تھی۔ تھکن تو باریشہ کو بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آج رات کی طویل تقریب، اس سے پہلے کی تیاری اور اس کا وزنی لباس...... اس سب نے اسے تھکا دیا تھا۔ لیکن نیند پھر بھی اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس لیے وہ گھر کے اندر آ کر لابی کے اس حصے میں بیٹھ گئی تھی جہاں شیشے کی دیواروں کے پیچھے گھر کا صحن کی طرز پر بنا ہوا حصہ تھا۔ یہ صحن گھر کے بیچوں بیچ میں تھا۔ گھر کی باقی کی عمارت اس صحن کے اردگرد موجود تھی۔ اور گھر کے بیشتر کمروں کی کھڑکیاں یہاں ہی کھلتی تھیں۔ جس سے تازہ ہوا کا احساس ہوتا تھا۔ اس صحن کو دیکھتے ہوئے باریشہ کو اکثر حویلیاں میں موجود اپنی حویلی کا صحن یاد آ جایا کرتا تھا۔ لیکن وہ یاد خوش گوار ہرگز نہیں ہوا کرتی تھی۔ سورج مکھی کی طرز پر بنے اس صحن میں ایسا تھا ہی کیا کہ اسے یاد کرتے ہوئے مسکرایا جاتا یا اداس ہی ہوا جاتا...... اینٹ اینٹ تو اس کی الگ ہو جانے کو تیار تھی۔ اور یہ تو حاجی بوا تھیں جنہوں نے باریشہ کو بتایا تھا کہ ان اینٹوں سے سورج مکھی کا پھول بنا ہوا ہے۔ وہ نہ بتاتیں تو باریشہ کے تو فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ چاند تارا تو ہی تھیں جو اس اجڑی حویلی سے چمٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔

اچھا ہوا باریشہ بروقت وہاں سے الگ ہو گئی۔ ورنہ وہ اس وقت اس صحن کو دیکھنے کے بجائے اس ٹوٹے پھوٹے صحن کو دیکھ رہی ہوتی اور اپنی قسمت پر رو رہی ہوتی...... اس صحن کی تو بات ہی اور تھی۔ جدت تھی، جاذبیت تھی اور کتنی طرح کے پودے وہاں موجود تھے۔ گھر کے مالی نے خلوص سے کام کرتے ہوئے صحن کو بے حد خوب صورت پودوں سے بھرا ہوا تھا۔

باریشہ شیشے کی دیوار کے پار اپنے قریب پڑے پودے کو دیکھنے لگی۔ جو شاید لاجونتی کا پودا تھا۔ جس کی بابت

www.pklibrary.com

مشہور ہے کہ یہ ایک حیا والا پودا ہے۔ اگر اسے مرد چھو لے تو فوراً سے سکڑ جاتا ہے۔ اور اگر عورت چھو لے تو اسے کچھ نہیں ہوتا۔ اور لاجونتی کے پودے کو دیکھتے ہوئے اور اس کی بابت مشہور بات کو سوچتے ہوئے باریشہ کو احساس ہوا تھا وہ بھی لاجونتی کا ایک پودا ہے۔ ایک ایسا پودا جس کو خوشی کا چھونا راس نہیں...... جیسے ہی وہ خوشی کو محسوس کرنے لگتی ہے اس کا دل بجھ جاتا ہے۔

''تم نے بتایا نہیں کہ تم ماڈلنگ میں جانا چاہتی ہو۔'' اپنی پشت پر اسے سانول کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے سامنے قد نکالتا سانول کھڑا تھا۔ سانول کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک......

''نہیں...... یہ سب کومل آنٹی کی وجہ سے ہوا ہے۔'' باریشہ نے صاف گوئی سے بتایا۔

''ایک بات کہوں باریشہ......'' پیار سے کہتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''بولو سانول......''

''تم اس گھر میں کسی کے کہنے پر کچھ مت کرنا۔ جو بھی کرنا اپنی مرضی سے کرنا۔ جس میں تمہاری خوشی ہو۔'' سانول نے سرسری انداز میں عام سی بات کی تھی۔ لیکن نجانے کیوں باریشہ کو اس کی بات پر بے چینی محسوس ہوئی تھی۔

''تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو......؟''

''کیونکہ جو کام دوسروں کے کہنے پر کیے جاتے ہیں ان کا بوجھ دل پر پڑتا ہے۔'' سانول نے سنجیدگی سے کہا۔ باریشہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ معصوم لڑکا سمجھ دار مرد بن رہا تھا۔

''تم اتنی بڑی بڑی باتیں کب سے سوچنے لگے سانول......''

''پتا نہیں...... شاید انسان جیسے جیسے بڑا ہوتا ہے بڑی بڑی باتیں بھی خود ہی اس کے ذہن میں آنے لگتی ہیں۔''

''میں بھی تو تمہاری عمر کی ہوں۔ میرے ذہن میں تو ایسی باتیں نہیں آتیں۔''

''تم ذہن کو اجازت ہی کہاں دے رہی ہو کہ وہ کچھ نیا سوچے۔'' سانول نے کہا تھا۔

باریشہ نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ یا شاید وہ اس کی بات سمجھ چکی تھی لیکن اس کے منہ سے سننا چاہ رہی تھی۔

''تم ابھی تک ماضی میں جی رہی ہو باریشہ...... غصے میں جی رہی ہو۔ نفرت میں...... جو تمہیں اپنی نانو سے ہے۔'' سانول نے سادگی سے کہا اور ایک جھماکا سا باریشہ کے ذہن میں ہوا۔ وہ بات جو ایک عرصے سے وہ خود نہیں سمجھ پا رہی تھی، وہ سانول نے کیسے اسے بتا دی تھی۔ ایک دوسرا شخص اسے اس سے زیادہ سمجھنے لگا تھا۔ اس کا دل کیا کہ وہ آگے بڑھ کر سانول کو گلے سے لگا لے۔ اس نے اس کی سالوں کی اُلجھن دُور کر دی تھی۔

''ہاں...... شاید ایسا ہی ہے۔''

''تم اپنی چاند نانو سے نفرت کرنا چھوڑ دو باریشہ......''

''میں ان سے نفرت کرنا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔ انہوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ تم نہیں جانتے سانول......''

''میں جاننا چاہتا بھی نہیں...... پھر بھی کہوں گا کہ ان سے نفرت کرنا چھوڑ دو......''

''تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟''

''کیونکہ زندگی کئی بار انہی کی چوکھٹ پر گراتی ہے جن سے ہم بے پناہ نفرت کرتے ہیں۔'' سانول نے کہا اور باریشہ سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ شاید سانول ٹھیک کہہ رہا تھا۔

''میں تمہیں حویلیاں واپس جانے کو نہیں کہہ رہا...... بس اتنا ہی کہ انہیں فون کر لو۔ ان کا حال چال پوچھ

www.pklibrary.com

لو۔"

"تمہاری بات پر سوچوں گی۔ کیونکہ تم نے ابھی خود ہی تو کہا کہ کسی کے کہنے پر کچھ مت کرنا۔ جب بھی کرنا اپنی مرضی سے کرنا۔" اس نے بروقت اس کو اس کی بات لوٹائی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ خوشی ہوئی کہ تم نے میری بات مان لی اگرچہ اپنے مطلب کو ہی......"

سانول ہنساتھا اور باریشہ نے دیکھا تھا کہ آج اس کی مسکراہٹ میں بھی ایک وقار تھا۔

"شب بخیر......" کہہ کر وہ وہاں سے اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

باریشہ نجانے کتنی ہی دیر تک لاجونتی کے پودے کو دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

کومل بیگم نے اگلے دن صبح ہی میں باریشہ کی کل رات کی خاموشی کا سبب معلوم کر لیا تھا۔ اس بارے میں انہوں نے نتاشہ سے بات کی تھی۔ نتاشہ نے انہیں باریشہ کے پل پل کی رپورٹ دے دی تھی کہ باریشہ نے کل تقریب میں کس کس سے بات کی تھی۔ باقی کڑیاں انہوں نے خود ہی ملالی تھیں۔ اسی لیے اب صبح ہی صبح انہوں نے نبیلہ کو فون کر لیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نبیلہ دیر تک سونے کی عادی ہے۔

"تمہاری اسسٹنٹ کو کچھ سمجھ ہونی چاہیے نبیلہ...... اگر میں نے تم سے ایک ریکوسٹ کر ہی لی تھی تو کیا ضرورت تھی اسے باریشہ کو سب بتانے کی......"

"اُسے بھی کوئی غلط فہمی ہوئی ہے کومل...... وہ نہیں جانتی تھی کہ باریشہ اس سب سے لاعلم ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ نہیں جانتی تھی تو بات کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"وہ کہہ رہی ہے کہ باتوں باتوں میں بات نکل گئی۔"

"مجھے لگتا ہے کہ تمہارے سیلون کے سارے ملازم اس شوٹ پر صدف کو ہی دیکھنا چاہ رہے تھے۔ اور شاید تم بھی نبیلہ...... تم نے میرے اصرار پر میری بات مان تو لی۔ لیکن تمہیں شوٹ کے لیے صدف کو نہ لینے کا دُکھ ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے کومل...... صدف بے شک ایک اچھی ماڈل ہے۔ وہ شوٹ کرتی تو یقیناً شوٹ مختلف ہوتا...... لیکن مجھے باریشہ کا کام بھی پسند آیا ہے۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"لیکن میں تمہاری اسسٹنٹ کی حرکت سے سخت خفا ہوئی ہوں۔"

"اس کی طرف سے میں ایکسکیوز کرتی ہوں۔ تم باریشہ کے سامنے اس بات کو سنبھال لو۔"

"ظاہر ہے۔ وہ تو اب کرنا ہی ہوگا۔" کومل بیگم نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اور جوڑ توڑ کرنے لگی تھی کہ اب باریشہ کے سامنے انہیں کیا کہنا ہے۔ اپنے جھوٹ پر کیسے پردہ ڈالنا ہے۔

"گڈ مارننگ......" باریشہ نے وہاں آ کر کہا۔ اسے دیکھ کر کومل بیگم مسکرائی۔

"آج تم نے اٹھنے میں دیر نہیں کر دی۔"

"جی...... نیند مکمل کر رہی تھی۔"

"آؤ بیٹھو...... ناشتا کرتے ہیں۔"

"کیا آپ نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا۔"

"نہیں...... میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ ایمن صبح ہی صبح کہیں چلی گئی۔ مرد حضرات پہلے ہی ناشتا کر چکے تھے۔ تو سوچا کہ کیا اکیلے ناشتا کروں۔ اس لیے میں تمہارا انتظار کرنے لگ گئی۔" کومل بیگم نے بتایا اور پھر ملازمہ کو کہہ کر ٹیبل پر ناشتا لگوا لیا۔ دونوں ٹیبل پر بیٹھ کر ناشتا کرنے لگیں۔

"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا ہے کومل آنٹی......" چند لقمے کھانے کے بعد باریشہ نے ناپ تول سے

www.pklibrary.com

کام لیتے ہوئے کہا۔ کومل بیگم اسی بات کی توقع کیے ہوئے تھی۔

"تمہیں جو پوچھنا ہے بعد میں پوچھنا میری جان...... پہلے میری بات سنو...... میں نے تم سے ایک بات چھپائی ہوئی ہے۔"

"وہ کیا......؟"

"میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ نبیلہ شوٹ کے لیے شیزہ کو لینا چاہتی تھی......" کومل بیگم نے خود ہی حقیقت بتادی تھی۔ باریشہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ "دراصل وہ اس شوٹ کے لیے مشہور ماڈل صدف کو لینا چاہتی تھی۔"

"لیکن پھر آپ نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔؟"

"کیونکہ میں چاہتی تھی کہ یہ شوٹ تم کرو۔" باریشہ ابھی بھی اس کی بات نہیں سمجھی تھی۔

"دیکھو نا میری جان...... تم ایک کنوئیں کے مینڈک کی سی زندگی گزار رہی ہو۔ سنگیت کو تم نے دل چھوٹا کر کے چھوڑ دیا۔ اتنے عرصے کی محنت بیکار گئی۔ میں چاہتی تھی کہ تم کچھ کرو۔ اپنی پہچان بناؤ...... تمہیں اگر میں ڈائریکٹ شوٹ کا کہتی تو شاید تم نہ مانتیں۔ انکار کر دیتیں۔ کیونکہ چاند نے تمہاری تربیت بہت عجیب کی ہے۔ وہ اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی قدیم رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی لیے میں نے جھوٹ بولا اور تم مان گئیں۔"

کومل بیگم نے ساری وضاحت دے دی تھی۔ اور باریشہ کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح کے رویے کا اظہار کرے۔

"پھر دیکھا تم نے...... کیا کمال کا ہنر نکل کر آیا ہے تمہارے اندر سے...... کل سب تمہاری کتنی تعریف کر رہے تھے۔ نبیلہ سے بھی ابھی بات ہو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ تم نے صدف سے بڑھ کر کام کیا ہے۔" کومل بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا تھا۔ باریشہ ایسے مسکرائی تھی جیسے زبردستی مسکرائی ہو۔ اس کی خاموشی پر کومل بیگم کو تشویش ہوئی تھی۔

"کیا تم میرے جھوٹ پر ناراض ہو باریشہ......؟"

"نہیں...... ایسا تو ہرگز نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب تمہیں اپنا شوٹ پسند آیا۔؟" انہوں نے بات کی نوعیت بدلنے کی غرض سے کہا تھا۔

"جی...... پسند تو بہت آیا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں......" اس نے سچائی سے کام لیا تھا۔ کومل بیگم مسکرائی تھی۔

"بس...... اب میری تسلی ہے کہ میں نے کچھ اچھا کرنے کے لیے ہی تم سے جھوٹ بولا تھا۔ تم خوش ہو تو اب میں بھی مطمئن ہوں۔"

جواباً باریشہ مسکرائی تھی۔

"اب بولو...... تمہیں کیا کہنا ہے مجھ سے......؟"

"نہیں...... مجھے کچھ نہیں کہنا۔" اس نے انکار میں سر ہلایا تھا۔ وہ جو کہنا چاہتی تھی وہ کہنا اب بے کار تھا۔ اس نے ان لوگوں کی نیت پر شک کیا تھا۔ جبکہ کومل بیگم اس کے لیے نجانے کس کس سے ریکوسٹ کر رہی تھیں۔ اسے تو ان کو شکریہ بولنا چاہیے تھا۔ اُلٹا وہ ان سے باز پرس کرنے چلی آئی تھی۔ چاندنا نو نے واقعی ہی میں اس کی تربیت بہت خراب کی تھی۔ اسے سچے لوگوں کی پہچان نہیں کروائی تھی۔

خود پر شرمندگی کی وجہ سے باریشہ نے باقی کا ناشتا خاموشی سے کیا تھا۔

☆☆☆

چاند کا بخار کافی لمبا عرصہ چلا تھا۔ کچھ عمر کا تقاضا تھا، کچھ بڑھاپا اور کچھ دُکھوں کا بوجھ...... بخار نے جانے میں بہت وقت لے لیا تھا۔ پھر بخار کی وجہ سے جو اس کے بوڑھے جسم میں کمزوری ہوگئی تھی اس کا خلاء بھرنے کے

www.pklibrary.com

لیے بھی بہت سا وقت درکار تھا۔ شکر تھا کہ گھر میں بوڑھی آمنہ موجود تھی۔ جو اگرچہ خود کوئی کام کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن چاند کے بخار میں اس نے ہی اس کا ساتھ دیا تھا۔ جیسا تیسا بھی وہ کھانا پکا دیا کرتی تھی۔ صفائی بھی کر دیا کرتی تھی اور بالکل ماں کی طرح چاند کی ضد کیا کرتی تھی کہ تھوڑا بہت ہی سہی کھانا کھالے۔ بخار کے ان دنوں میں اس نے ہی چاند کے کپڑے دھوئے تھے۔ اور منہ ہاتھ دھلانے کے لیے ایک چھوٹا سا عارضی انتظام اس نے چاند نانو کے کمرے میں ہی کر دیا تھا۔

ارشادی بابا اکثر شام میں آجایا کرتا تھا۔ شرمندہ سے، سر جھکائے ہوا۔ وہ آمنہ بی بی کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا اور بمشکل اپنے حواس میں موجود آمنہ بی بی کو اس بات کی خوشی ہوتی تھی کہ کوئی تو ہے جو اس کا بھی مجرم ہے۔ جس پر وہ بول سکتی ہے۔ زندگی بھر کے شکووں کا ذمہ دار قرار دے سکتی ہے۔ طعنے دے سکتی ہے۔ باتیں سنا سکتی ہے۔ کئی بار وہ لفظوں کی جوڑ توڑ کیا بھی کرتی تھی۔ سوچا کرتی تھی کہ ارشادی آج آئے گا تو وہ اسے کیا کہے گی۔ اسے اپنی خوشیوں کا قاتل کہے گی۔ دھوکے باز، وعدہ خلاف کہے گی۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوتا تھا۔ جب جب ارشادی حویلی میں آتا تھا آمنہ سارے شکوے بھول جاتی تھی۔ اور اس کا دل کیا کرتا تھا کہ ارشادی کا ہاتھ تھام کر وہ بنسواڑی علاقے میں چلی جائے۔ جہاں جوانی میں بیٹھ کر ارشادی ہاتھوں کے زائچے بنایا کرتا تھا۔ اور اس بار تو وہ ارشادی کو لے کر ایسے گم ہو کہ دنیا والے انہیں ڈھونڈتے رہ جائیں اور وہ دونوں کسی کو نہ ملیں۔

چاند ان دنوں زیادہ تر سوئی رہتی تھی۔ وہ جاگ رہی ہوتی تو دیکھتی کہ کیسے ارشادی اور آمنہ حویلی کے دالان میں بیٹھ کر بیتے دنوں کو یاد کیا کرتے ہیں۔ ارشادی جو چاند نانو کی خیریت معلوم کرنے آیا کرتا تھا۔ آمنہ کا حال زیادہ جان جاتا تھا۔ دونوں کے پاس کہنے کو جو جو کچھ تھا وہ کہنے کے بجائے دالان میں بیٹھ کر خاموش رہنے کو زیادہ بہتر سمجھتے تھے۔ ارشادی کے پاس بتانے کو جو کچھ تھا اس سے آمنہ کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ نہیں جاننا چاہتی تھی کہ قراقرم کے پہاڑوں پر سوامی جی نے ارشادی کو کیا کیا سکھایا ہے۔ اور ارشادی سب سیکھ بھی سکا ہے یا نہیں......
اور شادی کے بعد آمنہ کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ ارشادی نہیں سننا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان باتوں میں کوئی خوش کن بات نہیں تھی۔ جو درد موجود تھے ان کے مجرموں میں وہ بھی شامل تھا۔

چاند کی طبیعت کچھ سنبھلی تو اس نے اپنی دوائیوں کا کام پھر سے شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ انہیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ نقاہت سے ہی سہی، لیکن وہ کام کر رہی تھی۔ آمنہ بی بی اس کی مدد کر دیا کرتی تھی۔ وہ دوائیوں کو صحن میں رکھ کر سکھا لیا کرتی تھی۔ انہیں مرتبان میں محفوظ کر لیا کرتی تھی۔ لیکن وہ اتنی بوڑھی تھی کہ ہاون دستہ نہیں چلا سکتی تھی۔ یہ کام چاند کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ ارشادی اتنی مدد کر دیا کرتا تھا کہ وہ اسے جڑی بوٹیاں توڑ کر لا دیا کرتا تھا۔ جس سے دونوں بوڑھیوں کا کچھ سہارا ہو جایا کرتا تھا۔ درحقیقت...... تینوں بوڑھے ایک دوسرے کو سنبھالے ہوئے تھے۔ چاند کو تو لگ رہا تھا کہ جیسے وہ تینوں ہی عرصے سے حویلی میں رہتے رہے ہوں۔ درمیان میں کوئی صندل، کوئی باریشہ نہ آئی ہو۔ وہ تینوں ہی جنم جنم سے اس حویلی کے مکین ہوں۔

آج بڑے دنوں کے بعد چاند اپنے اندر کچھ ہمت محسوس کر رہی تھی۔ اسی لیے وہ جڑی بوٹیاں توڑنے کے لیے خود حویلی سے باہر نکلی تھی۔ آمنہ بی بی نے اسے باہر جانے سے منع کرنا چاہا تھا۔ لیکن جب اس نے دیکھا تھا کہ چاند نہا دھو کر کافی اجلی اجلی لگ رہی تھی تو اس نے اسے باہر جانے دیا تھا۔ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی چاند چھوٹے بڑے پہاڑوں کی چڑھائی چڑھنے لگی تھی اور بہت کم وقت میں اس نے اپنے لیے بہت سی جڑی بوٹیاں اکٹھی کر لی تھیں۔ دوپہر تک اس کی ٹوکری بھر چکی تھی۔ باقی کام کسی اور دن پر ملتوی کر کے وہ حویلی کو واپس ہوئی تھی۔ لیکن راستے میں ارشادی بابا کی دکان دیکھ کر وہاں رک گئی تھی۔

ارشادی بابا اپنی دکان میں موجود تھا اور نیم روشنی میں کسی میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔

www.pklibrary.com

''کیسے ہیں آپ......؟'' چاندنا نو نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔ ارشادی بابا فوراً سے چوکنا ہوا تھا۔
''آؤ آؤ چاند...... کیسے آنا ہوا ہے۔ سب خیریت تو ہے نا......''
''جی...... سب خیریت ہے۔ کچھ جڑی بوٹیاں چاہیے تھیں۔ بس وہی توڑنے نکلی تھی۔'' ٹوکری ایک طرف رکھ کر چاند اسٹول پر بیٹھ گئی تھی۔
''تو مجھے کہا ہوتا۔''
''نہیں...... آج میں اپنے اندر توانائی محسوس کر رہی تھی تو سوچا کہ خود ہی باہر جاؤں۔''
''یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن جو خبر میرے پاس ہے ڈر ہے اسے سن کر تمہاری توانائی پھر سے ضائع نہ ہو جائے۔''
''سب خیریت تو ہے نا......'' چاند نے فکرمندی سے پوچھا۔ کیا زندگی نے ابھی اور بھی کچھ دکھانا تھا۔
جواباً ارشادی بابا نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگزین چاند کے سامنے کر دیا تھا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے چاند نے میگزین پکڑ کر دیکھا تھا۔ اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ میگزین میں باریشہ کی تصاویر تھیں۔ اور وہ تصاویر ایسی تھیں کہ اس کا دل کیا تھا کہ میگزین کو فوراً سے آگ لگا دے۔
''یہ...... یہ سب کیا ہے۔؟'' حیرت کے باعث اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔
''کسی بیوٹی پارلر کا افتتاح ہے۔ باریشہ نے اس کے لیے تصویریں بنوائی ہیں۔'' ارشادی بابا کو خود جتنی سمجھ تھی اس کے مطابق اس نے چاند کو بتا دیا تھا۔
''وہ...... وہ کہاں ہے اس وقت...... کیا وہ لاہور میں ہے یا کراچی جا چکی ہے۔؟''
''نہیں...... وہ اسلام آباد میں ہے۔''
''کس کے پاس......؟''
''پتا نہیں مجھے......'' ارشادی بابا نے جھوٹ بولا تھا۔
''کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟''
''اگر تم اس سے ملنے گئیں تو وہ اسلام آباد چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ پھر تم کیا کرو گی۔ کہاں تلاش کرو گی اسے......''
''تو میں ان کا کیا کروں۔؟'' چاند نے میگزین کی تصویروں کی طرف دیکھتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔
''برداشت کرو...... اور خدا سے اس کی ہدایت کی دعا کرو۔''
''لیکن وہ کیوں ایسی ہو گئی ہے۔ میں نے اس کی تربیت ایسی تو نہیں کی تھی۔ کیا اسے یہ سب چاہیے تھا۔'' چاند دکھ سے ٹوٹ ہی تو چکی تھی۔
''شاید...... اسے یہ سب ہی چاہیے تھا۔''
''میں اسے اپنے پاس واپس لانا چاہتی ہوں ارشادی بابا......'' چاند نے منت سے کہا تھا۔ جیسے باریشہ اس مقام پر پہنچ کر ارشادی بابا کی بات ہی تو ماننے والی تھی۔
''وہ نہیں آئے گی۔ جو شخص عروج کی منزلیں طے کر رہا ہو۔ وہ پیچھے پلٹ کر کب دیکھتا ہے۔''
''یہ عروج ہے؟''
''سب کا عروج الگ الگ ہوتا ہے۔ سب کی منزل الگ الگ ہوتی ہے۔ اپنی کامیابی کے لیے انسان صحیح اور غلط کو کب دیکھتا ہے۔ یاد کرو...... صندل کو میرزاد کے ساتھ گھر سے بھگانے میں تم نے ان دونوں کی مدد کی تھی۔ تب صندل کی منزل میرزاد تھا اور تمہاری منزل صندل کی خوشی...... جس کی خاطر تم نے حویلی کی بدنامی کو بھی

www.pklibrary.com

نظر انداز کر دیا تھا۔" ارشادی بابا نے ماضی کے صفحے پلٹے تھے۔ چاند چپ ہو کر رہ گئی تھی۔
"اب باریشہ بھی اپنی خوشی کے لیے صحیح اور غلط میں فرق نہیں کر پا رہی ہے۔"
"میں...... میں اس سے ایک بار بات کرنا چاہتی ہوں ارشادی بابا...... کیا آپ میری مدد کریں گے۔؟"
چاند نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔
ارشادی بابا خاموش ہو گئے تھے۔
"میں جانتی ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ باریشہ کہاں ہے۔ میں آپ سے نہیں پوچھوں گی۔ لیکن آپ ایک بار بات تو کروا ہی تو سکتے ہیں۔"
"وہ بات کرے گی یا نہیں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں۔"
"آپ اس کی منت کر لیجیے گا۔"
"مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ مجھ سے بھی بات کرنا بند نہ کر دے۔"
"ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"
"یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو چاند......"
"باریشہ کو مجھ سے لاکھ نفرت سہی...... لیکن اسے اپنی ماں سے محبت ہے۔ اور اپنی ماں کی باتیں وہ صرف آپ سے ہی کر سکتی ہے۔ اس لیے وہ آپ سے بات کرنا کبھی بند نہیں کرے گی۔"
"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"
"آپ بات کریں گے باریشہ سے میرے لیے......؟"
"ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ تم سے بات کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔ فی الحال تم گھر جاؤ اور اس کے لیے دعا کرو۔" ارشادی بابا نے کہا تھا اور تھکے ہارے انداز میں چاند اسٹول پر سے اٹھی تھی۔
آج بہت دنوں کے بعد حویلی سے باہر نکلتے ہوئے وہ جس قدر خوش تھی۔ واپسی پر اتنی ہی زیادہ دکھی تھی۔

☆☆☆

کومل بیگم نے شہر کے سب سے مہنگے فوٹو گرافر کو ہائر کیا تھا۔ باریشہ کا پورٹ فولیو تیار کروانے کے لیے......
پورٹ فولیو کے تیار ہونے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ اس ایک ہفتے میں اس نے مختلف طرح کے ڈریس پہنے تھے۔ جو کہ سب کے سب کومل بیگم نے خود منتخب کیے تھے۔ باریشہ نے ان پر اعتراض نہیں کیا تھا۔ اب اعتراض کرنے کو کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے اب یہ کام کرنے لگی تھی۔ اور اس کام میں اپنی خوشی تلاش کر رہی تھی۔ یہ شاید واحد کام تھا۔ جس کے لیے وہ دل و جان سے محنت کر رہی تھی اور جس کے نتائج کے لیے وہ بہت پر جوش تھی۔ یہ سب اسے اچھا لگ رہا تھا۔ تیار ہونا، تصویریں بنانا...... ہر روز نئی لک...... اگر زندگی اسے اسی سمت میں آگے بڑھا رہی تھی تو وہ اسی سمت آگے بڑھنا چاہتی تھی۔ ان دنوں وہ بہت خوش تھی۔
اس ایک ہفتے کے ہر نئے دن میں اس کا الگ طرح سے میک اپ ہوا تھا اور الگ طرح کے ہیئر اسٹائل بنائے گئے تھے۔ رات میں گھر آنے کے بعد اس کا منہ دھونے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ شیشے کے سامنے بیٹھ جائے اور خود کو دیکھتی رہے۔ مزید ایک ہفتے کے بعد اس کا پورٹ فولیو بن کر آ گیا تھا۔ اور وہ اس سے کہیں بڑھ کر خوب صورت تھا جتنا باریشہ نے سوچا ہوا تھا۔
"مجھے تو خود کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ میں ہوں۔" پورٹ فولیو دیکھتے ہوئے اس نے نتاشہ سے کہا تھا۔
"شہر کا سب سے بڑا فوٹو گرافر ہائیر کیا تھا کومل میم نے تمہارے لیے...... ریزلٹ تو ایسا آنا ہی تھا کہ انسان حیران رہ جائے۔" نتاشہ نے اسے بتایا تھا۔

www.pklibrary.com

''بہت زیادہ پیسے لیے ہوں گے اس نے......''

''یس......لاکھوں میں......'' نتاشہ نے بتایا تھا۔ باریشہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ نتاشہ نے کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تو......؟ تم کیا سمجھ رہی تھیں؟''

''مجھے لگا شاید دس بیس ہزار......''

''کس دنیا میں ہو تم...... پورے تین لاکھ......'' نتاشہ نے رقم بتا دی تھی۔ باریشہ کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

''سچ میں......؟''

''یس...... میں نے ہی تو کومل میم کے ہاتھ کا لکھا ہوا چیک اسے دیا تھا۔ پورے تین لاکھ کی رقم لکھی ہوئی تھی اس پر......''

''کومل آنٹی نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اتنی رقم کون کسی پر خرچ کرتا ہے۔'' باریشہ نے کہا تھا۔ نتاشہ کا منہ ایسے بن گیا تھا جیسے وہ اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی ہے۔ وہ چاہ کر بھی باریشہ کو بتا نہیں سکتی تھی کہ جتنا پیسہ یہ لوگ تم پر خرچ کر رہے ہیں اس سے زیادہ وصول بھی کریں گے۔

''اب آگے کیا کرنا ہوگا نتاشہ......؟''

''اس پورٹ فولیو کو تمام ایجنسیوں میں بھیج دیں گے۔''

''لیکن میں تو کسی ایجنسی کو نہیں جانتی ہوں۔''

''فکر کیوں کر رہی ہو۔ میں سب ایجنسیوں کو جانتی ہوں نا...... تمہارا پورٹ فولیو سینڈ کر دوں گی۔''

''تم کتنا کچھ جانتی ہو ناں نتاشہ......'' باریشہ نے سراہتے ہوئے کہا تھا۔ نتاشہ مسکرائی تھی۔

''کومل میم نے سکھایا ہے سب......''

''کومل میم اس سب کے بارے میں کیسے جانتی ہیں؟'' باریشہ نے کچھ حیران ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔ نتاشہ اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''باقی کی باتیں پھر کسی وقت...... ابھی مجھے دوسرے کام سنبھالنے ہیں۔ کچن کی صورت حال دیکھتی ہوں جا کر...... چند دن کچن میں نہ جاؤں تو وہاں کے ورکر کام چوری کرنے لگتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جاؤ تم......''

نتاشہ وہاں سے چلی گئی تھی اور باریشہ پھر سے اپنا پورٹ فولیو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔

☆☆☆

اس بار بہار کے رنگ ان گنت تھے۔ اس نے دنیا جہان کے پھول پودے اگا دیے تھے۔ جن کی خوشبو پوری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ اُمید تھی کہ بارش کے بعد کی قوس قزح میں بھی صرف سات رنگ نہیں ہوں گے۔ بلکہ قوس قزح کپڑوں کی طرح ہر دن ہر نئے پراہن میں آسمان پر نمودار ہوا کرے گی۔ کبھی ریشمی، کبھی بنارسی، کبھی کتان میں...... باریشہ ان دنوں ایسی ہی بے سروپا باتیں سوچ رہی تھی اور خود پر ہنس رہی تھی۔

گھر قدرے خالی تھا ان دنوں...... بستامی بابا، رحیانی بابا اور سانول...... تینوں بہاولپور گئے ہوئے تھے۔ کومل آنٹی کے ذریعے اسے پتا چلا تھا کہ بستامی بابا شوگر مل خریدنے میں دلچسپی لے رہے ہیں تو بس اسی سلسلے میں تینوں وہاں گئے ہوئے تھے۔ گھر کی لڑکیاں بھی کچھ تو اپنے گھر کو گئی ہوئی تھیں اور کچھ کہاں تھیں اس کے بارے میں نتاشہ نے اتنے گول مول جواب دیے تھے کہ باریشہ کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ لڑکیاں کہاں گئی ہیں۔ نتاشہ کی عادت تھی وہ ادھوری بات بتا کر کسی کام کا بہانہ بنا کر منظر سے غائب ہو جایا کرتی

www.pklibrary.com

تھی۔ بار یشہ نے اس کی ایسی شخصیت کو قبول کر لیا تھا۔

بوریت کے ان دنوں میں باریشہ مالی انکل کے ساتھ مل کر باغ کا کام کروایا کرتی تھی۔ جس پر کومل اور ایمن اسے بہت ٹوکا کرتی تھیں۔ لیکن اسے آج کل انہیں کاموں میں مزا آ رہا تھا۔ بلکہ اسے ہر طرح کا کام کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ شاید چاند نانو کے لیے جڑی بوٹیاں ڈھونڈنا اور انہیں کوٹنا بھی اسے ان دنوں اچھا لگتا۔ خوش رہتے ہوئے وہ نئی زندگی کی تیاری کر رہی تھی۔ کومل آنٹی کے کہنے پر وہ ٹی۔ وی پر فیشن شو دیکھتی رہتی تھی۔ اور فیشن شو میں چلتی ماڈلز کی طرح چلنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس سے اسے فائدہ ہوا تھا۔ اس کی نشست و برخاست میں اتراہٹ سرائیت کرنے لگی تھی۔ وہ روز نتاشہ سے پوچھا کرتی تھی کہ کیا کسی ایجنسی سے اس کے لیے کال آئی ہے۔؟ اور نتاشہ ناں میں سر ہلا دیا کرتی تھی۔ جس سے باریشہ کو کوئی نا اُمیدی یا مایوسی نہیں ہوا کرتی تھی۔ نجانے کیسے اس نے یقین کی طاقت حاصل کر لی تھی اور اسے اپنے یقین پر یقین تھا کہ اب اسے کامیاب ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے۔

مالی انکل اور باریشہ کی کوششوں سے باغ نے چند دن میں بہت خوب صورت شکل اختیار کر لی تھی۔ جسے دیکھ کر وہ خوش ہوتی رہتی تھی۔ مالی انکل تو ویسے بھی باغ کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن اس بار باریشہ نے انہیں کچھ نئی تجاویز دی تھیں۔ جس کی وجہ سے آرائشی پھول مزید خوش نما لگنے لگے تھے۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ اور وہ شام کے علاوہ صبح میں بھی باغ میں چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ باغ میں چہل قدمی ہی کر رہی تھی جب نتاشہ بھاگتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی۔

''باریشہ...... باریشہ......'' نتاشہ کا سانس پھولا ہوا تھا۔ لیکن چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جس کی وجہ سے باریشہ کو کوئی تشویش نہیں ہوئی تھی۔

''کیا ہوا ہے نتاشہ......''

''ایک ایجنسی سے تمہارے لیے کال آئی ہے۔'' نتاشہ نے مسکراتے چہرے کے ساتھ اسے خوش خبری سنائی تھی۔

☆☆☆

شیشے میں موجود اس کا عکس کسی حور پری کا عکس تھا۔ کسی کوہ قاف کی شہزادی کا...... جس کی کہانیاں وہ بچپن میں حاجی بوا سے سنا کرتی تھی۔ وہ عکس اس کا ہرگز نہیں تھا۔ خود کو دیکھتے ہوئے بھی اسے لگ رہا تھا کہ یہ کوئی اور ہے۔ وہ نہیں ہے۔ یہ جو نظر آ رہی تھی یہ باریشہ نہیں تھی۔ اگر تھی تو وہ والی نہیں جو حویلیاں میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ تو کوہ قاف میں پیدا ہوئی تھی۔

بیوٹیشن نے اس کی آنکھوں میں سنہرے رنگ والی کچ... یں اتاری تھی۔ اور ہونٹوں پر سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی۔ یہ دونوں رنگ تو وہ خود بھی بارہا استعمال کر چکی تھی لیکن کبھی اتنی پیاری نہیں لگی تھی جتنی آج لگ رہی تھی۔ لہریں ڈالیں بال اس کے حسن کو مزید نکھار رہے تھے۔ آج وہ پہلی بار ریمپ پر جانے والی تھی اور عزم تھا کہ پہلی ہی بار میں سب کو اپنا گرویدہ کر لے گی۔

گزرے تین ماہ میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ باریشہ کو بہت سے کامیابیاں مل چکی تھیں۔ اگر وہ کامیابیاں ہی تھیں تو...... چونکہ ان دنوں اس کے سوچنے سمجھنے کی ساری ڈوریں کومل اور ایمن کے ہاتھوں میں رہی تھیں تو اسے نہیں اندازہ ہو پا رہا تھا کہ کامیابی کیا ہوتی ہے اور ناکامی کیا ہوتی ہے۔ وہ صحیح اور غلط میں فرق کرنے سے قاصر تھی۔

ایک ایجنسی کے تحت اس نے اپنی پہلی پیپر ماڈلنگ کی تھی۔ لان کے ڈریسز کی ماڈلنگ تھی جو کہ کمپنی کے ان لے کارڈ پر پبلش ہوئی تھی۔ یہ ماڈلنگ کسی میگزین کے لیے نہیں تھی۔ لیکن باریشہ کو خوشی تھی کہ اس کے کام کی شروعات ہو چکی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ ایسی ہی آفرز آنے لگی تھیں جو کہ کومل بیگم کے کہنے پر وہ کرتی چلی گئی تھی۔ کچھ

www.pklibrary.com

ایک دو چھوٹے لیول کے شوٹ تھے جو اس نے کیے تھے۔ کومل بیگم اس کے لیے بہت کوششیں کر رہی تھی جس پر باریشہ کا تو خیال تھا کہ وہ اس کی مدد کر رہی ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے الٹ تھی۔ باریشہ کو وہاں رہتے ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور کومل بیگم اس بات سے چڑنے لگی تھی کہ باریشہ مفت کی روٹیاں توڑ رہی ہے۔ اسے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہونے لگتی تھی جو اسے کما کر نہ دیں۔ وہ روشن بیگم کی طرح مسکراہٹ چہرے پر سجائے رحم دلی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ کومل بیگم کی عادت تھی کہ جب بات اس کے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھی تو وہ اپنے چہرے کی سختی کو چھپا نہیں پاتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ باریشہ اس کا دوسرا روپ دیکھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ چاہتی تھی کہ باریشہ جلد سے جلد اس کے لیے کمانا شروع کر دے۔ اور ان سب باتوں سے انجان باریشہ اس کے کمائی کے ذریعے کو اپنی کامیابی تصور کیے ہوئے تھی۔ آج کا شو بھی کومل بیگم کی کوششوں کی وجہ سے ہی ملا تھا اسے......

"تیار ہو؟" نتاشہ نے اس کے پاس آ کر پوچھا تھا۔

"ہاں...... دیکھو مجھے...... کیسی لگ رہی ہوں۔" اس نے اپنا آپ گھوم کر نتاشہ کو دکھایا تھا۔ نتاشہ اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ گہرے میرون رنگ کا لہنگا اور بلاؤز اس پر بہت پیارا لگ رہا تھا۔

"تم...... تم بہت پیاری لگ رہی ہو باریشہ......"

"آج مجھے بھی اپنا آپ پیارا لگ رہا ہے۔"

"ارشادی بابا کی کال آ رہی ہے۔ وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"جانتی ہوں کہ انہوں نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں چاند نانو سے بات کروں۔" باریشہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تھا۔

"تو کر لو۔ اس میں کیا ہے۔ وہ کافی دنوں سے تمہاری منتیں کر رہے ہیں۔" نتاشہ نے کہا تھا۔ باریشہ کا دل نہیں تھا چاند نانو سے بات کرے۔

"یار، کر لو بات...... ان بوڑھے لوگوں کی زندگی موت کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔"

"میں انہیں کہہ دیتی ہوں کہ تیس منٹ بعد کال کریں۔ ابھی تمہیں اسٹیج پر بھی جانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کہہ دو پھر......"

"تم وہاں جاؤ...... بہت جلد تمہاری باری آنے والی ہے۔" نتاشہ کے کہنے پر وہ اس حصے کی طرف گئی تھی جہاں لڑکیاں لائن بنا کر کھڑی تھیں اور اپنی باری پر اسٹیج پر جا رہی تھیں۔

نتاشہ ارشادی بابا کو کال کرنے لگی تھی۔

☆☆☆

سارا ہال روشنیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ریمپ کے دائیں بائیں ایلیٹ کلاس سر دھرے لیے موجود تھی۔ پھر نئے ڈیزائنر کے شو کے لیے لائٹس بند کر دی گئیں۔ اور پورے ہال میں نصرت فتح علی خان کے "آفریں آفریں" کی دھنیں گونجنے لگی تھیں۔ سب کی نظریں اسٹیج پر لگی ہوئی تھیں۔ سب سے پہلے باریشہ بیک اسٹیج سے اسٹیج تک آئی تھی۔ اور جیسا کے ڈیزائنر نے اسے کہا تھا وہ درمیان میں آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ پھر دائیں بائیں سے لڑکیاں ایک ایک کر کے نکلنا شروع ہوئی تھیں اور لمبے اسٹیج کے آخری حصے تک جانے لگی تھیں۔ جہاں میڈیا کے لوگ اور فوٹو گرافر موجود تھے۔

لڑکیاں وہاں تک جاتی تھیں اور پوز کر کے واپس ہوتی تھیں۔ اپنی باری کی منتظر باریشہ سانسوں کو نارمل کرنے کی کوششوں میں لگی ہوئی تھی۔ پھر جب ساری لڑکیاں اپنی پرفامنس دے چکیں تو اس کی باری آ گئی۔

www.pklibrary.com

باریشہ نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ کومل آنٹی کی بدولت اس شو کا سب سے بہترین لباس اسے پہننے کو دیا گیا تھا۔ اور وہ آج اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اس سے بھی بڑھ کر خوب صورت لڑکیاں اسے رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ اس کی چال میں خود بخود ہی اتراہٹ آتی چلی گئی تھی۔

آنکھیں دیکھیں تو میں دیکھتا رہ گیا

جام دونوں اور دونوں ہی دو آتشہ......

نصرت فتح علی خان کا آفریں آفریں دوسرے بند پر پہنچ چکا تھا اور باریشہ اسٹیج کے وسط تک پہنچ چکی تھی۔ اسے بھی باقی لڑکیوں کی طرح اختتام تک جانا تھا اور فوٹو گرافرز کے آگے پوز کرنا تھا۔

آنکھیں ان کو کہوں یا کہوں خواب ہیں

وہ بچ بچ کر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے انگ انگ میں اتراہٹ تھی۔ لیکن پھر جب کہ وہ لمبے اسٹیج کا ایک بڑا حصہ طے کر چکی تھی اسے احساس ہوا کہ کچھ ہوا ہے۔ کچھ انوکھا جس نے اس کو فوراً سے الرٹ کر دیا تھا۔ اس کے چھونے سے بلاؤز کی تینوں ہکیں پیچھے سے کھل گئی تھیں۔ یا شاید ٹوٹ ہی گئی تھی۔ اس سے اگلا قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ فق نظروں سے سامنے موجود فوٹو گرافرز کو دیکھنے لگی تھی۔ یہ کنفرم کرنے کے لیے کہ اس کی کمر پیچھے سے دوپٹے سے ڈھکی ہوئی ہے اس نے دوپٹے کو دیکھنا چاہا تھا اور تب ہی اچھے سیٹ کیا ہوا دوپٹا بھی نجانے کیسے اس کے کندھوں سے اتر کر نیچے جا گرا تھا۔ وہ جلدی سے دوپٹے کو اٹھا کر کندھوں پر ڈال لینا چاہتی تھی جب اس کی لمبی ہیل ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک پاؤں سے بری طرح لڑکھڑائی تھی اور سارا وزن دوسرے پاؤں پر ڈالے کھڑی تھی جب ہلکی سی آواز کے ساتھ دوسرے پاؤں کی ہیل بھی ٹوٹی تھی۔ وہ لڑکھڑا کر گری تھی اور اسٹیج پر پوری لیٹ ہی گئی تھی۔

ہال کی لائٹس جلدی سے بجھا دی گئی تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس اندھیرے میں بس ایک چیز چمک رہی تھی۔ باریشہ کی آنکھوں میں موجود آنسو......

آنکھیں جن میں ہے آسمان و زمین
نرگسی نرگسی ہرگی سرگی

اس کا دل کیا تھا کہ وہ اتنا روئے اتنا روئے کہ اس کی قسمت کے سارے دکھ آج ختم ہو جائیں۔

☆☆☆

پندرہ منٹ سے وہ مسلسل رو رہی تھی۔ نہ تو اس کا رونا کم ہو رہا تھا اور نہ ہی اس کے آنسو تھمنے میں آ رہے تھے۔ نتاشہ پورے خلوص کے ساتھ اسے چپ کروا رہی تھی۔ جس سے بس اتنا ہی فائدہ ہوا تھا کہ اس کے رونے کی آواز بند ہو گئی تھی۔ لیکن آنسوؤں کو نتاشہ بھی ختم نہیں کر سکی تھی۔ باریشہ کا دکھ بے انت تھا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسٹیج کو آگ لگا دے یا خود کسی دریا میں کود جائے۔ اگرچہ دونوں کام ہی بے کار تھے۔ وہ اس کی بے عزتی کو کم نہ کر سکتے تھے۔

''ہو جاتا ہے باریشہ...... تم کیوں خود کو ہلکان کر رہی ہو۔'' نتاشہ نے پیار سے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میرے ساتھ ہی کیوں ہوتا ہے۔'' دکھ سے چور ہو کر روتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''سب کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔''

''میرے ساتھ یہ دوسری بار ہوا ہے۔'' باریشہ کی اس بات پر نتاشہ بھی خاموش ہو گئی تھی۔ واقعی ہی میں باریشہ کے ساتھ دوسری بار برا ہو رہا تھا۔ اس کا رونا جائز تھا۔

''میم پتا کروا رہی ہیں کہ یہ کس کی سازش ہے۔ فکر مت کرو...... سب پتا چل جائے گا۔ اور جو کوئی بھی اس

www.pklibrary.com

سازش کے پیچھے ہوگا اس کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جائے گا۔"

"میں جانتی ہوں کہ یہ کس کی سازش ہے۔" آنکھوں میں نفرت سی بھرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"کس کی......؟؟" تناشہ کو اتنی جلدی پتا چل جانے پر حیرت ہوئی تھی۔

"چاند نانو کی......" باریشہ نے کہا تھا۔

تناشہ نے کوفت سے گہرا سانس بھرا تھا۔ وہ باریشہ کی طرح سوچنے کی عادی نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ یہ چاند نانو کا ہی کام ہے۔"

"وہ یہاں موجود نہیں تھیں باریشہ......"

"تم نہیں جانتیں اس عورت کو...... جادوگرنی ہے وہ......"

تناشہ چپ ہو گئی تھی۔ وہ بھلا کیا تبصرہ کرتی......

"میں تمہارے لیے کافی منگواتی ہوں۔"

"ارشادی بابا کو کال ملاؤ...... چاند نانو وہاں ہی ہوں گی نا......؟"

تناشہ جاتے جاتے رکی تھی۔

"ہاں...... انہوں نے کہا تو ایسا ہی تھا کہ وہ پندرہ منٹ تک چاند کو وہاں بلا لیں گے۔"

"کال کرو پھر ارشادی بابا کو......"

باریشہ کے کہنے پر تناشہ نے مزاحمت نہ کرتے ہوئے کال ملادی تھی اور موبائل باریشہ کو دے دیا تھا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ پھر کال اٹینڈ کر کے جیسے فون چاند نانو کو ہی دے دیا گیا تھا۔

"ہیلو باریشہ...... کیسی ہو میری جان......" چاند نانو کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ اور یہ آواز باریشہ کو اتنی بری لگی تھی کہ اس کا دل کیا تھا کہ اس آواز کا گلا گھونٹ دے۔

"کیا سمجھتی ہیں آپ خود کو چاند......" اس نے زہر خندہ لہجے میں کہا تھا۔

دوسری طرف چاند نانو باریشہ کے ایسے لہجے پر سہم گئی تھی۔ وہ اس بات کی اُمید تو ضرور ہی رکھے ہوئے تھی کہ باریشہ اس کا حال پوچھے گی۔ اگرچہ سرد مہری سے ہی پوچھے۔ لیکن باریشہ کے انداز پر وہ ڈر گئی تھی۔

"کیا آپ خود کو کوئی ولی اللہ خیال کیے ہوئے ہیں چاند نانو...... اگر آپ ایسا سمجھتی ہیں تو میں آپ کو بتا دوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کوئی ولی اللہ نہیں ہیں۔ بلکہ آپ جادوگرنی ہیں۔ کالا جادو کرنے والی جادوگرنی...... جو زندگیاں برباد کرنے کا ہنر جانتی ہیں۔"

"یہ...... یہ تم کیا کہہ رہی ہو باریشہ......"

"میں آپ کو بتا دوں کہ مجھ پر آپ کا کوئی جادو نہیں چلنے والا ہے۔ آپ اپنے عملوں سے جتنی چاہے رکاوٹیں کھڑی کر لیں میری راستے میں...... میں اب اس راستے پر ہی چلوں گی۔"

"میں تو تمہارا حال پوچھنے کے لیے تم سے بات کرنا چاہتی تھی باریشہ......"

"میرا حال پوچھنے کے لیے یا مجھ پر طنز کرنے کے لیے......"

"میں تم پر طنز کیوں کروں گی۔"

"کیونکہ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ جس وقت میری بے انتہا بے عزتی ہوئی ہے اسی وقت آپ کا فون آیا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے میری جان...... جیسا تم سوچ رہی ہو۔"

"مت کہیں مجھے میری جان...... نفرت ہے مجھے اس دوغلے رویے سے......"

"ایسا کیا کر دیا ہے میں نے باریشہ...... میں نے تو ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے۔"

www.pklibrary.com

"آپ میری بھلائی چاہتی ہیں تو دوبارہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کیجیے گا چاند نانو...... ورنہ میں یہ ملک چھوڑ کر کہیں دُور چلی جاؤں گی اور کبھی واپس نہیں آؤں گی۔" باریشہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا اور فون بند کر دیا تھا۔ گہرا سانس بھرتے ہوئے وہ خود کو نارمل کرنے لگی تھی۔ پاس پڑے ٹشو باکس میں سے اس نے اپنے لیے ٹشو نکالا تھا اور اپنے باقی ماندہ آنسو صاف کرنے لگی تھی۔

"کیا اب سنگیت کی طرح ماڈلنگ بھی چھوڑ دو گی۔؟" بہت لمحے بیت جانے کے بعد ناشہ نے اس سے پوچھا تھا۔

"ہرگز نہیں...... میں چاند نانو کے عزائم کو کبھی پورا نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے ایک عزم سے کہا تھا۔

☆☆☆

بڑے کمرے میں زویا کا ایک جاندار قہقہہ گونجا تھا۔

"کیا سچ میں......؟ سب ایسا ہی ہوا جیسا تم بتا رہے ہو۔ یا مجھے خوش کرنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہو؟"

"میں کیوں جھوٹ بولوں گا۔ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ جیسا بتایا سب ویسا ہی ہوا۔"

"باریشہ جب اسٹیج پر گری ہوگی تو سب خوب ہنسے ہوں گے۔"

"وہ گری ہی اس طرح سے تھی کہ ہنسی روکتے والے بھی اپنی ہنسی نہیں روک سکے ہوں گے۔" زویا کے بیٹے نے اسے بتایا تھا اور زویا مزید کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

"پھر...... پھر بیک اسٹیج کیا ہوا؟"

"بیک اسٹیج جا کر وہ پورے پندرہ منٹ تک روتی رہی...... پھر اس نے اپنی نانو کو فون کیا۔"

"کیا کہا اس نے چاند کو......" چاند کا ذکر لبوں پر آتے ہی زویا کی ساری مسکراہٹ دُور ہو گئی تھی اور لہجے سمیت پورے چہرے سے ایک نفرت جھلکنے لگی تھی۔

"میں دُور کھڑا تھا۔ باتیں تو نہیں سن سکا۔ لیکن باریشہ بہت زیادہ رو رہی تھی۔ چیخ چلا رہی تھی۔"

"ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ...... میرا بھائی بھی بہت رویا تھا۔ چیخا تھا، چلایا تھا۔ بہت درد سہا ہے میرے بھائی نے چاند کی وجہ سے...... اب چاند کی باری ہے......" زویا نفرت سے بولتی چلی گئی تھی۔ اس کا بیٹا خاموش کھڑا اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ ماں کے اندر موجود غصے اور نفرت کی آگ نجانے کب بجھنے والی تھی۔

"کاش، تم مجھے بھی اپنے ساتھ اسلام آباد لے جاتے۔ وہ سارا منظر میں اپنی آنکھوں سے دیکھتی۔" زویا نے خود ہی موضوع کو بدلا تھا۔

"پھر کبھی ایسا کریں گے تو ضرور لے کر جاؤں گا آپ کو......"

"اب تم کیا کرو گے؟"

"جو آپ کہیں گی۔"

بیٹے کے سوال پر زویا اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گئی تھی۔ کھڑکی کو اس نے کھول دیا تھا۔ سمندر کی نمی کو سموئے ہوئے کراچی کی ہوا کمرے میں چلی آئی تھی۔ جس میں زویا نے چند ایک گہرے سانس لیے تھے۔

"چاند سے اس کا آخری سہارا چھین لو۔ باریشہ کو جان سے مار دو......"

☆☆☆

برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ بارش کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس وقت برسنا شروع ہو جائے۔ وہ جب گھر سے نکلی تو موسم اچھا خاصا خوش گوار تھا۔ لیکن پھر شام ہوتے ہوتے گہرے بادل آنے لگے تھے۔ جنہوں نے شام کے منظر کو رات میں بدل دیا تھا۔ اس کا ارادہ فیصل مسجد تک واک کرتے ہوئے جانے کا تھا۔ آج ایک عرصے کے بعد گھر سے اکیلا نکلنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔ جیسے وہ حویلیاں میں اکثر نکلا کرتی تھی۔ چاند کے لیے جڑ

www.pklibrary.com

ی بوٹیاں اکٹھا کرنے کے لیے...... اور جڑی بوٹیوں اور ان کی کین والی نوکری کو یاد کرتے ہوئے باریشہ نے سر جھٹکا تھا۔ کیا وقت یاد آ جاتا تھا اسے بھی...... بھلا جڑی بوٹیوں اکٹھا کرنا اور موسم کو انجوائے کرتے ہوئے گھر سے باہر نکلنے کا آپس میں کیا تعلق تھا۔ لیکن بار بار کا سر جھٹکنا بھی اس کی یادوں کو نہیں جھٹک سکا تھا۔

ایک سڑک کا موڑ مڑ کر جب وہ دوسری سڑک تک آئی تو سامنے مارگلہ کی پہاڑیاں تھیں۔ جن پر گاڑیوں کی فلش لائٹ کی روشنیاں جگنوؤں کی طرح تیرتے ہوئے نظر آ رہی تھیں۔ انہی پہاڑوں کے پیچھے حویلیاں تھا۔ ایک کم آبادی والا گمنام سا شہر...... سائرہ کے لفظوں میں ایک قصبہ...... جہاں کی ایک پرانی حویلی میں چاندنا نو بیٹھے ہوئے نجانے اس وقت کیا کر رہی ہوں گی۔

سوچوں میں گم وہ آگے بڑھتی جا رہی تھی جب اس پر بارش کا ایک قطرہ گرا تھا۔ اس نے فوراً سے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا تھا۔ کالے بادل ڈیرا ڈال چکے تھے۔ وہ آج اسلام آباد کو پھر سے بھگونے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ باریشہ نے لمحے بھر کو سوچا تھا اور پھر واپسی کے قدم بڑھا لیے تھے۔ اس کا ہینڈ بیگ تو اس کے پاس تھا لیکن اس میں موبائل فون نہیں تھا۔ اگر بارش تیز ہو جاتی تو وہ گھر سے ڈرائیور کو نہیں بلا سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ واپس ہی جایا جائے۔

شام اتنی گہری ہو گئی تھی جیسے آدھی رات کا وقت ہو۔ اسٹریٹ لائٹس کی روشنی بھی اس کے آگے کم لگنے لگی تھی۔ شارٹ کٹ لینے کے لیے سڑک سے ملحقہ وہ ایک گلی میں داخل ہوئی تھی۔ گلی تاریک تھی اور سنسان بھی...... اسے وہاں جاتے ڈر محسوس ہوا تھا۔ لیکن گلی زیادہ لمبی نہیں تھی اور گلی کے دوسرے سرے پر رواں دواں سڑک نظر آ رہی تھی۔ بے خوف ہو کر اس نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی وہ گلی کے وسط تک ہی پہنچی تھی کہ اپنی پشت پر اسے ایک بائیک کے گلی میں داخل ہونے کی آواز سنائی دی تھی۔ بے اختیار ہی اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ ایک نوجوان لڑکا بائیک چلا رہا تھا جو باریشہ کو ہی دیکھ رہا تھا اور پھر جلد ہی اس تک پہنچ گیا تھا۔ تیزی سے آتی بائیک کو اس نے باریشہ کے آگے آ کر اس طرح سے روکا تھا کہ باریشہ کا راستہ ہی رک گیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی...... بائیک پر موجود لڑکا جلدی سے اترا تھا اور اگلے ہی پل اس نے اپنی پینٹ کی پشت سے پستول نکال کر باریشہ کے سامنے کیا تھا۔

''چلانا مت...... یہاں ویسے بھی تمہاری چیخ کوئی کوئی نہیں سنے گا۔'' لڑکے نے کہا تھا اور تب ہی بادل زور سے گرج کر ٹوٹے تھے۔ لمحے بھر میں ہلکی بارش نے تیزی پکڑ لی تھی۔

''ک...... کیا چاہتے ہو۔؟'' باریشہ بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ پستول اس کی طرف تانے وہ لڑکا اسے دیکھ رہا تھا۔ ''یہ لو......''

باریشہ نے اپنا ہینڈ بیگ اس کی طرف اچھال دیا تھا کہ لڑکے کو وہی چاہیے ہو گا۔ لیکن لڑکے نے اپنے قدموں میں گرے ہینڈ بیگ کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیا تھا۔ جس سے واضح ہو گیا تھا کہ اسے پیسوں سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

''کیا چاہتے ہو۔؟'' باریشہ پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ لڑکے نے اگلے ہی پل اپنی کہنی اس کی گردن پر رکھتے ہوئے اسے دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا۔ اس کے بازو کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ باریشہ پوری جان لگا کر بھی اپنا آپ نہیں چھڑوا سکتی تھی۔ پستول والا ہاتھ اس نے اس کے پہلو پر رکھ دیا تھا۔ پستول کی نال باریشہ کو اپنی پسلیوں پر چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

''تم کیا مجھے مارنا چاہتے ہو۔؟'' ڈر سے کانپتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

''ہاں......'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے لڑکے نے اتنے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ باریشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اس کے پاس زندگی کے بس چند لمحے ہی باقی بچے ہیں۔

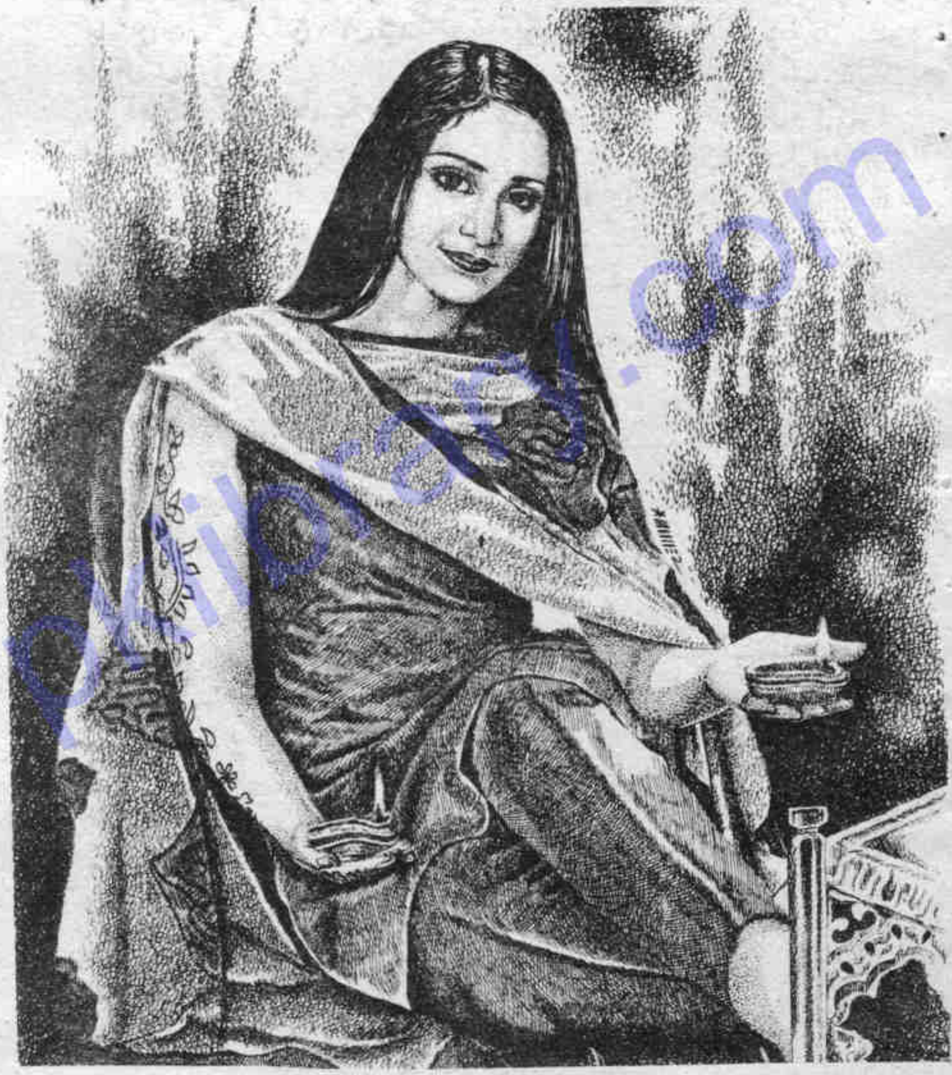
☆☆

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

www.pklibrary.com

جویریہ مریم

کبھی مُسکراؤ تو اس طرح



pklibrary.com

www.pklibrary.com

دو کمروں اور کشادہ صحن والے اس گھر میں بارات کی واپسی کا بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ مگر اماں کی بے چینی سب سے الگ تھی۔ جیسے ہی عمر اپنی دلہن کے ہمراہ گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے اسے جالیا اور بازو سے دبوچ کے کمرے کے کونے میں گھسیٹ کر لے گئیں۔ وہ بے چارہ۔ "ارے ...... ارے اماں اماں یہ کیا۔" ہی کہتا رہ گیا۔ مگر آج تو اماں جیسے بھیس بدل چکی تھیں۔

"سچ سچ بتاؤ کتنی سلامی ہوئی ہے؟ سلامی کا ایک ایک روپیہ شرافت سے نکال کے میری ہتھیلی پہ رکھ دو۔"

عمر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا۔ کچھ کہتا۔ اماں نے کسی ماہر ڈکیٹ کی طرح اس کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ عمر اڑی رنگت سے کھڑا تلاشی دے رہا تھا۔ مگر یہ کیا؟ اماں کی ہتھیلی پہ صرف پندرہ سو روپے تھے۔

عمر نے مجرموں کی طرح نظریں، سر دونوں جھکا لیے۔

"یہ کیا ہے۔" اماں دبی آواز میں دھاڑی تھیں۔

"اماں! یہ ہی ہیں بس ...... بس اتنی ہی سلامی دی ان لوگوں نے۔ آپ کو پتا تو ہے کہ غریب لوگ ہیں وہ......" عمر منمنایا تھا۔

"تم کہیں میرے ساتھ کوئی ہیر پھیر تو نہیں کر رہے؟" اماں نے مشکوک انداز میں کہا تھا۔

"نہیں اماں! آپ کی قسم! بس یہ ہی پیسے ہیں جو آپ نے لے لیے۔" عمر جیسے رو دینے کو تھا۔

اماں غصے سے برس پڑیں۔

"ارے ان پر پڑے خدا کی مار۔ ٹٹ پونجیوں کو ذرا شرم نہ آئی ان اپنی کنجوسی دکھاتے ہوئے۔"

"اوئے عمر! تو ادھر چھپ کے بیٹھ گیا ہے۔ باہر آ ذرا۔" تایا کا آیان آیا تو اماں تھوڑی دھیمی پڑی تھیں۔

"اچھا یار! آ رہا ہوں۔" عمر نے لاچاری سے کہا تھا۔

"ابھی کے ابھی آ۔" آیان بضد ہوا تھا۔ عمر کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح اس کے پیچھے چل پڑا تھا۔ اماں بھی بڑبڑاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔

باہر آ کر تو جیسے عمر کے سر پہ آسمان آ گرا تھا۔ کیونکہ اس کی دونوں بہنیں اور تین چار کزنز اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں نیگ لینے کے لیے۔ دلہن بے چاری کب سے باہر ہی کھڑی تھی۔

"ہائے وے ربا! ہون کی کراں؟" وہ چکرا سا گیا تھا نئی نویلی دلہن کے سامنے بے عزتی کا سوچ کے ہی پسینے آ گئے تھے۔

"پورے پانچ ہزار پہلے نکالیں پھر کمرے میں قدم رکھیں۔ ورنہ ساری رات ادھر ہی کھڑے رہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" لہرا لہرا کر کہا گیا تھا۔

وہ بھونچکا سا کبھی اماں کو دیکھتا اور کبھی ان کو جو اس کے کمرے کے دروازے پر راستہ روکے کھڑی تھیں۔

اماں تو ایسے اجنبی ہو گئی تھیں۔ جیسے عمر کو جانتی ہی نہ ہوں۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے شروع ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" انس نے اس کی کیفیت کو بھانپ کے آہستگی سے پوچھا تھا۔ وہ اس کا تایازاد اور گہرا دوست بھی تھا۔

"یار!...... ذرا ادھر آ۔"

عمر نے ذرا فاصلے پہ لے جا کر سارا ماجرا سنایا۔ انس حیران پریشان سا رہ گیا پھر اسے حوصلہ دیا اور کچھ نوٹ اپنی جیب سے نکال کر اس کی مٹھی میں دبائے۔ "پریشان نہ ہو......"

عمر نے تشکر سے اسے دیکھا تھا، تھینک یو انس!"

"اس کی ضرورت نہیں تو اس وقت جا اپنی

www.pklibrary.com

عزت رکھ لے۔ بھابھی کے سامنے ۔" انس نے شرارت سے کہا اور وہ سکھ کے سانس لیتا ان آفتوں کو نمٹانے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

دلہن کے مہمان آ کر دلہن کو لے جا چکے تھے۔ اکا دکا مہمان بچے تھے گھر میں، وہ بھی اب جانے کی تیاریوں میں تھے، اماں کل سے خون کے گھونٹ پیے بیٹھی تھیں پندرہ سو سلامی پر۔

"عمر کے ابا! یہ عمر کے سسرال والے ایسے بھوکے، ننگے، ٹٹ پونجیے ہوں گے یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا۔ غضب خدا کا، سلامی دی کہ بے عزتی کی۔ پندرہ سو سلامی ہوئی ساری ادھر عمر کی۔"

ابا جو لکڑی کے موٹے پایوں والی چارپائی پہ بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چونک سے گئے۔ وہ بے خبر تھے اس راز سے۔

"بالکل ہی مرے ہوئے ہیں خبیث! ارے اس دور میں تو غریب سے غریب ساس بھی دو ہزار دیتی ہے۔" ابو کی پیشانی شکن آلود ہو چکی تھی۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ خود جاؤں اور ان کے منہ پر مار کر آؤں ان پندرہ سو کو کہ "لو رکھو یہ بھی، ہمیں نہیں ضرورت بھیک کی۔" اماں کو رہ رہ کر ابال سے اٹھ رہے تھے۔

"ارے یہ ایسی بات کیوں سوچی ہو تم...... ہم اپنا بدلہ نکال لیتے ہیں دوسری طرح۔ بہو کی سلامی پہ بھی ہمارا حق ہے نیک بخت......!"

"او...... تواڈا بھلا ہووے۔" اماں یوں اچھلی تھیں جیسے بچھو نے ڈنک مار لیا ہو۔

"میری عقل ختم ہو گئی تھی اور وہ مہارانی ادھر کی سلامی کے ساتھ ساتھ ادھر کی سلامی بھی سمیٹ سمٹ کر ہوا ہو گئی ہے۔"

اماں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی دلہن کے گھر جا کر سلامی کے پیسے لے کر آئیں۔ ابا کا بھی سارا موڈ غارت ہو گیا تھا۔

"عمر...... او عمر!" ابا دھاڑے تھے۔

"جی ابا جی!" عمر بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔

"جی ابا جی کے بچے، فون ملا ذرا اپنی اس ہوتی سوتی کو جو ساری سلامی سمیٹ کر چلتی بنی ہے۔ میرے دھیان میں نہیں رہی یہ بات تو اس کو خود سوچ لینی چاہیے تھی۔ کہ سلامی پر تو ہوتا ہی ساس کا حق ہے۔"

ان کی منطق سن کر عمر وہ حالت ہوئی جا رہی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اپنی ایک دن کی دلہن کو بھلا وہ یہ بات کیسے کہہ سکتا تھا۔

"ہاں تو اور کیا۔ اس سے کہو کہ ایک روپیہ بھی ادھر سے ادھر نہ ہو سلامی کے پیسوں میں سے۔" ابا نے بے حد روکھے لہجے میں کہا تھا۔

عمر تو کل سے پریشان ہو گیا تھا ان کے بدلے اطوار، دیکھ کر۔ یقین نہیں آ رہا تھا اسے کہ یہ وہ ہی میرے اپنے اماں ابا ہیں۔

"ابا! میں بھلا کیسے کہوں یہ بات۔ نری بے عزتی ہے یہ تو!" عمر تھوک نگل کے منمنایا تھا۔

ابا یہ سن کر جلال میں آ گئے تھے۔

"کیسے کہوں؟ ارے اسی زبان سے جو تمہارے منہ میں ہے اور جس سے ہماری بات کو رد کر رہے ہو۔ ملاؤ فون ابھی کے ابھی؟"

انہوں نے سخت غصے میں آرڈر کیا تو عمر نے میکانکی سے انداز میں فون ملا دیا مگر حلق سوکھا جا رہا تھا اس کا۔

"دیکھ رہے ہو اس کے رنگ ڈھنگ ......! ایک دن ہوا ہے شادی کو اور یہ کیسا زن مرید ہوا جا رہا ہے!"

عمر نے ہکا بکا ہو کر اماں کو دیکھا تھا۔

"اماں! میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟" اسے حقیقی معنی میں صدمہ ہوا تھا۔ ابا نے اسے بیزاری سے دیکھا تھا۔

"او تو، فون ملا اور اس سے کہہ جو میں نے کہا

www.pklibrary.com

ہے۔"

"ابا! ملایا ہے رابطہ نہیں ہو رہا۔ بس خود دیکھ لیں۔" عمر نے آواز اونچی کی تھی۔

"بار بار ملاتا رہ۔ جیسے ہی رابطہ ہوتا ہے اس سے سختی سے کہہ دے یہ بات۔" اماں نے اجنبی سے لہجے میں کہا تھا۔ اور وہ صدمے سے اپنے اماں ابا کے اس نئے روپ کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

دلہن واپس آ چکی تھی۔ اور عمر کا خون خشک ہوا جا رہا تھا سوچ سوچ کے...... کہ وہ کیسے کہے۔ وہ انتہائی خوددار اور بامروت انسان تھا۔

"کہا کہ نہیں ابھی تک؟" ابا نے رعب دار سے لہجے میں پوچھا۔

"ابا! تھوڑی دیر ٹھہریں۔ ابھی تو آئی ہی ہے۔ ایسے تو اچھا نہیں لگتا۔" عمر منمنایا تھا۔

"کیوں اچھا نہیں لگتا۔ لو میں کہہ دیتا ہوں۔" ابا اطمینان سے اٹھ کے چل دیے تھے اس کے کمرے کی طرف۔ عمر کی روح فنا ہوئی تھی۔ وہ تقریباً بھاگا تھا ابا کے پیچھے۔

"ابا ......! میں کہہ دیتا ہوں خود ...... آپ زحمت نہ کریں۔ پلیز! ...... پلیز ابا!" اس نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

ابا نے اسے گھورا تھا۔

"انسان کے پتر بنو۔ جا کے لو اس سے سلامی کے پیسے۔"

عمر نے کئی گہرے، گہرے سانس لیے تھے اور اپنی پیشانی کو ہتھیلی سے صاف کیا تھا۔ اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ ابا نے پکار لیا۔

"بات سنو!"

"جی ابا جی!"

"اپنی سالیوں کو پچاس پچاس روپے سے زیادہ تو نہیں دے کے آئے ہو ناں؟"

"نہیں ابا جی! آپ کا حکم تھا کہ پچاس روپے ہی دینے ہیں تو زیادہ بھلا کیسے دے سکتا تھا۔"

ابا نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

"ہاں ...... بالکل ٹھیک کیا۔ بھئی جیسا منہ ویسا تماچا ارے پندرہ سو سلامی دینے والوں کو تو پچاس روپے بھی نہیں ملنا چاہیے تھا۔ لیکن اب اگر ہم بھی ان کے جیسا ہی ہو جائیں تو ان میں اور ہم میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"ہوں۔" عمر نے مرے مرے سے انداز میں کہا تھا اور ڈھلکے سے کندھوں سے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

اگر مجھے پتا ہوتا کہ یہ شادی ایسے ذلیل کر دینے والی چیز کا نام ہے تو کبھی شادی نہ کرتا۔ دو تین دن میں دو کوڑی کا ہو کے رہ گیا ہوں۔ اس نے سوچا تھا۔

اس کی نئی نویلی دلہن عمارہ بیڈ پہ بیٹھی تھی فون کان سے لگائے۔ اسے دیکھ کے بات ختم کر کے اللہ حافظ کہہ دیا تھا۔

"کون تھا؟" عمر نے یونہی سرسری سا استفسار کیا تھا۔

"چھوٹی بہن تھی۔" عمارہ مسکرائی تھی۔

"ہوں۔" وہ آنکھوں پہ بازو رکھ کے لیٹ گیا تھا۔

"طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟"

"ٹھیک ہوں۔" وہ اٹھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اضطراری سے انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"وہ ...... وہ" اس نے تھوک نگل کے عمارہ کو دیکھا تھا جو بہت پراعتماد تھی۔

"جی ...... وہ کیا؟" وہ حیران ہو رہی تھی اس کی کیفیت کو نوٹ کر رہی تھی۔

"وہ امی ابا پوچھ رہے تھے کہ سلامی کے پیسے تمہارے پاس ہی ہیں ناں۔ دراصل"

اس کی بات درمیان میں ہی رہ گئی تھی۔ اماں کھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ عمر کا رنگ اڑ گیا تھا۔

www.pklibrary.com

''آئیں بیٹھیں۔'' عمارہ مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی تھی۔

''بیٹھو...... بیٹھو۔'' ابا نے اسے وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

چند ادھر، ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ اپنے اصل مدعا پہ آ گئے تھے۔

''وہ سلامی کے پیسے تھے ناں دلہن! وہ ہم بھی بھول گئے تم سے لینا اور تم بھی بھول گئیں دینا۔ خیر سے اب جنہوں نے تمہیں سلامی دی ہے ان کے بچوں کی بھی شادیاں ہونی ہیں کل کو تو وہ ہمیں ہی لوٹانے ہیں ناں۔'' اماں نے عقابی نظروں سے اس کو دیکھتے ہوئے بیٹھے جملے میں کہا تھا۔

عمارہ پہلے تو حیران ہوئی پھر سنجیدہ۔

''لیکن وہ پیسے تو میری اماں نے لے لیے جاتے ساتھ ہی پہلے ہی کہا ہوا تھا اماں نے۔''

عمر دم سادھ کے بیٹھ گیا تھا۔ اور اماں ابا تو آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہے تھے۔

''لیکن ہمارے ہاں تو رواج ہے کہ بہو ساری سلامی ساس کو دیتی ہے۔'' اماں نے غصے کو دبانے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہیں۔

عمارہ مسکرائی تھی۔

''اماں! ہمارے ہاں یہ رواج نہیں ہے۔ میری بھابھی سے بھی میری اماں نے نہیں لیے تھے پیسے اور عمر نے تھوڑی میری اماں کو پیسے دیے تھے سلامی کے۔''

عمر نے تھوک نگلا تھا۔

''ارے عمر کیوں دیتا اپنی سلامی کے پیسے تمہاری اماں کو۔'' ابا بلبلا گئے تھے۔

بات تو ایک ہی ہوئی ناں ابا۔ ساس کو سلامی کے پیسے دینے کا رواج ہے ناں آپ کے یہاں۔'' عمارہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائی تھیں۔

''منہ مت کھلواؤ میرا بہو، سلامی کے نام پہ دیا کیا تھا میرے بیٹے کو تمہارے گھر والوں نے۔'' اماں نے جلبلا کے کہا تھا۔

''تو میری بہنوں نے دودھ پلائی کی رسم بھی تو نہیں کی تھی۔ جو دودھ پلائی کی رسم کر کے دس، بیس ہزار واپس ہتھیا لیتے ہیں وہ دیتے ہیں زیادہ سلامی نہ ہی اب میری بہنوں نے جوتا چھپائی کرنی ہے۔ یہ ہمارے گھر میں اچھی رسمیں نہیں سمجھی جاتیں کہ خواہ مخواہ رسموں کے نام پہ دولہا سے پیسے ہتھیائے جائیں یا سلامی کے نام پہ اتنے پیسے لٹائے جائیں۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔'' عمارہ کا اعتماد قابل دید تھا۔

کمرے میں خاموشی رقص کرنے لگی تھی۔ البتہ عمر کے وجود میں ڈھیروں ڈھیر سکون اتر آیا تھا۔ اس خاموشی کو دوبارہ عمارہ کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

''چار ہزار ہوئی تھی ادھر کی میری سلامی! اماں نے مجھی پہلے ہی کہا ہوا تھا کہ تمہارے لہنگے کا رینٹ تمہاری سلامی سے جائے گا۔ اب اگر آپ نہیں نہیں۔ آپ بھی تو سمجھ دار ہیں ناں۔ گھروں جیسے گھر ہوتے ہیں سب کے اور پھر رشتے وہ ہی خالص ہوتے ہیں جن میں احساس ہو۔''

''بالکل...... بالکل!'' عمر نے بے ساختہ کہا تھا۔ اماں، ابا ہونق سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''اب ہم نے سلوک، اتفاق قائم کر کے رہنا ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں دلوں میں رکھ کے ماحول کو کشیدہ نہیں کرنا۔ یہ ہی خالص رشتوں کی پہچان ہے۔'' عمارہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ان شاء اللہ!'' عمر نے کہا تھا۔

اماں، ابا لاجواب ہو کے ان شاء اللہ کہنے پہ مجبور ہو گئے تھے۔

☆☆

www.pklibrary.com

اُمِ اقصیٰ

شبِ ہجراں

بادل چاروں جانب سے گھر کر آئے تھے۔ ٹھنڈی میٹھی سی ہوا نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر آندھی کی صورت اختیار کی۔ گل مہر کسمسایا ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے اور احتجاجاً اپنے ڈھیروں سرخ پھول نیچے جھاڑے۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چڑیں ہنستی مسکرائی اور گل مہر کے احتجاج کو ذرا خاطر میں نہ لائی۔ ساون کا آغاز تھا۔

''لگتا ہے اس بار ساون خوب لگے گا......''

اپنی ہی سرگوشی پر چونکی...... ایسا کس نے کہا تھا بھلا...... چند پل سوچا...... ''شاید ابا نے کہا تھا بھی۔''

ایک ہاتھ سے فائلز تھامے دوسرے سے کرسی کے سرے کو پکڑ کر گھسیٹتی وہ اندر کی جانب بڑھی۔

لکڑی کے دروازے پر ہلکی سی دستک کی آواز ابھری۔ اس نے مکمل نظر انداز کیا۔ آندھی زور پکڑ رہی تھی اور آندھی میں یونہی وہم لگتے جیسے کسی نے پکارا ہو، سرگوشی کی ہو۔ سیٹی بجا کے بلایا ہو۔ دروازہ بجایا ہو...... کرسی اور فائلز اندر رکھ کر وہ پھر سے باہر آ کر ایک نظر دیکھ رہی تھی۔ اس دفعہ دستک قدرے زور سے کی گئی تھی اور واضح بھی۔ وہ اس دستک کی آواز پہچانتی تھی۔ ایک بار پہلے بھی ایسے ہی دستک کی گئی تھی۔ چند فٹ کا صحن عبور کر کے وہ دروازے تک آئی اور کنڈی کھولی۔ مقابل کو وہ جانتی تھی وہ ایک بار پہلے بھی آئی تھی۔

''خیر سے آئی ہو؟'' اس نے بنا تاثر چہرے سے پوچھا۔

''خیرات لینے آئی ہوں......'' مقابل نے جھولی پھیلائی۔ اس نے بغور دیکھا اسے یاد پڑا پہلی بار اس نے ہاتھ پھیلائے تھے۔ اس کی سماعتوں نے سنا، اس بار اس کا سوال بھی بدلا ہوا تھا۔

☆☆☆

ڈھیلے قدم اور پختہ عزم لیے وہ غلام فاطمہ کے کمرے میں آئی تھی۔ غلام فاطمہ کو لوگ بطور اس کی سوتیلی ماں جانتے تھے۔ وہ اس کی سوتیلی ماں ہی تھی مگر اس کا رویہ سوتیلا تھا یا نہیں اس کے بارے میں شاہ نور کچھ کہہ نہیں سکتی تھی کیونکہ اس نے سگی ماں دیکھی ہی نہ تھی۔ وہ اس کی پیدائش کے دو ماہ بعد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے ابا کو فوت ہوئے سات ماہ ہو گئے تھے۔ بہت یاد کرنے پہ بھی شاہ نور اس کا تلخ لہجہ اور برا رویہ یاد نہ کر سکتی تھی۔ وہ شاہ نور کو نرم آنکھوں سے دیکھتی اور دھیمے لہجے میں جواب دیتی تھی۔ جہاں یک بات اپنانے کی تھی تو وہ تو شاہ نور خود کو نہ اپنا پائی تھی۔ اک تکلف کا رشتہ حائل ہی رہا تھا اس کے اور اپنے بیچ بھی، اور لوگوں اور اس کے بیچ بھی۔ اسے یاد تھا قریب تین چار سال پہلے غلام فاطمہ کی بہن نے انہیں کہا تھا۔

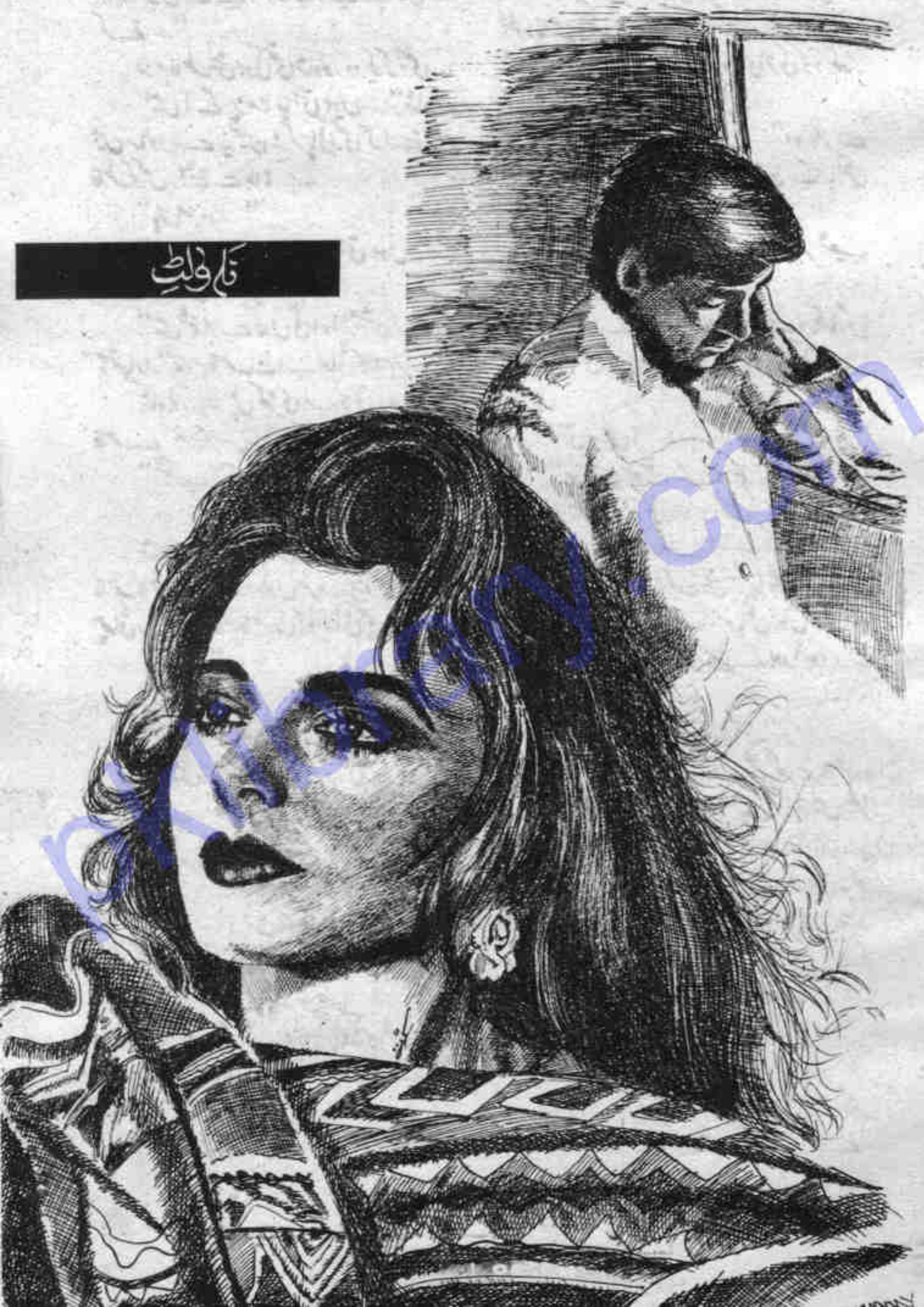
''یہ شاہ نور کا دھیان رکھنا آپا۔''

اور غلام فاطمہ نے کہا تھا۔ ''جس کے پیچھے قسمت پڑی ہو اس کے پیچھے میں کیوں پڑوں زینب...... ہر کوئی اپنا نصیب بھگتتا ہے...... شاہ نور بالکل بے ضرر سی ہے، کبھی کبھی تو بہت پیار آتا ہے اس پر......''

''بس بس آپا...... اپنا پیار اپنے سگے بچوں نور

www.pklibrary.com

ناولٹ



www.pklibrary.com

حرا اور محمد علی کے لیے رکھو۔ یہ سوتیلے بچے نہیں قدر کرتے......"

غلام فاطمہ لیٹی ہوئی تھی شاہ نور کو دیکھ کر بیٹھی۔

"میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں......" شاہ نور بیس سالوں سے یہ تعین نہ کر پائی تھی کہ اسے غلام فاطمہ کو کس رشتے سے بلانا ہے۔

"ہاں ضرور......"

"میں لاہور جا کر پڑھنا چاہتی ہوں۔" شاہ نور نے یونیورسٹی کا نام لیا۔

"میں شہزاد سے کہوں گی وہ ایڈمیشن کروا دے گا تمہارا۔" غلام فاطمہ نے اپنے بھائی کا نام لیا۔

شاہ نور چند پل کھڑی لب کاٹتی رہی۔ غلام فاطمہ نے منتظر نگاہوں سے دیکھا۔

"شکریہ۔" آہستہ سے کہہ کر وہ واپس مڑی۔

☆☆☆

شاہ نور کا یونیورسٹی میں دوسرا دن تھا جب غلام فاطمہ کا فون آیا تھا۔ دونوں طرف چند پل خاموشی چھائی رہی۔ پھر غلام فاطمہ کی آواز آئی تھی۔

"ٹھیک ہو"

"جی......"

"کوئی مسئلہ تو نہیں۔" شاہ نور کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ مسئلہ تو وہ خود تھی۔

"نہیں......"

"کوئی پریشانی ہو تو بتانا......" غلام فاطمہ نے کہا تھا......

"جی"......اور فون بند ہو گیا۔ جتنی کوشش غلام فاطمہ کرتی تھی اتنی ہی شاہ نور بھی کر لیتی تو تکلف کی دیوار گر سکتی تھی۔

یونیورسٹی کے تیسرے دن پروفیسر شعیب نے اسے اپنے آفس میں بلوایا تھا۔ یونیورسٹی کے متعلق چند ایک بنیادی باتیں سمجھائی تھیں۔

"کوئی مسئلہ تو نہیں؟"

"سیاہ چادر کے ہالے میں اس کا چہرہ دائیں بائیں ہلا......"

"شہزاد میرا بہترین دوست ہے۔ اس نے بطور خاص تاکید کی ہے آپ کا خیال رکھنے کو......" سر شعیب نے اس جھکے سر والی کنفیوز سی لڑکی کو دیکھا۔ تب ہی ان کے موبائل پہ کال آئی۔

"آپ، ایزی ہو کر بیٹھیں......" وہ پھر سے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ کاؤچ کے بالکل کنارے پہ ٹکی ہوئی تھی۔

"اور کوئی پریشانی تو نہیں......؟" سر شعیب نے پھر سے پوچھا۔

شاہ نور نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا گویا جانچ رہی تھی کہ ان کو مسئلہ بتایا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔

"جی بولیں؟"

"سر! میں ہوسٹل میں دو روز سے سو نہیں پائی مجھے روم شیئر کرنے کی عادت نہیں......تو کوئی چھوٹا سا گھر اگر رینٹ پہ مل جائے؟"

"گھر تو بیٹا، ڈیلر سے مل کر پتا چل سکتا۔ ہاں روم کا بندوبست ہو سکتا ہے۔" موبائل نکال کر انہوں نے نمبر ڈائل کیا۔ دو منٹ کی کال کے بعد انہوں نے ایک اور نمبر نکالا۔

"داؤد! میرے آفس میں آؤ۔"

"روم کا بندوبست ہو جائے گا۔ گھر میرا مشورہ ہے ابھی رہنے دیں، چند ماہ یہاں گزاریں پھر دیکھیے گا، گھر میں سو طرح کے مسائل ہوتے ہیں۔ یہ میں نے بلوایا ہے۔ کسی کو، جا کر چیک کر لیں۔ یہ ایک عورت کا گھر ہے جس نے دو تین کمرے رینٹ پہ دیے ہوئے ہیں، قابل بھروسا ہے۔ اگر آپ کو پسند آتا ہے تو بے شک آج ہی شفٹ ہو جانا۔" تب ہی نوارد اندر آیا۔

"جی سر......"

داؤد! یہ میری گاڑی کی چابی لے لو۔ انہیں چڑیا ہاؤس لے جاؤ اگر انہیں گھر پسند آتا ہے تو سامان بھی شفٹ کروا دینا...... یہ آج کا آپ کا ٹاسک ہے......" سر شعیب نے چابی دیتے ہوئے

www.pklibrary.com

تاکید کی۔

"جی..... آیئے....." وہ چابی پکڑ کے باہر نکلا.....

گاڑی کا لاک کھولتے اس نے کن انکھیوں سے پیچھے آتی لڑکی کی جانب دیکھا۔ سیاہ بڑی سی چادر جو ماتھے سے قدرے آگے کو کی ہوئی تھی، سفید ہلکا کلف لگا کاٹن کا سوٹ جس پہ شاید شیشے لگے ہوئے تھے کیونکہ سورج کی روشنی میں وہ منعکس ہوئے تھے۔ سیاہ فلیٹ سینڈل۔ کن انکھیوں سے بھی اس نے باریک بینی سے جائزہ لے لیا تھا۔ بس نہیں دیکھ پایا تھا تو چہرے کے تاثرات..... نپے تلے قدموں سے وہ گاڑی تک آئی تھی۔ داؤد کے گاڑی اسٹارٹ کرنے تک وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ چکی تھی۔

"میں داؤد اسماعیل ہوں اور آپ؟" سڑک پہ آ کر بیک ویو مرر سیٹ کرتے اس نے پوچھا تھا۔

"شاہ نور....." باہر دوڑتے مناظر پہ نگاہ ٹکاتے وہ لاپروائی سے بولی۔

"شانو! کہاں سے ہیں آپ؟"

الہ آباد.....شاہ نور نے نام بگاڑنے پہ ناگواری سے اسے دیکھا.....

"یہ الہ آباد تو انڈیا میں نہیں ہے! مطالعہ پاکستان میں پڑھا تھا۔" شاہ نور کے چپ رہنے پہ داؤد نے وضاحت دی.....

شاہ نور خاموشی سے باہر رش کو دیکھتی رہی۔ پتا نہیں یہاں دل بھی لگ پائے یا نہیں؟ یہ داؤد پتا نہیں کون ہے اور سر کا کیا لگتا ہے؟ سوچوں کا محور فرنٹ سیٹ کا وجود ہوا۔ نظر بیک ویو مرر پر پڑی وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا..... پرل گرے کلر کی گہری سی آنکھیں.....کیا مردوں کی آنکھیں ایسی گہری ہوتی ہیں؟ شاہ نور نے نگاہ ہٹائی.....اس نے کبھی کسی مرد کی ایسی گہری آنکھیں نہیں دیکھی تھیں۔ بلکہ اس نے تو کسی مرد کی آنکھیں ہی نہیں دیکھی تھیں۔ اب تک سے تو وہ نگاہیں جھکا کر بات کرتی تھی۔ ہاں مگر ایک بار.....اسے وہ بڑی بڑی عجیب اور گدلی نگاہیں یاد آئیں..... بے ساختہ شاہ نور نے جھرجھری لی۔ اور فرنٹ سیٹ والے نے اے سی بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر بعد داؤد نے ٹف ٹائل لگی کشادہ سی گلی میں گاڑی روکی۔ ہلکے رنگ کے گیٹ کے ساتھ نیم پلیٹ پر "چڑیا ہاؤس" لکھا تھا۔ داؤد نے گاڑی سے نکل کر بیل بجائی تھی وہ بھی باہر نکل آئی۔ نیم پلیٹ پر چڑیا ہاؤس کے نیچے بھی کچھ لکھا تھا وہ قدرے آگے ہو کر بغور پڑھنے لگی۔

"ہنستا بستا رہے یہ انگنا..... چڑیاں اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ جائیں گی۔"

درمیانی سی عمر کی ایک عورت نے دروازہ کھولا تھا۔

"آئیں....." داؤد نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

"راشدہ آنٹی! یہ شانو ہیں اور انہیں سالم کمرا چاہیے۔ وہ بے تکلفی سے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھا۔

راشدہ آنٹی نے سرتاپا اسے دیکھا۔ "پہلے کچھ ٹھنڈا گرم لو گی یا کمرا دکھاؤں.....!"

"گرمی میں تو آئے ہیں آنٹی کچھ ٹھنڈا پلا دیں۔ آؤ شانو، بیٹھو پھر کمرا دیکھتے ہیں۔" داؤد بے تکلفی سے بولا۔

راشدہ آنٹی کولڈ ڈرنک لے آئی تھیں۔ داؤد نے گلاس اٹھایا اور موبائل میں مصروف ہوا۔

"میں بیوہ عورت ہوں، ایک بیٹا ہے میرا جو امریکا میں پڑھتا ہے۔ اس کے اور اپنے خرچ پورے کرنے کے لیے یہ گھر میں لڑکیوں کو رینٹ پر دیتی ہوں۔ دو چار بھروسے کے لوگ ہیں جو لڑکیوں کو میرا پتا بتا دیتے ہیں۔ چھان بین مجھ سے ہوتی نہیں سو وہ محنتی اور ذہین لڑکیوں کو ہی بھیجتے ہیں جن کا فوکس تعلیم اور کیریئر ہوتا ہے۔ کھانا پکانا مکمل لڑکیوں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ ایک کام والی آتی ہے صفائی کے لیے چاہو تو اس سے کپڑے دھلوالو۔ باقی آنے جانے کے اوقات پہ میں نظر نہیں رکھتی لیکن رات گئے کی اجازت نہیں۔ شام تک بہرحال سب کو

www.pklibrary.com

موجود ہونا چاہیے گھر......"

شاہ نور کے کولڈ ڈرنک ختم کرنے تک آنٹی راشدہ نے ساری تفصیل بتادی تھی۔

"یہ ایک میرا بیڈ روم ہے۔ یہ کمرا خالی ہے، آپ دیکھ لو۔ دو کمرے اور کچن اوپر ہے مگر وہ فل ہیں۔ چھ لڑکیاں اوپر ہوتی ہیں۔ امتحانات کے دنوں آٹھ دس بھی ہو جاتی ہیں۔ نیچے میں دو سے زیادہ نہیں رکھتی۔ کچن چاہیں تو میرے ساتھ شیئر کر لیں ورنہ اپنا الگ بندوبست کر لیں۔

لاؤنج میں سے ایک بڑا سا سلائیڈنگ ڈور آدھا کھلا تھا۔

"یہ بھی روم ہے؟" شاہ نور اس طرف آئی۔ "یہ ڈرائنگ روم ہے۔" راشدہ آنٹی نے آگے بڑھ کر پورا دروازہ کھولا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا جس کا ایک دروازہ گیراج میں کھلتا تھا۔ بیرونی طرف بڑی سی ونڈو تھی۔ اور ونڈو کی دوسری طرف چھوٹا سا لان......

مجھے یہ والا کمرا چاہیے......" ونڈو بند کرتی وہ راشدہ آنٹی کی طرف مڑی۔

"چلیں...... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں......" راشدہ آنٹی رضامند نظر آئیں۔

"میں بیڈ ادھر سیٹ کروا دیتی ہوں...... کب تک آنے کا ارادہ ہے؟"

"آج...... بلکہ ابھی سے......" وہ باقی کے معاملات طے کر کے باہر لاؤنج میں آئی۔

"ہاسٹل سے میرا سامان لے کر آنا ہے۔" لاؤنج میں صوفے کے کنارے کھڑی وہ کہہ رہی تھی۔ داؤد مصروف نظر آیا۔

"سنیں......" شاہ نور نے پھر سے پکارا۔ مگر دوسری طرف ہنوز خاموشی تھی۔ شاہ نور نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی۔ کس طریقے اسے متوجہ کیا جا سکتا ہو؟ وہ گھوم کر سامنے آ کھڑی ہوئی۔ داؤد کی نگاہ اس کے ملائم سفید پیروں پر پڑی جو سیاہ چپل میں اضطرابی انداز سے ہلتے تھے۔ پیروں سے نگاہ چہرے تک گئی

کتابی چہرے کی رنگت یوں تھی گویا کسی نے خالص دودھ میں چند قطرے جام شیریں ڈالا ہو۔ بڑی بڑی آنکھوں کی سرمئی رنگت میں خفگی نمایاں تھی۔

"ہاسٹل سے میرا سامان لانا ہے۔"

"حاضر جناب......" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"سامان تھا ہی کیا۔ ایک بڑا سوٹ کیس اور ایک بیگ پیک۔"

"کچھ کھانا ہے؟" وہ فوڈ کارنر سے گزر رہے تھے جب داؤد نے پوچھا۔

"نہیں......" نفی کے ساتھ سر بھی ہلا تھا۔ اگر جو داؤد اس طرف متوجہ نہ ہوتا تو بھی اس کا جواب نہ جان پاتا۔

"آئس کریم کھائیں گی؟" کچھ آگے جا کر داؤد نے پھر سے پوچھا۔

"مجھے کچھ بھی نہیں کھانا......" شاہ نور قدرے رکھائی سے بولی تھی۔

"ہم لاہوریوں کو غلط ثابت مت کریں......" وہ گاڑی روک کے کارنیٹو لے آیا تھا۔ شاہ نور کون ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی وہ پھر سے گاڑی چلاتے گاہے گاہے اس پر نظر ڈال لیتا۔

"ہم لاہوری بہت مہمان نواز ہوتے ہیں جو کھانا چاہے اسے سیر ہو کر اور بیسٹ فوڈ پوائنٹ سے کھلاتے ہیں اور جو نہ کھانا چاہے اسے بھی کچھ نہ کچھ کھلا ہی دیتے ہیں۔ ویسے آپ کا یہاں لاہور میں کوئی رہتا ہے؟"

شاہ نور نے نفی میں سر ہلایا۔ داؤد نے چڑیا ہاؤس میں اس کا سامان اندر رکھ دیا تھا۔

"شکریہ کہہ کر شرمندہ مت کریں یہ تو میرا فرض تھا" جاتے جاتے وہ پلٹا تھا۔ کوشش اس کو شرمندہ کرنا تھا۔

شاہ نور نے ناگواری سے دیکھ کر لب بھینچے...... چندیل اس کی طرف دیکھ کر داؤد نے کسی بھی جواب کا انتظار کیا۔

"موسٹ ویلکم...... اپنا نمبر تو دیں گی نہیں آپ

www.pklibrary.com

یہ میرا رکھیے...... کوئی بھی کام ضرورت ہو تو کہہ دیجیے گا۔ میں بغیر شکریہ بھی لوگوں کے کام کر دیتا ہوں......" نمبر پکڑا کر وہ باہر نکل گیا۔

☆☆☆

کلاس میں سب سے پیچھے بیٹھے اس نے بیزاری سے ایک نظر سب کا جائزہ لیا۔ سر پرویز کے لیکچر کا اختتام ہو چکا تھا۔ کسی اسٹوڈنٹ کی بات پر وہ مسکرا رہے تھے پھر ایک دم پوری کلاس ہنس دی......

لوگ اتنا خوش کیسے رہ لیتے ہیں؟ شاہ نور نے سب کے ہنستے چہرے دیکھ کر سوچا۔ آخر جینے کی وجہ سانس پورے کرنے کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتی ہے جو اتنا ہنسا جائے۔

سر پرویز کلاس سے نکل گئے تھے باقی اسٹوڈنٹس بھی نکل گئے تھے بیک کندھے پہ لٹکائے شاہ نور بھی باہر آئی۔

"مسکرانے اور خوش ہونے کے لیے ذاتی وجہ کا ہونا ضروری نہیں۔ انسان کسی دوسرے کی خوشی میں بھی خوش ہو سکتا ہے......" آواز کے تعاقب میں شاہ نور نے مڑ کر دیکھا۔ داؤد قدم بڑھاتا اس کے ہم قدم ہوا۔

"اتنی بیزار شکل بنا کر آپ لاہور میں تو نہیں رہ سکیں گی شانو۔"

"لاہور ہے کوئی مریخ نہیں......" شاہ نور تڑخ کر بولی۔ وہ اس کی لاہور لاہور کی رٹ سے اچھا خاصا اکتا چکی تھی۔

"یہی تو! لاہور ہے مریخ نہیں کہ اتنی بور شکل بنائی جائے۔" داؤد نے ایک ہاتھ پہ دوسرے الٹے ہاتھ کی تالی بجاتے انتہائی پتے کی بات بتائی۔

شاہ نور کا ارادہ تو کینٹین جانے کا تھا مگر داؤد کی وجہ سے قدم گیٹ کی طرف موڑ لیے۔

"خدا حافظ......" شاہ نور نے اس کی آواز سنی تھی مگر جواب میں کچھ کہنا یا مڑ کر دیکھنا گوارا نہ کیا تھا۔

گھر آئی تو راشدہ آنٹی گھر پہ نہیں تھیں۔ فریج لاکڈ تھا۔ کھانا تو کیا ہی ملتا پینے کو ٹھنڈا پانی تک نہ تھا۔ اوپر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ نہ کوئی خاص جان پہچان تھی اور کیا اچھا لگتا وہ اوپر جا کر کچھ کھانے کو یا پینے کو مانگتی سو خاموشی سے غصہ گرمی کھا کے لیٹ رہی۔

کچھ ہی دیر بعد ڈور بیل ہوئی اور پھر وقفے وقفے سے ہوتی رہی۔ شاہ نور کو ہی جانا پڑتا تھا اور تو کوئی نیچے تھا نہیں۔ باہر آرڈر آیا ہوا تھا اس کے نام کا۔

"لیکن میں نے تو آرڈر نہیں کیا۔" وہ ریسیو کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

"میم شاہ نور کا ہی آرڈر ہے، پیمنٹ ہو چکی ہے۔"

"پیمنٹ کس نے کی ہے؟"

"میں نہیں جانتا میم......" ڈیلیوری بوائے جا چکا تھا۔

شاید راشدہ آنٹی نے کیا ہو میرے لیے...... وہ جنک فوڈ کی شوقین نہیں تھی۔ مگر اس وقت بھوک اتنی شدید تھی کہ سب اچھا لگ رہا تھا۔

تھوڑی بھوک مٹی تو دماغ نے کام کیا۔ راشدہ آنٹی اتنی ہی اچھی ہوتیں تو فریج کو کیوں تالا لگائیں باقی داؤد ہی بچتا تھا جو اس کے حال سے بھی واقف تھا اور ایڈریس سے بھی۔

اگلے دن وہ یونیورسٹی میں لاشعوری طور پر اس کی منتظر رہی تھی مگر وہ نہیں تھا۔ کینٹین سے ہی کھا پی لیا تھا۔ وہ گیٹ سے باہر نکل رہی تھی جب داؤد اسے نظر آیا تھا اور نظر پڑتے ہی وہ چلا آیا تھا۔

"کل پزا وغیرہ آپ نے بھجوایا تھا۔" شاہ نور اس کے پاس آنے پہ بولی تھی۔

"وعلیکم السلام...... میں بالکل ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟" داؤد انتہائی خندہ پیشانی سے سینے پہ ہاتھ رکھے جھک کر کہہ رہا تھا۔

"کل آرڈر آپ نے کیا تھا؟"

"کیوں آپ نے شکریہ ادا کرنا ہے؟"

www.pklibrary.com

شاہ نور نے انتہائی کوفت سے اسے دیکھا۔
"لاہور رہتا ہے تو لاہوریوں کے آداب بھی سیکھنا ہوں گے چھوٹے شہر کی لڑکی......"
"لاہور ہے مریخ نہیں، ہر بات کام سیکھنا پڑے......" شاہ نور بول پڑی اور بول کے پچھتائی، یہ بات وہ پہلے بھی اسے کہہ چکی تھی۔
"یہی تو لاہور ہے قدم قدم پہ لوگ ملیں گے انہیں السلام علیکم، مزاج بخیر شکریہ کہنا ہوگا...... مریخ پہ نہ کوئی دوسرا انسان چاہیے ہوگا نہ آداب ہوں گے......"
"میں چوری چھپے کاموں کا شکریہ ادا نہیں کرتی......" شاہ نور تڑخ کے بولی۔
"چوری چھپے......" داؤد نے مسکرا کر دونوں الفاظ چبا کر کہے اور اس تشدد کا گویا خود ہی مزا لیا "ایک دن میں ایک لڑکی کو...... ایک چھوٹے شہر کی لڑکی کو......" داؤد نے پہلے صحیح کرنا ضروری سمجھا۔ "چڑیا ہاؤس دکھا کے لایا چوری چھپے۔ پھر ہاسٹل سے اس کا سوٹ کیس جس میں زندگی بھر کے سوٹ بھرے تھے، اٹھا کے گاڑی میں رکھ کر چڑیا ہاؤس لایا وہ بھی چوری چھپے...... ہوں ں ں یہ سارا۔ کچھ چوری چھپے تھا تب ہی اس نے میرا شکریہ ادا نہیں کیا۔"
"میں نے نہیں کہا تھا کرنے کو......" شاہ نور کو اس کے جتانے پہ غصہ آیا۔
"ہاں سر شعیب نے کہا تھا۔ شکریہ بھی انہی کا بنتا تھا۔ آئی ایم سو سوری داؤد۔" اسماعیل نے افسوس کا اظہار کیا۔
شاہ نور خاموشی سے پوائنٹ کی جانب آئی۔
"کل میری وجہ سے آپ کینٹین سے سمو سے کے اوپر دہی پکوڑیاں ڈال کے نہیں کھا سکی تھیں، میں نے اس لیے پڑا کولڈ ڈرنک بھجوائی۔ یونو۔ آداب ...... لاہوریے......" وہ کہہ کر مڑ گیا تھا۔
شاہ نور نے کلس کے دیکھا۔

☆☆☆

راشدہ آنٹی اچھی خاصی سوشل خاتون تھیں۔
گھر پر کم ہی نظر آتیں۔ گھر پر کم ہوتیں تو ظاہر ہے فریج بھی زیادہ تر لاکڈ ہوتا۔ کچن کے کیبنٹ بھی لاکڈ ہوتے۔ وہ تو شاہ نور نے ان سے اپنا ایک کیبنٹ لے لیا تھا جس میں ضرورت کی اشیاء وہ رکھ لیتی۔ فریج کے بغیر گزارہ ممکن نہ تھا اور کافی دنوں سے وہ اس چیز کو نظر انداز کر رہی تھی۔ اور پھر ہمت کے جواب دیتے ہی شاہ نور نے چند ایک آن لائن اسٹور وزٹ کیے مگر کچھ سمجھ میں بھی نہ آیا۔ جا کر لانا بیسٹ تھا مگر جائے کس کے ساتھ......؟ ایک ہی نام ذہن میں آیا تھا مگر اس کے پہلے ہی کافی احسان تھے...... چلو جہاں پہلے کافی تھے ایک اور سہی۔ داؤد کا نمبر اس نے بیگ پیک کی پاکٹ میں گھسیڑا تھا اور کچھ کوشش کے بعد مل بھی گیا۔ چند ایک لمحے شش و پنج میں گزارنے کے بعد اس نے نمبر ڈائل کر ہی دیا۔
"السلام علیکم۔ شاہ نور بات کر رہی ہوں۔"
"وعلیکم السلام۔" داؤد نے لہجے کو خوش گوار کیا۔
"آپ کے پاس اگر فرصت ہو تو مارکیٹ تک جانا تھا......" شاہ نور کو کہنے میں ہمت کم لگی تو آنکھیں میچ کر تیزی سے بولی۔
"مارکیٹ تک جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی چھوٹے شہر کی لڑکی کو؟"
"روم فریج لینا ہے...... بڑے شہر والے میرے کھانے پینے پہ بہت نظر رکھتے ہیں سو میں گھر میں فریج سے خاموشی سے کھا پی لینا چاہتی ہوں۔"
جواباً داؤد کا قہقہہ خاصا جان دار تھا۔
"بولنا سیکھ گئی ہو۔ ٹارگٹ ہنستا سکھانا ہے۔"
میں شام کو فارغ ہوں، ریڈی رہنا......"
اور سہ پہر ڈھلتے ہی وہ موجود تھا۔ آج بھی وہ سر شعیب کی گاڑی لایا ہوا تھا۔
"سر شعیب آپ کے کیا لگتے ہیں؟"
"خالو...... داؤد کا سارا دھیان ڈرائیونگ کی جانب مرکوز تھا۔
"آپ آج یونیورسٹی نہیں آئے تھے؟"

www.pklibrary.com

"آپ نے انتظار کیا۔"

شاہ نور نے دیکھا اس کے لبوں کنارے مسکراہٹ سمٹی ہوئی تھی۔ شاہ نور نے خاموش رہنے کی ٹھانی۔

"میں یونیورسٹی نہیں جاتا۔ میرے ایم فل کے تھیسز کا کچھ کام تھا سو پچھلے چند دنوں جاتا رہا ہوں۔"

"تو کیا کرتے ہیں آپ؟"

"میں ایک یونیورسٹی میں تین دن تین لیکچر دیتا ہوں اور پارٹ ٹائم ایک کمپنی میں جاب......" شاہ نور خاموش رہی۔

"ہو گیا میرا انٹرویو؟" شاہ نور کے کافی دیر خاموش رہنے پہ داؤد نے پوچھا۔

میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی زیادہ تر فارغ ہی دیکھا میں نے آپ کو......"

شاہ نور کی بات پر وہ مسکرا دیا۔

"کس کمپنی کا جاب ہے آپ کو؟" داؤد نے تین چار مشہور کمپنیوں کے نام لیے؟"

"بس جہاں پہ رش نہ ہو؟......" شاہ نور نے بے زاری شکل بنائی۔

"پہلے لاہور میں رش نہیں ہوتا تھا...... پھر یہاں یونیورسٹیز میں جو بھی پڑھنے آتا یہیں سیٹل ہو جاتا، یہیں فیملی بناتا...... اب اسی لیے یہاں ہر جگہ بہت رش ہوتا ہے۔"

شاہ نور نے چہرہ موڑ کر دیکھا آیا وہ مذاق کر رہا ہے یا سیریس ہے مگر وہ کچھ جانچ نہ پائی۔

"شہر کسی کی جاگیر نہیں ہوتے نہ شہروں پہ اترانا بنتا ہے......"

"آپ تو غصہ ہی کر گئیں چھوٹے شہر کی لڑکی......" داؤد نے گاڑی پارکنگ ایریا میں کھڑی کی۔ دونوں باہر نکل آئے۔

ایک تو ضرورت کافی تھی دوسرا ضرورت کی ہی چیز تھی سو جو پہلی شاہ نور کو مناسب لگی ہاں بول دیا پہنچانے کی ذمہ داری اسٹور کی ہی تھی سو وہ پے منٹ کر کے آ گئے۔

"اور کچھ؟" داؤد نے پوچھا تھا۔

"نہیں" شاہ نور نے سر ہلایا۔

چڑیا ہاؤس کے سامنے داؤد نے اسے اتارا تھا۔ اترنے سے چند لمحے پہلے وہ لب کاٹتی رہی نجانے داؤد کو شکریہ بولنا اسے اتنا کٹھن کیوں لگتا تھا......؟ خاموشی سے دروازہ کھول کر وہ اترنے والی تھی جب داؤد کی آواز آئی۔

"جی کچھ کہا؟ سوالیہ لہجے میں تبسم نمایاں تھا۔

اور وہ جو بھی شکریہ بولنے کی ہمت مجتمع ہوئی تھی اڑن چھو ہوئی۔

"شکریہ۔ کمرے میں آتے ہی اس نے ٹائپ کر کے سینڈ کیا تھا۔

"احسان مند ہیں آپ کے شکریے کے؟ داؤد کا فوری ریپلائی آیا تھا۔

☆☆☆

شاہ نور کا آج یونیورسٹی جانے کا بالکل بھی دل نہیں تھا مگر پھر بھی وہ چلی آئی تھی۔ بمشکل ایک گھنٹہ گزار کر وہ گیٹ سے نکل آئی تھی۔ کسی بھی سواری پہ بیٹھنے کا موڈ نہ ہوا تو وہ یونہی پیدل چلتی رہی یہی وہ لوگ تھے جن سے وہ ایک عرصہ خوف زدہ رہی۔ ان کو دیکھنے ان سے بولنے ان کا سامنا کرنے اور ان کو سننے سے بھی...... تیرہ سال اس نے کمرے میں زندگی گزار دی تھی...... اور اب وہ اکتا گئی تھی۔ ٹھیک ہے جو ہونا ہے اس کے ساتھ ہو جائے مگر وہ باہر نکلے گی۔ لوگوں میں رہے گی، لوگوں کو سنے گی اور ان لوگوں سے ہی وہ جینے کا ڈھنگ سیکھے گی۔ وہ مزید قید میں اب نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے لاہور آنے سے پہلے خود کو بہت بہادری کے اسباق پڑھائے تھے۔ ان میں سے اسے ایک آدھ کی ہی ضرورت پیش آئی تھی۔ ناسٹلجیا اور ڈپریشن کے دورے اسے اب بھی پڑ جاتے تھے۔ لیکن اب وہ شدت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ اتنے بھی برے نہیں ہوتے جتنا وہ سوچا کرتی تھی۔ اسے داؤد کا خیال آیا۔ لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ پھیل کر معدوم ہوئی۔ مقابل نے آتے اس نے

www.pklibrary.com

دلچسپی سے ملاحت اور مسکراہٹ کا منظر دیکھا اور بالکل سامنے آرکا۔

"میرے بارے میں سوچا جارہا ہے ناں؟" داؤد کے سوال میں سوال تو کہیں بھی نہ تھا یقین تھا اور وہ بھی پختہ......

"ایسے بھی شہزادہ گلفام نہیں آپ کہ ہر وقت آپ کو سوچا جائے......" شاہ نور تپ کر بولی تھی۔

"تم نے مجھے غور سے نہیں دیکھا ورنہ محبت ہو چکی ہوتی۔" داؤد نے پاکٹ میں ہاتھ ڈالے راستے میں آئے پتھر کو ٹھوکر سے اڑایا۔

شاہ نور نے چہرہ موڑ کر اسے غور سے دیکھنے کی سعی کی...... نظر پرل گرے کلر کی کشادہ اور چمک دار آنکھوں پہ ٹھہری، جھکی، رکی اور آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئی۔ اسے داؤد کے فقرے کی صداقت پہ یقین آنے کو تھا کہ اس نے رخ بدل کے پانسا پلٹا۔

"ویسے کہاں جا رہی ہو؟"

"گھر......"

"پیدل ہی؟"

"کیوں بڑے شہر میں پیدل چلنا ممنوع ہے؟"

"نہیں، ممنوع تو نہیں ہے مگر بس آپ گھر پہنچ نہیں پاتے......"

"میں چلی جاؤں گی......" شاہ نور نے اس سے جان چھڑانا چاہی......

"میں کب کہہ رہا نہیں جا سکتیں......" داؤد نے بے وجہ بات کو طول دینا چاہا۔

"ویسے اگر آپ مجھ سے راستہ پوچھیں تو......!"

"اوہ، نو پلیز......" شاہ نور نے انکار میں سر ہلایا، وہ لاہوریوں کے راستے جانے والی سب میمز سے واقف تھی۔

"چلیں نہیں بھی پوچھنا تو بتا دیتا ہوں۔ یہ دو گلیاں اگر آپ کراس کریں تو آگے مین روڈ ہے جو گھر کی طرف ہی جاتی ہے دائیں طرف......اور بائیں طرف تھوڑا سا ہی چلیں تو بڑا خوب صورت پارک ہے۔"

"اور آپ کو لگتا ہے میں آپ کے بتائے ہوئے رستے کی طرف سے جاؤں گی؟" شاہ نور پلٹی تھی اور خفگی سے اسے دیکھتے کہہ رہی تھی۔

"رہنمائی فرض تھا میرا......" داؤد نے کندھے اچکائے۔"

"آپ کا فرض پورا ہوا......اپنے اس بڑے سے شہر کو مجھے ایکسپلور کرنے دو......" شاہ نور کہہ کر تیز تیز چلنے لگی۔

"کتابی چہرے والی...... کتابیں غصہ نہیں کرتیں......" داؤد کی آواز پیچھے سے آئی۔

شاہ نور نے کافی آگے جا کر تسلی کی اور پھر گلی کی طرف مڑی۔ دو گلیاں کراس کر کے واقعی مین روڈ تھی آگے...... بائیں طرف جانے کا ارادہ ترک کر کے وہ اپنی گلی کی طرف مڑ گئی۔

دور کہیں سے چمکتی دو آنکھیں بے ساختہ مسکرائی تھیں۔

☆☆☆

"دل لگ گیا ہے؟" رات کو غلام فاطمہ کی کال آئی تھی۔

"دل لگانے نہیں آئی......" اس کی آواز بنا کسی تاثر کے تھی۔

غلام فاطمہ نے نوٹ کیا اس کے لہجے میں ہمیشہ والی تندی ترشی نہیں تھی۔ لہجہ نرم تھا مگر جواب ہمیشہ جیسا تلخ......

"دل لگائے بنا کوئی کام مکمل بھی تو نہیں ہو پاتا۔ خیر شہزاد بتا رہا تھا ہاسٹل میں دل نہیں لگا تمہارا، گھر رینٹ پہ لیا ہے......"

"جی......"

"شہزاد کا اوپر والا پورشن بھی خالی ہے اگر......"

"میں یہاں سیٹ ہوں......" شاہ نور نے ان کی بات کاٹی۔

چند پل دونوں طرف خاموشی چھائی رہی۔ پھر

www.pklibrary.com

خلافِ عادت شاہ نور بولی۔ "محمد علی اور نور حرا کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں، تمہیں یاد کرتے ہیں......" شاہ نور کو غلام فاطمہ کی بات پر بالکل بھی یقین نہ آیا۔

"تمہارے پیسے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیے تھے۔"

"جی...... میسج مل گیا تھا مجھے......"

"خدا حافظ......" غلام فاطمہ نے موبائل بند کر دیا تھا۔

شاہ نور چند پل موبائل کی ساکت اسکرین کو گھورتی رہی۔ انسان اپنے سے وابستہ رشتوں کو اتنی آسانی سے نظر انداز نہیں کر سکتا، بے شک ان کے ساتھ بنتی ہو، چاہے نہیں۔ شاہ نور کے حصے کی زمین اس کے والد اپنی زندگی میں ہی اس کے نام کر گئے زمین کے ٹھیکے کے پیسے اس کے اکاؤنٹ میں ہی آتے تھے۔ پیسے کے معاملے میں وہ کسی کی بھی محتاج نہیں تھی۔

اگلے دن ہفتہ تھا اور یونی سے آف بھی...... فجر کی ادائی کے بعد باوجود کوشش کے اسے نیند نہیں آئی تھی وہ ہمیشہ سے سحر خیز رہی تھی۔ تسبیح ہاتھ میں لیے وہ آہستگی سے گیٹ بند کرتی چڑیا ہاؤس سے باہر آئی۔ اس کا رخ بائیں جانب تھا۔ بیس پچیس قدم کے بعد ایک پتھریلی سی روش تھی اور اس کے اختتام پہ واقعی ایک پارک تھا چند ایک بزرگ واک کر رہے تھے، کچھ نوجوان ہینڈ فری کانوں میں ٹھونسے ٹریک پہ بھاگ رہے تھے...... گھاس کے اوپر ننگے پاؤں کھڑے شاہ نور نے چند ایک لمبے لمبے سانس لیے اور قریبی سنگی بنچ پہ بیٹھ گئی۔ صبح کا وقت بھی کیا پر لطف ہوتا ہے۔ ابھی چند منٹ ہی ہوئے تھے اسے بیٹھے ہوئے کہ کسی نے پھولے سانسوں کے ساتھ صبح بخیر کہا۔ وہ ایک دم سے گھومی۔ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے رکوع کے بل جھکا ہوا تھا داؤد۔

شاہ نور کے دیکھتے ہی سیدھا کھڑا ہوا۔ بلیو ٹریک سوٹ میں ماتھے پہ بکھرے بال وہ تیز تیز سانس لیتا تھا۔ جھک کے بوتل پکڑی، دو گھونٹ پانی پی کے وہ سنگی بنچ کے دوسرے کنارے ٹکا۔

"ویسے میری کہی باتوں پہ کافی بھروسا کرتی ہو تم......" بال دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے پیچھے کرتا وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔ "اب ہونے کو یہاں پارک بھی ہو سکتا تھا۔ قبرستان بھی...... لیکن تمہیں میرے کہے پہ بھروسا تھا کہ پارک ہی ہوگا ہے ناں؟"

"مجھے آلریڈی پتا تھا کہ یہاں ایک پارک ہے اور میں ایک دو بار آ ئی بھی تھی......" وہ لہجہ مضبوط بنا کر بولی تھی۔

"چلیں کہتی ہو تو مان لیتا ہوں......" داؤد کا انداز اسے بہلانے جیسا تھا۔ آنکھوں کی چمک چند پل کو بڑھی تھی۔

"ویسے تمہیں آلریڈی کیسے پتا ہوتا ہے؟ کیا کوئی جادو وغیرہ آتا ہے تمہیں؟"

"تمہیں سکھاؤں؟" وہ داؤد کی طرف گھومی دل نے بالآخر اس شخص پہ اعتبار کر ہی لیا تھا۔

"ہاں سکھاؤ۔" داؤد رضامند نظر آیا۔

"تین لمبے لمبے سانس لے کر خود کو فریش اور ایکٹیو کریں۔"

"اوکے......"

"اب ذہن دل دماغ کو حاضر کریں۔ آنکھیں بند کریں۔ آپ یہاں اس وقت اس پارک میں موجود ہیں، اس منظر کو اپنے اندر لاک کریں۔"

"لاک کیسے؟" داؤد نے ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھا۔

"بس گہرائی سے محسوس کریں...... دل سے...... ذہن سے فوکس کریں۔"

"اوکے ہو گیا۔"

"بس یہ لمحے قید ہو گئے ہیں۔ اب بس یاد رکھیے گا کہ آپ نے اپنے اندر کچھ لمحے قید کیے ہوئے ہیں دوبارہ پھر کبھی یہ لمحے یاد آئیں آپ آنکھیں بند کریں گے تو آپ خود کو یہاں اسی پل میں محسوس

www.pklibrary.com

کریں گے۔

"ارے واہ! جادوگرنی، اب تو میں اپنے سارے خوشی کے لمحے قید کیا کروں گا۔"

"خوشی کے پل تو ویسے بھی یاد رہتے ہیں۔ انہیں قید کرنے کی کیا ضرورت؟"

"ارے ہاں واقعی...... تو پھر کیا غم کے لمحے؟"

"غم کے لمحے تو اندر راز خود ٹھہر جاتے ہیں ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔" شاہ نور گزرے کسی پل سے گزری۔

"تو پھر اس جادو کا کیا فائدہ؟" داؤد کو مایوسی ہوئی۔

"آپ موجودگی قید کر سکتے ہیں۔ اپنی اور اپنے کسی کے ساتھ ہونے کی، موسم کی، وقت کی، حالات کی۔"

"تم تو بڑے کمال کی نکلیں چھوٹے شہر کی لڑکی......" داؤد متاثر نظر آیا حالانکہ وہ ہو چکا تھا۔ "آؤ تمہیں ناشتا کروا کر لاتا ہوں۔"

"نہیں میں بنا لوں گی خود ہی......" شاہ نور متامل ہوئی۔

"یہ پاس ہی ایک فوڈ کارنر ہے۔ ناشتے سے ڈنر، سب ملتا ہے۔ آؤ دکھا بھی لاؤں حالانکہ آپ کو سب آلریڈی پتا ہوتا......" داؤد اٹھا تو شاہ نور بھی ساتھ چل دی۔

☆☆☆

سمسٹر بریک میں سب ہی ہاسٹلز یونی خالی تھی۔ شاہ نور ابھی تک چڑیا ہاؤس میں ہی تھی۔ غلام فاطمہ نے تو کال کر کے آنے کی تاکید کی تھی۔ "مگر وہاں سب کی نظریں......" شاہ نور نے پارک کے بینچ پہ بیٹھے جھرجھری لی۔

"السلام علیکم......" داؤد جوس کے کین لیے آیا۔

"وعلیکم السلام......" "آپ کو کیسے پتا میں یہاں ہوں؟" شاہ نور نے اس کے ہاتھ سے کین پکڑتے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے کسی نے تھوڑا سا جادو سکھایا تھا پچھلے دنوں، میں بہت سارا سیکھ گیا ہوں۔" داؤد مسکرا کر بتاتے بینچ کے دوسرے کنارے ٹکا۔

"اب یہ بات آپ کے ہاتھ لگ گئی ہے؟" شاہ نور نے برا منایا۔

"بس ویسے ہی دو جوس لے لیے......" داؤد نے کندھے اچکائے۔

"تمہیں تو سمسٹر بریک ہے ناں، گھر نہیں گئیں؟"

شاہ نور نے سر دائیں بائیں ہلایا۔ داؤد نے بغور دیکھتے مزید پوچھنے کا ارادہ ترک کیا۔

"ایزامز کیسے ہوئے؟"

"اچھے......"

داؤد نے نوٹس کیا وہ قدرے خاموش سی تھی اور سامنے بیٹھی لڑکی کو تکتی تھی جو گھٹنوں میں سر دیے ایک ہی پوزیشن میں کافی دیر سے بیٹھی تھی۔ داؤد نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں چند پل کو دیکھا۔

"زندگی جینے کے لیے ہوتی ہے......"

"کوئی جواز نہ ہو تب بھی؟" وہ داؤد کے جواب میں دوبدو بولی۔

"ہاں تب بھی......"

"کبھی کبھی کوئی احساس زیاں زندگی کے سارے لمحوں پہ بھاری ٹھہرتا ہے۔ کچھ چھن جانا زندگی کی ساری خوشیاں چھین لیتا ہے۔" شاہ نور کا لہجہ کچھ چھن جانے کی چغلی کھاتا تھا۔

"کوئی بھی بات اتنی بڑی بات نہیں ہوتی کہ ساری زندگی کی خوشیوں پہ حاوی ٹھہرے۔" داؤد ابھی بھی اپنے موقف پہ قائم تھا۔

شاہ نور نے سر جھکا لیا اور مخالف سمت دیکھنے لگی۔

"میرے والد نہیں تھے۔ میرے بہت بچپن میں وہ فوت ہو گئے۔ حالات دگرگوں ہو گئے لوگ اس کمی کو ہوا بنا لیتے ہیں۔ غربت کا بدلہ چور ڈکیت ناکارہ انسان بن کے لیتے ہیں۔ میں نے بچپن میں

www.pklibrary.com

اخبار بیچے چنا چاٹ بھی۔ ہر وہ کام جو سات آٹھ سالہ بچہ کر سکتا ہے۔ ساتھ پڑھتا بھی رہا۔ میرے والد ہوتے تو بھی اپنی زندگی میں نے بہر حال خود ہی گزارنی تھی۔ دنیا میں ہمیں ہمارے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ ہمیں اپنے لیے اپنے ساتھ جینا ہوتا ہے۔ اپنا حساب دینا ہے۔ اپنے لیے محنت کرنا ہوتی ہے۔"

"ہم جہاں رہتے ہیں وہاں کی سب چیزیں خاص طور پہ لوگ ہم پہ اثر انداز ہوتے ہیں۔" شاہ نور اس کی لاجک سے بالکل مطمئن نہ ہوئی تھی۔

"اثر انداز ناں...... حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔"

اصل میں جو انسان کے ساتھ ہوتا ہے وہ تو وہ برداشت کر ہی لیتا ہے اور جو اس کے اپنے وجود یا ذات کے ساتھ ہوتا ہے ناں وہ وہیں ٹھہر جاتا ہے، وہ زخم تا عمر ہرا رہتا ہے۔"

"شاید......" داؤد نے ٹاپک کلوز کرنا چاہا۔

"تم گھر نہیں گئیں، چھٹیاں تھیں۔" داؤد نے پھر سے پوچھا۔

"کیوں میرے رہنے سے تمہارا لاہور تنگ پڑ رہا ہے کیا؟" شاہ نور نے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔

"نہیں بلکہ اور وسیع اور روشن لگتا ہے......"

داؤد کی بات کا شاہ نور نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نظریں ہنوز سامنے گھٹنوں میں سر دیے لڑکی پہ رہیں۔ کچھ پل کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی بتانے لگی۔

"میرے والد نہیں ہیں گھر میں سوتیلی والدہ اور چھوٹا بھائی، اور بہن ہے۔"

"اوہ! تو تم اپنی سوتیلی ماں کی وجہ سے نہیں جا رہیں؟"

"نہیں۔ وہ تو اصرار کر رہی ہیں لیکن وہاں کے لوگ......" شاہ نور نے تلخی سے سر جھٹکا......

"میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا ناں تب ہی جان گیا تھا۔ تم بھی ان لوگوں میں سے ہو جو حالات چہرے پہ سجائے پھرتے ہیں، مشکلات کندھوں پہ اٹھائے پھرتے ہیں۔ مجھے پتا چل گیا تھا تم اسٹرونگ فیملی سے نہیں ہو۔ اور وہ بات جو تم نے بتائی نہیں لیکن تمہارے چہرے پہ سجی ہے......"

شاہ نور نے بے ساختہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائیں۔ لاشعوری طور پر ہاتھ دعائیہ انداز میں چہرے پہ پھیرا۔ چہرہ دوسری طرف ہونے کے باوجود داؤد نے اس کی اس حرکت کو نوٹس کیا تھا۔

"بہت ٹائم ہو گیا میں چلتی ہوں۔ راشدہ آنٹی انتظار کرتی ہوں گی۔" شاہ نور نے ایک دم اٹھ کے کہا اور چل پڑی۔

داؤد پر سوچ نگاہوں سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

داؤد یہاں پہ جو تم نے سارے جہان کو ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے کے گر سکھانے کا ٹھیکا لے رکھا ہے ان خدمات کو برائے مہربانی محدود کیجیے۔ سارا جہان عقل شعور لے کر پیدا ہوا ہے۔ دل اسے ڈپٹ رہا تھا۔

جاتے جاتے داؤد نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ لڑکی کا سر ابھی بھی گھٹنوں میں تھا۔

☆☆☆

شاہ نور شال لپیٹے ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھے بیٹھی تھی۔ لوگ کیسے دوسرے لوگوں کو جان جاتے ہیں اندر تک؟ کیا اور کیوں سجی تھی اس کے چہرے پہ وہ بات۔ وہ بات...... اسے اندھیرا اسٹور روم یاد آیا...... جس میں وہ گڑیا گھر سجائے بیٹھی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ ترچھی سی لیٹی تھی۔ اس کا دوپٹا کھینچا گیا تھا۔ یقیناً کوئی اسے اٹھا رہا تھا اسے نہیں اٹھنا تھا وہ ذرا سا کسمسائی اور بازو آنکھوں پہ رکھا...... پھر اس کی قمیص کھینچی گئی تھی وہ جھنجلائی تھی۔ مگر اسی پوزیشن میں لیٹی رہی۔ بوا عظمت ہمیشہ کی طرح اسے اٹھانے کے لیے چڑ کیوں نہیں رہیں۔ کسی انہونی کے احساس کے تحت شاہ نور نے بازو آنکھوں پر سے ہٹایا۔ وہ بوا عظمت نہیں تھیں۔ بوا

www.pklibrary.com

عظمت کا وجود منحنی سا تھا۔ وہ تو اونچا لمبا چوڑا وجود تھا۔ جس کے بھاری ہاتھ اس کے کندھوں پہ آٹھہرے تھے وہ ایک دم سے اٹھ کے چیخی تھی۔ بھاری ہاتھ فوراً سے پیشتر اس کے منہ پر آن رکا۔ اس کا سانس بند ہو رہا تھا۔ وہ پوری قوت سے چلا رہی تھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اور پھر وہ اس گرفت سے آزاد ہونے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ وہ اس کے پیچھے ہی تھا۔ کمروں میں سے بھاگتی ہوئی وہ ہال میں آرکی تھی۔

بوا عظمت کے پاس گاؤں کی دو عورتیں آئی بیٹھی تھیں۔

''شاہ نور! بیٹا، کیا ہوا؟'' وہ اسے دیکھ کر چونکیں اور اس کی طرف بڑھیں اڑے ہوئے بال، پھولے سانس اور پھٹی ہوئی قمیص......

''شاہ نور! کون تھا؟'' بوا عظمت نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ان کے ہاتھ کانپتے تھے ان کے لہجے میں اندیشے لرزتے تھے۔

''پانی......'' اس نے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیری۔ بوا عظمت تیزی سے کچن کی جانب گئیں اور اسی تیزی سے واپس بھی آئیں۔

''شاہ نور! میں تیرے باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی؟ بوا عظمت نے سر ہاتھوں میں گرالیا۔ پانی کے دو گھونٹ بھرتے شاہ نور کی نظر سامنے بیٹھیں دو عورتوں پہ پڑی۔ جو اسے عجیب نظروں سے تکتے ایک دوسری کے کان میں کھسر پھسر کرتی تھیں۔ اور پھر یہ کھسر پھسر اور عجیب نظریں ایک کان سے دوسرے دوسرے سے چوتھے اور چوتھے سے سولھویں کان تک پھیلتی گئیں۔

اور اب جب تیرہ سال بیت گئے تھے اس بات کو لوگ کسی قیمتی راز کی طرح اسے اپنے اندر رکھے ہوئے تھے۔

فرمان انکل جی ہاں وہ ان کا کل وقتی ملازم تھا جو حسب ضرورت گھر میں مالی، چوکیدار ڈرائیور کی خدمات سرانجام دیتا تھا اور اس دن کے بعد کہیں نہیں نظر آیا تھا۔ تو فرمان علی نے تو زیادتی کی کوشش کی تھی پر لوگ کر جاتے تھے۔ ہر بار کر جاتے تھے ہر روز کر جاتے تھے۔ اور یہی ایک بات جو اس پر ہر روز نئے سرے سے بیتتی تھی۔

داؤد کہتا تھا اس کے چہرے پہ بجی تھی۔ یہ بات جو ہر ایک دن نئے سرے سے وہ بھولنے کے جتن کرتی تھی۔ اسے ایک ہی انداز سے یاد رکھا جاتا۔ شاہ نور کو دیکھتے ہی آوازیں کھسر پھسر میں ڈھلتیں۔ نگاہیں سر سے پیر تک ترازو ہوتیں۔ وہ جہاں کہیں بھی گئی باہر اسکول، کالج، شادی بیاہ کے فنکشنز پہ...... یہ بات آسیب کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہی۔

''میرے چہرے پہ کیا بات بجی ہے؟'' ساری یادوں سے سارا دن لڑتے شام کو اس نے داؤد سے پوچھ ہی لیا۔

''وہی جو سجائے پھرتی ہو......'' داؤد کا فوری رپلائے آیا۔

''لوگ وہی کچھ دیکھتے ہیں جو ہم دکھانا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ زندگی کی تلخ یادیں اور کڑوی حقیقتیں مٹا دینے کے لیے ہوتی ہیں۔ دل کے اندر چھپا لینے کے لیے ہوتی ہیں۔ انہیں چہرے پہ نہیں سجا کر آبیاری شروع کر دیتے۔ سالوں ان کی پرورش کر کے نقوش کا حصہ نہیں بنا لیتے۔ اپنے چہرے کو دیکھو اور مسکراہٹ کو بھی۔ یہ تو ایک دنیا کو اس کے غم بھلا دے اور آپ نے اسی میں غم کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ میں وہ بات نہیں جاننا اور چاہتا ہوں کہ تم بھی وہ بات بھول جاؤ۔ مسکراؤ......'' اسما کلی کے ساتھ داؤد کا تفصیلی میسج......

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور شیشے کے سامنے آئی...... مسکراتے ہوئے خود کو دیکھا...... چہرے پہ چھایا حزن دراڑیں بن کے ٹوٹا اور نیچے بکھرا...... جادو شاہ نور کو آتا تھا مگر داؤد ہمیشہ کر جاتا تھا۔

☆☆☆

تمہیں سر شعیب کا پتا چلا؟'' وہ کلاس سے نکلنے کو تھی جب ردا نے پوچھا۔

www.pklibrary.com

"کیا؟"
انہیں جگر کا کینسر ہے۔ وہ اب دوبارہ کبھی یونی نہیں آئیں گے آج ان کا لاسٹ ڈے ہے۔"
وہ ان شاء اللہ جلد تندرست ہو جائیں گے اور پھر روز یونی آئیں گے......" شاہ نور روا کی بات کا برا منا کر بولی۔
"جگر کے کینسر کا پتا تب چلتا ہے جب جگر اسی فیصد تباہ ہو چکا ہوتا ہے۔" انسان کے بچنے کا بہت کم چانس ہوتا ہے۔"
"اللہ نہ کرے......" شاہ نور نے بیگ کندھے پہ سیٹ کیا اور سر شعیب کے آفس کی جانب آئی۔ پورا دروازہ تہنیتی پیغامات کے کارڈز سے سجا تھا۔ شاہ نور نے دستک دی۔ داؤد نے عجلت میں دروازہ کھولا ٹھٹکا، رکا اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔
"آؤ اندر آؤ......" وہ کہہ کر ایک طرف ہوا۔ شاہ نور دو قدم اندر آئی۔
"آپ کو اندر آنے کو بولا تھا۔ آپ تو سیدھی دل میں آ گئیں۔" آخری فقرہ داؤد نے دل میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ تھا کہ شاہ نور کو اپنی آنکھیں جھکانا پڑیں۔
"سر شعیب چلے گئے؟ کیسے ہیں وہ اب؟"
"ٹھیک ہیں......" داؤد نے مصروف نظر آنے کی سعی کی۔
شاہ نور کی نظر سامنے رکھے کارٹن پر پڑی۔ "آپ ان کا سامان کیوں پیک کر رہے ہیں؟"
"شاید اب لمبا عرصہ وہ یونی نہ آ سکیں۔ تو کچھ چیزیں انہیں چاہیے تھیں۔"
"تم گھر جا رہی ہو، آ جاؤ میں ڈراپ کر دوں گا۔"
"نہیں میری ابھی ایک کلاس رہتی ہے پھر میں لائبریری جاؤں گی کچھ ریفرنس بکس چاہئیں۔ میں آؤں گی سر کی خیریت معلوم کرنے۔" شاہ نور نے کمرے سے باہر قدم نکالے۔

تیسرے ہی دن سر شعیب کی ڈیتھ کی خبر آ گئی۔ غلام فاطمہ کے بھائی شہزاد اسے لے گئے تھے۔ پر سکون ہر فکر سے آزاد وہ چت لیٹے تھے۔
سر شعیب کی ایک شادی شدہ بیٹی دبئی سے آئی تھی۔ دوسری تقریباً شاہ نور کی ہی ہم عمر تھی وہ گویا سکتے میں بیٹھی باپ کو تکے جاتی تھی۔
"مشتعل۔" ہر پانچ دس منٹ بعد اسے کوئی نہ کوئی جھنجوڑ رہا تھا۔
شہزاد ماموں کی کال آئی تھی۔ اسے گھر واپس چھوڑ کے آ کر انہیں تدفین کے معاملات دیکھنے تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آئی۔ لاؤنج کے دروازے کے باہر داؤد کھڑا تھا۔ ایک پل کو دونوں کی نگاہیں ملیں۔ پرل گرے کلر کی جھیلیں شاہ نور کے اندر بہنے لگی تھیں۔ وہ فوراً سے پلٹ گئی۔
دن عجیب کسل مندی سے گزرتے تھے۔ آخری سمسٹر کے ایگزامز کے قریب تھے۔ شاہ نور آدھا دن تو لائبریری میں گزار آتی۔ شام میں بھی پارک چلی جاتی۔ کبھی یونہی آس پاس چہل قدمی...... یہاں بڑا آتا تھا باہر نکلنے میں۔ آزادی تھی...... چبھتی نگاہیں تھیں نہ ہی کھسر پھسر۔ داؤد بھی شاید مصروف ہو گیا تھا، اب پارک میں بھی نظر نہیں آیا تھا۔ کال پہ البتہ ایک دو روز بعد بات ہو جاتی تھی۔ داؤد کی یاد کے ساتھ ہی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا گویا اسے چھو گیا تھا۔ چہرے پہ بہار رقصاں ہوئی۔ کچھ لوگ لوگوں جیسے نہیں ہوتے، زندگی ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھتے ہی دنیا میں طویل قیام کا من کرے، جنہیں سوچتے ہی وان بن جائے۔ اس کی مسکان دیکھ کر ہوا کو بھی اٹکھیلیاں سوجھیں۔ وہ اس کے چہرے اور بکھرتی لٹوں سے چھیڑ خانی کرنے لگی۔ کچھ وقت گزار کر وہ گھر لوٹ آئی۔ کتابیں کھولیں اور جمع شدہ انرجی خرچ کرنے لگی۔
دو ہفتے بعد فائنل سمسٹر کے ایگزام ختم ہو گئے تو اس نے بیگ پیک کیا۔ غلام فاطمہ کا اصرار بڑھ رہا تھا۔ ایک دو بار وہ جب شہزاد کے گھر آئیں تو اس کو

www.pklibrary.com

بھی ادھر بلوالیا تھا۔ اک دوروز کے لیے ہی جانے کا پلان تھا اس نے مناسب سمجھا کہ داؤد کو بتادے۔ اس کی فوری کال آئی۔
"کیسے جاؤ گی؟"
"جیسے سب جاتے ہیں......" شاہ نوراس کی فکر پہ بے وجہ ہنسی۔
"میں چھوڑ آؤں؟"
"میں چلی جاؤں گی......"
"واپسی کب ہوگی؟"
"ایک دوروز تک......"
"پھر کیا پلان ہے؟"
"جاب کروں گی فی الحال یہیں رہنے کا پلان ہے۔"
"جلدی آنا۔ میں انتظار کروں گا۔"
"جی......" وہ فون رکھ کر بے وجہ اداس ہوئی۔

☆☆☆

بیگ کی زپ بند کر کے شاہ نور نے منتظر کھڑی ہوئیں غلام فاطمہ کو دیکھا۔
"یہیں رہ جاتیں......"
"مجھے دربدری راس آئی ہے۔" شاہ نور نے مسکرا کر کہا۔ اس کے لہجے انداز اور مسکراہٹ نے گواہی دی۔ غلام فاطمہ کے دل نے تصدیق کی۔
غلام فاطمہ اسے اسٹیشن تک خود چھوڑنے آئیں۔ شاہ نور کو دیکھتے ہر پہچان والے شخص کی نگاہیں ایکسرے ہوئیں۔ برسوں بیتی بات میں لوگوں نے ایک لمحے تک کی بھی خیانت نہ کی تھی۔ وقت کی گرد اس بات پر سے روز جھاڑ کے اسے تیار رکھا گیا تھا کھسر پھسر لہجے ہنوز تھے۔ اتنا کانفیڈنس آجانے کے باوجود شاہ نور کواپنا آپ ڈگمگانے لگا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے تک اس نے اپنی چادر کو کس کے پکڑے رکھا۔ جونہی بس لاہور کی حدود میں داخل ہوئی اسے گویا سکون سا مل گیا۔ ایک لمبا سانس لے کر وہ نارمل ہوئی۔
چڑیا ہاؤس تقریباً ویران تھا۔ فاتلو دے کے سب گھروں کو سدھار گئی تھیں۔ راشدہ آنٹی اچھی خاصی سوشل تھیں مگر اب گھر پر ہی تھیں۔ رات کا کھانا انہوں نے ہی بنایا تھا۔
"میں واپس آگئی ہوں......" کوئی دس بار شاہ نور نے لکھ کر ڈیلیٹ کیا اور پھر داؤد کو میسج بھیجنے کا ارادہ ملتوی کرتے وہ موبائل ایک طرف رکھتی لیٹ گئی۔
صبح پارک میں وہ کافی دیر ٹہلتی رہی، واک بھی کی، بنچ پہ بیٹھی ادھر ادھر تلاشتی رہی مگر داؤد نہیں آیا تھا۔
"اسے کیا پتا میں واپس آگئی ہوں؟" دل نے تاویل دی۔
"تو پہلے کیا وہ پارک تمہارے لیے آتا تھا؟ دماغ نے غصہ دکھایا۔
بددلی سے چلتی وہ واپس آئی۔
ناشتے کے بعد تیار ہوکر وہ یونیورسٹی کی لائبریری چلی آئی۔ ایک دو بکس واپس کیں، کچھ کی ورق گردانی کی اچانک اندھیرا سا چھانے لگا۔ شاہ نور نے ونڈو سے باہر جھانکا، یہ آخر ساون بھادوں کی بارش، اچانک سے مطلع ابر آلود ہوا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے ادھر ادھر لہرانے لگے۔ وہ گراؤنڈ میں چلی آئی اور کسی بنچ پہ بیٹھی فرصت کے لمحات سے لطف لینے لگی تھی، بنچ کے دوسرے سرے پہ آکر کوئی بیٹھا۔
"کیسی ہو؟"
"ٹھیک......" وہ مسکرائی لمحے جینے لگے تھے ہوا کچھ اور سرمست ہوئی۔
"تمہیں کیسے پتا میں واپس آگئی ہوں اور یہاں ہوں؟" شاہ نور کا لہجہ جلترنگ ہوا۔
"مجھے کسی نے جادو سکھایا تھا۔" داؤد کا لہجہ سنجیدہ تھا۔
"لمحے قید کرنا......" شاہ نور نے تصحیح کی۔
یونہی خیریت سے آئی ہو......"
"یونہی بس...... جاب کے لیے ایک دو جگہ اپلائی کیا ہوا ہے جب تک جوائننگ نہیں ہوتی ادھر ادھر وقت گزاری......" شاہ نور سامنے پام کے

www.pklibrary.com

درخت کو لہراتے دیکھ کر مسکرائی۔ "آپ خیریت سے یونی آئے؟"

ہوا نے زور پکڑا، بادل ایک دم سے گرجے۔ شاہ نور سکون سے بیٹھی رہی۔ وہ قدرتی آفتوں سے نہیں ڈرتی تھی اسے آفتوں نے بہت ڈرایا تھا۔

"تمہیں یہ کارڈ دینا تھا۔" داؤد نے جیب سے کارڈ نکالا۔

تین انچ چوڑا اور آٹھ دس انچ لمبا سلور اور سیاہ کارڈ، شاہ نور نے اٹھایا اور کھولتے ہوئے بولی۔ "کیسا کارڈ؟"

"میری شادی کا......" وہ سامنے لہراتے درختوں کو دیکھتا سرد اور منجمد آواز میں بولا۔

بجلی نے کڑک کے گویا بادلوں کو برسنے کی اجازت دی تھی۔ آن واحد میں شاہ نور کی آنکھوں میں پانی جمع ہو کر بہنے کو بے تاب ہوا...... پھر بادل برسے اور آنکھیں برستے میں۔ تیزی کس میں تھی کوئی جان نہ پاتا۔ شاہ نور اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیاہ اور سلور کارڈ نیچے جا گرا۔ اس سیاہ کارڈ نے اس کا دل سیاہ تاریک کر ڈالا تھا۔

فرمان علی نے زیادتی کی کوشش کی تھی، لوگ کر جاتے تھے۔ اور یہ جو لوگوں سے بڑھ کر تھا کیسا ظلم ڈھایا تھا اس نے۔ پیروں تلے سے زمین کھسکا دی تھی۔ شاہ نور لڑکھڑائی پھر سیدھی ہو کر مڑی۔ چارسو پانی کی چادر نے منظر دھندلا دیا تھا۔

"شاہ نور، میں صرف تمہیں جینا سکھا رہا تھا میں نے تم سے کبھی شادی کا وعدہ نہیں کیا تھا۔" بارش اور ہوا نے طوفان کی شکل اختیار کر لی تھی داؤد کو چلا کر اپنی بات اس تک پہنچانی پڑی۔

"میں نے سیکھ لیا...... مجھے جینے دو...... جاؤ۔" داؤد کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر شاہ نور نے تیز آواز میں کہا۔

"میں نے تمہیں ہنسنا سکھایا تھا مجھے ہنس کر دکھاؤ میں چلا جاؤں گا......" داؤد اس کے پیچھے آتا مضبوط آواز میں بولا۔

شاہ نور نے تیز تیز قدم اٹھانا شروع کر دیے۔ پانی روانی سے بہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سے بھی...... اور آسمان پر سے بھی۔ "موسم ظالم ہے تم مت بنو شاہ نور......" داؤد اس کے پیچھے آتا مجبور آواز میں بولا۔

وہ اسی تیزی سے چلتی رہی۔ اس نے ہاتھ دے کر آٹو روکا تھا، وہ داؤد کے بتائے راستے سے بھی گھر نہیں گئی تھی۔

☆☆☆

وہ دور نیند کی وادیوں میں سست روی سے قدم دھرتی تھی۔ اس کا ہلکا پھلکا وجود تھکان سے چور تھا۔ تب ہی کال بیل نے اسے نیند کی وادی سے حقیقت کی دنیا میں پٹخا۔ سائیڈ ٹیبل سے اس نے موبائل اٹھایا جو ساکٹ پہ لگا تھا۔ کئی ایک کال اور میسج اس نے بنا دیکھے پڑھے ڈیلیٹ کر دیے۔ کال بیل دوبارہ ہوئی تھی۔ یقیناً راشدہ آنٹی گھر پہ نہیں تھیں۔ اسی وقت داؤد کی کال بھی آنے لگی۔ وہ جانتی تھی باہر بھی وہی تھا۔ اسٹینڈ سے چادر اٹھا کر لپیٹتی وہ باہر آئی۔

دروازہ کھلنے کی آواز آتے ہی داؤد کی سانس بحال ہوئی۔ شاہ نور ہی باہر آئی تھی۔ ستی آنکھیں، پژمردہ چہرہ نڈھال سا۔ انداز اکثر داؤد اسے سنتے وقت الجھ جایا کرتا کہ شاہ نور کو سننا زیادہ سحر کن ہے یا اسے بولتے دیکھتے رہنا۔ بصارتوں اور سماعتوں میں باقاعدہ ایک جنگ سی چھڑ جاتی۔ اسے شاہ نور کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ اس کی تصویر ایک موتی میں ڈھل کر گلے میں اٹکی اور دل میں پیوست ہو گئی۔

"میں سو رہی تھی......" شاہ نور نے اپنے حلیے کی وضاحت دینا ضروری سمجھا۔

"مجھے تم سے بات......"

"مجھے تم سے کچھ چاہیے۔" شاہ نور اس کی بات کاٹتے دوبارہ تیزی سے بولی۔

"جی......" داؤد نے پورے وجود سے جان کھینچ کر ہتھیلی پہ دھرا دل قدموں میں رکھا۔

"مجھے کبھی بھی دوبارہ نظر مت آنا......" وہ

www.pklibrary.com

ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ جان ست روی سے وجود میں رہے گی۔ دل پہ داؤد نے پاؤں رکھا۔

تیزی سے اندر آ کر شاہ نور نے دروازہ بند کیا اور وہیں ٹیک لگا کر کھڑی ہوئی۔ آنسوؤں کو پیچھے دھکیلنے کی کوشش ناکام ہوئی۔ دل رلنے کا افسوس تو تھا ہی، اہانت شدید تر تھی۔

اس نے کبھی اس سے محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کبھی ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کیا تھا، کبھی شادی، کی بات نہیں کی تھی۔ اس نے کیسے خود سے سب فرض کرلیا تھا۔

جو بات اس نے کی ہی نہیں تھی وہ شاہ نور کیسے دل میں رکھ کے بیٹھی تھی؟

کیا واقعی ہر بات کرنے پہ ہی ہوتی ہوتی ہے۔ بعض جذبوں کو لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی بعض احساسات لفظوں کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ بغیر لفظوں۔ بغیر اظہار، بغیر وعدوں کے ایک دوسرے کو باندھ لیتے ہیں جکڑ لیتے ہیں۔ ان پر حاوی ہوئے ہیں۔ باہر کھڑے داؤد نے گیٹ کے نیچے سے نظر آتے شاہ نور کے پاؤں کو دیکھتے ہی بات سوچی تھی۔ بے بسی سے بالوں کو ہاتھوں میں جکڑتا وہ واپس مڑا۔

☆☆☆

"مجھے داؤد اس شادی سے خوش نہیں لگتا......"

مشعل ماں اور خالہ سے بات کرتی پریشان نظر آئی۔

"ہمارے پاس اور کوئی چوائس بھی تو نہیں ہے۔" داؤد کی ماں حلیمہ خاتون نے مجبوری بتائی۔

"تو میری شادی کو لے کر جوا کھیلا جارہا ہے۔"

"شادی تو ہوتی ہی جوا ہے۔" حاجرہ اس کی ماں پریشان نظر آئی۔

بڑی بیٹی یمل کی شادی انہوں نے غیر خاندان میں کی تھی اور یہ کوئی ایسا خوش گوار تجربہ نہ رہا تھا اور پر سے یمل کے میاں کا اصرار کہ مشعل کی شادی اس کے چھوٹے بھائی سے کی جائے۔ آناً فاناً مشعل کا رشتہ داؤد سے طے کر کے خاندان بھر میں کارڈ بانٹنے پڑے۔

داؤد ایسا لڑکا تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس کے ساتھ پہ رشک کرتی۔ ظاہری خوب صورتی تو تھی ہی باطنی طور پر بھی وہ خاصا خوب صورت تھا۔ خوش اخلاق اور خوش مزاج ...... یہ دو خوبیاں اسے تمام لوگوں سے منفرد کرتیں...... دونوں کا بچپن ساتھ ہی گزرا تھا۔ لڑکپن میں دونوں دوست تھے۔ اب جب سے مشعل کے اندر پسندیدگی کے جذبات جاگے تھے وہ داؤد کو لے کر تھوڑا محتاط ہوگئی تھی۔ بن مانگی پوری ہوئی خواہش کی خوشی کا تو مول ہی کوئی نہ تھا۔ لیکن داؤد کچھ الجھا ہوا سا دکھتا تھا۔ شاید وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا یا شاید......

دونوں بہنوں نے سب جمع پونجی اکٹھی کر کے اور پرانے گھر بیچ کے جوہر ٹاؤن میں ایک خوب صورت دو منزلہ گھر خرید لیا تھا۔ حاجرہ کا اب مشعل کے علاوہ تھا ہی کون؟ یمل تو شادی کے بعد سے باہر تھی سال دو سال بعد آنا ہوتا۔ اکلاپے کا بھی حل ہوگیا تھا اور اولاد بھی دونوں بہنوں کے سامنے رہتی۔ حلیمہ کا تھا ہی ایک بیٹا داؤد۔

وہ پارک کی سنگی بنچ پہ بیٹھا تھا۔ نگاہوں پہ پہرے بٹھانے کے باوجود سماعتیں کسی کی چاپ کی منتظر تھیں۔ انتظار بھی کس کا تھا؟ جس سے نہ کوئی اظہار تھا نہ وعدہ...... داؤد خود پر تمسخرانہ مسکرایا۔ اس نے کوشش کی تھی اسے یاد آیا۔

"ماں! میں مشعل سے نہیں شادی کرنا چاہتا...... حاجرہ خالہ کی عدت مکمل کرنے کے چند روز بعد حلیمہ نے اس سے بات کی تو وہ فوری بولا۔

"لیکن زبانی کلامی یہ رشتہ بچپن میں طے تھا۔"

"ہاں تو بچپن گزر گیا ہے ناں اب...... اب کی بات کریں۔"

"اب کی بات یہ ہے کہ تمہارے خالو شعیب بھی یہی چاہتے تھے تمہاری خالہ بھی اور ماں بھی۔"

"اور جس کی شادی ہے اس کے بارے میں جانتی ہیں وہ کیا چاہتا ہے؟؟"

"وہ کیا چاہتا ہے؟" حلیمہ سرد آواز میں

www.pklibrary.com

بولیں۔"

"ماں! مجھے ایک لڑکی پسند ہے......"

"پسند تو ہمیں بہت کچھ آجاتا ہے داؤد۔ ہر پسند تک تو ہماری رسائی نہیں ناں ہوتی......"

"لیکن اس تک شادی ہو......"

"کتنے ہی لوگوں کو دکھی کر کے؟ شعیب اور حاجرہ نے میرا بہت ساتھ دیا، بیٹا زندگی بھر۔"

"تو آپ مجھے قربان کر کے ان کے احسانات اتارنا چاہتی ہیں؟" داؤد کا لہجہ رنجیدہ ہوا۔

قربانی تو پھر عزیز چیز کی ہی ہوتی ہے داؤد...... اس عمر کی پسندیدگی زیادہ تر کوئی معنی نہیں رکھتی یہ عمر ہی ایسی ہے...... یا تو مان لو میری بات یا پھر میں تمہیں بخوشی اجازت دیتی ہوں اسی لڑکی سے شادی کر لو بس میری ایک شرط ہو گی اسے کبھی اپنے گھر نہ لانا۔ ہم تینوں خود کو تمہاری ذمہ داری سے قطعی آزاد کر دیں گی۔" حلیمہ نے دوٹوک بات کی۔

ایک کا دل توڑنا یا تین کا؟ قربانی تو پھر عزیز چیز کی ہی ہوتی ہے ناں داؤد نے دل قربان کر دیا۔

☆☆☆

سرد طویل رات کا اختتام ہوا تھا۔ رات بھر یادوں کی مسافت نے تھکا ڈالا تھا۔ شاہ نور ست روی سے اٹھ کر کچن میں آئی اور چائے بننے کو رکھی۔ چائے بنا کر وہ چھوٹے سے صحن میں آ گئی۔ مردہ کا پودا سردی سے مرجھایا ہوا لگتا تھا۔ آج آفس سے چھٹی تھی آج ایک ایک گھنٹہ طویل ہونا تھا۔ ایک تو سردی اوپر سے سردیوں کی بارش......

موسم سرد اور ظالم تھا پر اس کی یاد اس سے کہیں زیادہ...... اس نے چائے کا گھونٹ بھر کر ساری یادوں کو اندر اتارنے کی سعی کی۔

آج پورے انیس ماہ ہوئے تھے ان کی شادی کو...... اب تک وہ انگلیوں کی محتاج نہ ہوئی تھی مہینے گننے کو...... وہ جاب پہ جاتی باہر لوگوں کا اژدہام دیکھتی تو خود کو ڈپٹتی کتنی بڑی دنیا تھی ناں شاہ نور...... اور تو نے ایک ہی شخص کو دنیا بنا ڈالا۔ آخر نکلی ناں چھوٹے شہر کی...... محدود سوچ والی۔ جلد اعتبار کرنے والی......

رات غلام فاطمہ کی کال آئی۔

"گھر بسا لو شاہ نور......"

"گھر لے تو لیا ہے ذاتی......"

"اب گھر بھی بسا لو...... چاہو تو یہیں آ جاؤ، میں کہیں کوشش کرتی ہوں۔" اب وہ شاہ نور سے ہر بات کر لیتی تھیں......

"جن کے دل اجڑے ہوں ناں غلام فاطمہ، ان کے گھر نہیں بستے......" اس نے کاٹ کے لڑھکتا آنسو انگلی کی پور سے دور اڑایا۔

اس گھر کو اور کیا بساؤں غلام فاطمہ، کوئی کونا کھدرا بھی نہیں بچا جہاں اس کی یاد نہ بسی ہو...... حالانکہ اب تک تو مجھے چین آ جانا چاہیے تھا۔ لیکن بے قراری جاتی ہی نہیں......

چائے کا ادھ پیا کپ سرد ہو کر اس کی اور اپنی قسمت پہ ماتم کناں تھا۔

☆☆☆

"میں نے اس کا پتا ڈھونڈ لیا ہے، میں اس کے پاس جاؤں گی مما......" مشعل حاجرہ کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔

"کیا داؤد اس سے رابطہ میں ہے؟"

"رابطے میں ہوتا تو کب کا رابطہ کر چکی ہوتی......" وہ پژمردہ تھی۔

"میرا نہیں خیال تمہیں اس لڑکی کے پاس جانا چاہیے۔"

مجھے بہت پہلے چلے جانا چاہیے تھا مما...... آپ نے دیکھا داؤد مجھے دیکھتا نہیں ہے۔ میں سامنے کھڑی بھی اسے نظر نہیں آتی۔ وہ میرے سے ہنستا بولتا نہیں ہے۔ وہ جیسے اس کے شکنجے، اس کی قید میں ہے۔ میں اس بت سے پورے ہوئے حقوق کا کیا کروں؟" میں اسے آزاد کروانے ضرور جاؤں گی......" مشعل تیز اور بے ربط بول رہی تھی۔

مجھے اللہ نے دو ہی بیٹیاں دیں، اس دنیا میں دو

www.pklibrary.com

ذمہ داریاں میں دونوں کو خوش گوار زندگی دینے کے لیے کچھ نہ کر پائی۔ یسل خاوند کے ہاتھوں بچوں کی وجہ سے کٹھ پتلی ہے تو دوسری کا خاوند ایک ایسی لڑکی کے ہاتھوں جس سے اس کا رابطہ بھی نہیں......" حاجرہ رو دینے کو تھیں۔ "مشعل، ویسے وہ کیسی لڑکی ہو گی جس نے داؤد کو جیسے جکڑ ہی لیا ہے، یکسر ہی بدل گیا ہے وہ......اور وہ کسی طرح اس سے رابطے میں بھی نہیں۔" حاجرہ کی حیرت جاتی ہی نہ تھی۔

"کوئی جادوگر ہی ہو گی......" مشعل تلخی سے کہتی اٹھی۔

☆☆☆

چند فٹ کا صحن شاہ نور نے خوب سارے پودوں سے سجا رکھا تھا۔ اندرون شہر میں تنگ سی گلی میں تین مرلے کا گھر۔ شاہ نور نے شہزاد ماموں سے خود کہہ کے لیا تھا۔ گھر لینے کی ایک ہی شرط تھی اندرون شہر ہو اور تنگ سی گلی ہو......تین مرلے میں اچھا بنا ہوا گھر تھا۔ ایک کمرا، چھوٹا سا کچن اور چھوٹا سا لاؤنج۔ صحن کچھ کشادہ تھا اور گل مہر اور سروہ کے قدرے بڑے بڑے پودے تھے۔ کچھ اس نے خود سے پودے رکھوائے تھے۔ اپنے اس گھر کا پتا اس نے کسی کو بھی نہ دیا تھا۔ راشدہ آنٹی نے اصرار سے لیا تھا اور ایک بار اس سے ملنے آئی بھی تھیں آفس کی اکثر فائلز وہ گھر لے آیا کرتی، ابھی بھی گل مہر کے سرخ پھولوں سے چھیڑ خانی کرتی وہ فائل بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کام سے جی اکتایا تو صحن میں بکھرے پتوں کو صاف کرنے کا خیال آیا۔ داؤد ہوتا تو کہتا۔ چھوٹے شہر کی لڑکی نے گھر بھی چھوٹا سا لیا ہے۔ اس نے جھاڑو دیتے اس یاد پہ بھی جھاڑو پھیرا۔

تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔

یادوں کے علاوہ بھی کسی نے دستک دی ہے بھئی واہ......" خود کا مذاق اڑاتی وہ دروازے تک آئی۔ پرانی طرز کا لکڑی کا دروازہ جس کے اوپر پڑی آتشی پھولوں والی بوگن ویلیا بیک وقت اندر اور باہر جھانکتی تھی لوہے کی بھاری سی زنجیر اس نے ہک سے ہٹا کے دروازہ کھولا۔

"میں مشعل ہوں داؤد کی بیوی......" وہ اس کا طائرانہ جائزہ لیتی بولی۔

"تمہیں میرے گھر کا کیسے پتا چلا؟" شاہ نور کی آواز سرد اور سپاٹ تھی۔

"شفاف تحقیقات کی جائیں تو چور کا سراغ مل ہی جاتا ہے۔" ہاتھ سینے پہ باندھتے مشعل ابرو اٹھا کے بولی۔

"کیا لینے آئی ہو؟"

"داؤد کو......" مشعل نے خالی ہاتھ پھیلائے۔

تم اس کے نکاح میں ہو اور اس کے گھر میں بھی......میں تو نکاح میں ہوں نہ گھر میں، لو دیکھ لو ان خالی ہاتھوں کو......نہ کہیں لکیروں میں اس کا نام ہے نہ انگلی میں اس کے نام کی انگوٹھی۔" جواباً شاہ نور نے بھی ہاتھ پھیلائے۔

"تمہارے اسی سکون نے میری زندگی بے سکون کر رکھی ہے، آزاد کر دو داؤد کو......"

"تمہیں یہاں کہیں وہ نظر آ رہا ہے؟" شاہ نور نے دروازے سے ہٹ کر صحن کی طرف اشارہ کیا۔ مشعل نے ایک نظر پورے صحن میں دوڑائی۔

"تمہارے نصیب میں ہے وہ......اسے دوسروں کے گھروں میں مت ڈھونڈو......" شاہ نور نے کواڑ برابر کر کے کنڈی لگائی۔ سست روی سے وہ اندر آئی۔ موبائل نکال کر راشدہ آنٹی کا نمبر ملایا۔

"آپ سے کسی نے میرے گھر کا پتا پوچھا تھا؟"

سلام دعا کے بعد شاہ نور نے پوچھا۔

"نہیں تو......خیریت؟"

پھر مشعل میرے گھر کیسے آ گئی؟"

وہ شعیب کی بیٹی؟"

"جی......"

"اس کے گھر میرا آنا جانا ہے۔ حاجرہ اور حلیمہ سے اچھی دعا سلام ہے۔ ایک دن ذکر کیا تھا

www.pklibrary.com

میں نے کہہ داؤد بیٹے نے شاہ نور کی بڑی مدد کی اور ہاں یاد آیا مشعل نے پوچھا تھا کہ اب تم کہاں ہوتی ہو۔ کیا ہوا ہے؟"

"نہیں ہوا تو کچھ نہیں۔ آج وہ آئی تو حیرت ہوئی کہ میرے اس گھر کا کیسے پتا چلا اسے؟"

"اچھا کیا کہتی تھی؟"

"نہیں، ویسے ہی ملنے آئی تھی۔ آپ بھی دوبارہ آئیں ناں بھی......" شاہ نور کو مطلوبہ معلومات مل گئی تھیں سو بیتا پک کلوز کرنا چاہا۔

"بس بیٹا، اب تو یہ گھٹنوں کا درد کہیں آنے جانے نہیں دیتا۔"

☆☆☆

"میں کل شاہ نور کی طرف گئی تھی...... کلائی پہ گھڑی باندھتا داؤد ٹھٹک کے رکا۔ مشعل نے بغور دیکھا۔ وہ صوفہ کم بیڈ پہ ہاتھ میں خالی مگ لیے بیٹھی تھی۔

"کس لیے؟" سنجیدہ سے انداز سے پوچھا۔ وہ اب سنجیدہ ہی ہوتا تھا۔

"تمہیں ڈھونڈنے......" اس نے ناخن سے کنارہ کھرچا۔

"میں یہاں ہوں تمہارے سامنے......"

"بظاہر......" مشعل نے سر ٹیک سے لگایا۔

"اسے تنگ مت کرنا مشعل...... میں یہاں تمہارے پاس ہی ہوتا ہوں ہر وقت......" داؤد نے بے بسی بھرے لہجے میں وارننگ دی۔

"میرے ساتھ ہی تو نہیں ہوتے۔ رات دو بجے سے صبح پانچ بجے تک آپ کہاں تھے؟"

میں پیچھے گیلری میں تھا، نیند نہیں آ رہی تھی اور سگریٹ کی طلب ہو رہی تھی تو میں پیچھے کرسی پہ بیٹھا تھا۔"

"میرے ساتھ تو نہیں تھے ناں...... میرے وجود سے تو شاہ نور کی یاد تک زیادہ خوش قسمت ہے۔ نیند تو آپ کو آتی نہیں۔ آ جائے تو شاہ نور کتنی ہی بار بڑبڑاتے ہو اور آپ کہتے ہیں کہ آپ میرے ساتھ ہوتے ہیں؟"

"مشعل؟ مجھے کسی مشکل میں مت ڈالو۔ میں بے بس ہوں، مجھے سمجھو۔" داؤد بیگ کندھے پہ ڈالتا باہر نکلا۔

"آپ کی مشکل ہی تو آسان کرنا چاہتی ہوں۔" مشعل بڑبڑائی۔

☆☆☆

"تم اس لڑکی سے ملی ہوں ناں مشعل، کیسی ہے وہ؟" حلیمہ خالہ اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولیں۔

دونوں لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھی تھیں...... حلیمہ نے چائے پی کر خالی کپ ایک طرف کو رکھا تو مشعل نے اپنا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔

"مسحور کن......" مشعل کو اور کوئی لفظ مناسب نہ لگا۔

تبھی تو سحر میں جکڑ کر رکھا ہے اس نے داؤد کو......"

"وہ خوب صورت ہے خالہ، مگر خوب صورت تو اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کچھ خاص تھا اس میں خود میں اسے بھول نہیں پا رہی......"

"میرا ہنستا کھیلتا زندہ دل بیٹا مرجھا کر رہ گیا ہے۔ میرا ہنستا کھلکھلاتا بیٹا واپس لاؤ گی مشعل؟" حلیمہ نے بڑی امید سے پوچھا۔

مشعل کا دل یکبارگی ڈوبا۔ وہ خاموشی سے لیٹی رہی۔

"میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں اور داؤد کو بھی...... یہ صرف تم کر سکتی ہو مشعل......"

"میں نے کوشش کی خالہ، مگر میں خود لاجواب ہو کر آ گئی۔"

"تم اسے داؤد کی زندگی میں واپس لے آؤ۔" مشعل حیرت سے گنگ اٹھ بیٹھی...... وہ بے یقینی سے خالہ کو دیکھتی تھی۔ آنکھیں نمکین پانیوں سے بھریں۔

"اللہ تعالیٰ کسی کسی انسان کو ان ڈائریکٹ

www.pklibrary.com

رزق دیتا ہے، کسی کو کسی اور کے توسط سے، کسی اور کے وسیلے سے کسی ایک انسان کو بہت سا نوازا کے اس کے حصے بہت سے لوگوں کو نوازنا لکھا ہوتا ہے۔ ایسے ہی بھی کبھار کسی ایک انسان کی خوشیاں بھی اللہ نے ان ڈائریکٹ لکھ رکھی ہوتی ہیں۔ اسے کسی اور کے وسیلے سے خوشی ملنا ہوتی ہے۔ کسی اور کی خوشی میں اس کی خوشی کا راز بھی پوشیدہ ہوتا ہے۔ تم اس لڑکی اور داؤد کو خوشی دے کر تو دیکھو، تمہاری خوشیوں کے راستے بھی کھل جائیں گے۔"

"آپ بہت بڑی قربانی مانگ رہی ہیں مجھ سے خالہ۔" مشعل کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں۔

"تم داؤد کو جانتی ہو۔ وہ کتنا حساس اور نرم دل ہے۔ وہ تم دونوں میں عدل کرے گا۔ تم چاہو تو ہم اپنا اوپر والا پورشن اسے دے دیں گے ورنہ تو وہ اپنے ہی گھر رہے گی۔"

"ابھی یہ ممکن نہیں خالہ، میرے لیے...... میری جب ہمت جواب دے جائے گی داؤد کے رویے سے یا از خود مجھ میں ہمت آجائے گی تو میں سوچوں گی۔ ابھی نہیں یہ میرے بس میں......" مشعل دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رو دی۔

☆☆☆

مشعل بہت اصرار کے بعد داؤد کو آمادہ کر کے لانگ ڈرائیو پہ لائی تھی۔ اور اب شدید بور ہوئی تھی۔ گاڑی میں تنی خاموشی کی چادر میں باوجود کوشش کے بھی وہ شگاف نہ کر پائی۔ میوزک اسے اٹریکٹ نہیں کرتا تھا۔ داؤد کسی روبوٹ کی طرح گاڑی چلا رہا تھا۔ انداز بھی سنجیدہ تھا۔

"داؤد......" مشعل نے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ دھرا۔ "تم مجھے اپنی کسی بہت پسندیدہ جگہ لے کر چلو......" اس نے بڑے مان سے کہا۔

داؤد نے اسے دیکھتے "اوکے کہا" اور گاڑی دائیں جانب موڑی۔

دس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ اسے ایک پارک لے آیا تھا۔ مشعل خوش ہوئی کم از کم اسے اس کی بات کا احساس تو تھا۔ چھوٹا سا پارک، اکا دکا لوگ ہی تھے۔ کچھ بچے سلائیڈ پہ کھیل رہے تھے۔ داؤد اس سے دو قدم آگے چلتا ایک سنگی بنچ پہ بیٹھا، مشعل نے بھی اس کی تقلید کی۔

خاموشی چند لمحے حائل رہی...... پھر داؤد کی آواز آئی۔

"مشعل......"

"جی......" وہ جی جان سے متوجہ ہوئی۔

"تمہیں جادو آتا ہے؟"

"نہیں......" وہ بنا کسی تاثر کے بولی۔ جان گئی تھی کہ وہ کسی لمحے کا اسیر ہوا بیٹھا تھا۔ بے حد تھک کر مشعل نے سنگی بنچ سے ٹیک لگائی۔

وہ تھکنے لگی تھی اب...... یہ تعلق اب بوجھ سا محسوس ہوتا۔ ساتھ ہونے اور پا لینے کا فرق وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔

زندگی اسے دوراہے پہ لا رہی تھی...... محبوب یا محبوب کی خوشی والا اسے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

خود اس کی خوشی؟؟ دل کر لایا۔ شاید خالہ ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ اس کے نصیب میں کسی کے توسط سے ملی خوشی لکھی گئی تھی۔

"کچھ کھانا ہے۔"

گاڑی میں بیٹھتے داؤد نے اس سے پوچھا جوابا مشعل اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر زخمی پن تھا کہ داؤد چہرہ جھکا کر رہ گیا۔ وہ بھی کیا کرتا لگتا تھا، لفظ جیسے اس سے روٹھ گئے تھے۔ بات کرنے کا فن تو گویا وہ بھول ہی گیا تھا۔ اچھی زندگی کے سب آداب جو وہ دوسروں کو سکھایا کرتا تھا، ہمت کے درس جو وہ دوسروں کو دیتا تھا سب محو ہو گئے تھے...... سب لفظ گونگے ہو گئے تھے...... اور خود وہ قوت گویائی کو واپس پانے کے کتنے ہی جتن کرتا سب بیکار جاتے۔ اسے گیٹ کے آگے اتار کے داؤد کہیں چلا گیا تھا۔ وہ ڈھیلے قدموں اندر آئی خالہ سامنے ہی بیٹھی تھیں۔

"ہو آئیں لانگ ڈرائیو سے، مزا آیا؟"

www.pklibrary.com

"وہ مزا آنے دے گی جو اس کے اندر بسی ہے۔ ہر روز ہمارے درمیان آ جاتی ہے۔" مشعل نڈھال سی صوفے کے کنارے بیٹھی۔

"جو روز آ جاتی ہے اسے مستقل ہی لے آؤ مشعل......" خالہ نے بارہا کا دیا مشورہ پھر سے دیا۔

مما نے کرب چھپانے کو چہرہ دوسری طرف کیا۔

صوفے کے کنارے سے ٹیک لگاتے مشعل نے آنسوؤں کو آزاد چھوڑا۔

☆☆☆

بادل چاروں جانب سے گھر کر آئے تھے۔ ہوا آندھی کی صورت اختیار کر چکی تھی، گل مہر کے کتنے ہی سرخ پھول نیچے آ گرے تھے۔ یہ موسم شاہ نور پہ عذاب کی صورت اترتا۔ کن من کے ساتھ ہی یادوں کی کن من شروع ہو جاتی۔ اتنی تو بوندیں نہ گرتی تھی جتنی یادیں آ ٹپکتیں۔ لکڑی کے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ شاہ نور اس مانوس دستک سے واقف تھی قریب چھ ماہ بعد یہ دوبارہ ہوئی تھی۔ صحن عبور کر کے وہ دروازے تک آئی اور کنڈی کھولی۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

"خیر سے آئی ہو؟" اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ پوچھا۔

"خیرات لینے آئی ہوں......" مشعل نے جھولی پھیلائی۔ پہلے کے برعکس اس کے لہجے میں عاجزی بے بسی مجبوری تھی۔ غصہ کہیں رکھ کے بھول آئی تھی وہ...... "تم سے داؤد کو مانگنے آئی ہوں۔"

"تمہیں مل چکا ہے وہ۔"

"خاک ملی ہے فقط اور میرے خاک میں ملنے تک خاک ہی ملی رہے گی۔ چار خانوں والا دھڑ کتا لوتھڑا تو یہیں کہیں رہ گیا ہے تمہارے پاس......"

شاہ نور نے نگاہیں جھکا کے دہلیز کو پاؤں سے کھرچا۔

"میرے ساتھ کوئی اور بھی ہے......" مشعل کی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا۔

حلیمہ خالہ داؤد کی والدہ...... وہ آگے آئیں اور شاہ نور کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ ایک طرف ہوئی اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

"جس کے دل میں بستی ہو ناں اس کے گھر بھی آن بسو بیٹی۔" شاہ نور کو لگتا تھا اس سے مجبور کوئی نہیں مگر یہ ماں کیسی مجبور دکھائی دیتی تھی۔

"جس کا گھر ہے وہ تو ایسی کوئی بات ہی نہیں کرتا......" نا چاہتے بھی شکوہ شاہ نور کے لبوں سے پھسلا...... "اب تو رابطہ ہی نہیں، وہ پہلے بھی نہیں کرتا تھا۔"

"اور اب اگر بات کرلے تو ......" حلیمہ نے امید سے پوچھا۔ شاہ نور نے سر اٹھا کے مشعل کو دیکھا۔"

اس شخص کا دل اتنا وسیع ہے کہ ہم دونوں بخوشی رہ لیں گی۔" مشعل نے یقین دہانی کروائی۔

شاہ نور نے خاموشی سے سر جھکایا۔

"تمہاری قربانی معتبر ہوئی بیٹا...... حلیمہ داؤد کو فون کر رہی تھیں۔

☆☆☆

کل بارش خوب برسی تھی آسانی بھی اور شاہ نور کے نینوں کی بھی۔ شب تاروں بھری اور چاند کی چاندنی سے مسحور رہی تھی۔ شاہ نور کی شب ہجر آنسوؤں کے ساتھ وصل ہوئی تھی۔ "مطلع" صاف تھا مگر شکوے بگولہ بنے اڑتے گرتے تھے۔ دن کا انتظار اس نے رات کی گھڑیاں گن گن کر کیا تھا۔ داؤد اس کی زندگی میں آیا۔ دل میں جگہ بنائی اور ایک دم سے عمارت کھنڈر کر گیا۔ اور اب پھر وہ آ رہا تھا...... وہ نہیں حلیمہ خاتون نے درخواست کی تھی...... مشعل نے منتیں کی تھیں۔ جسے کچھ کہنا چاہیے تھا کھنڈر سے بنیاد اٹھانی چاہیے تھی۔ وہ فون پہ بولا بھی تو کیا۔

"کیسی ہو"۔

"ٹھیک ہوں......" شاہ نور اب ٹھیک ہوئی تھی۔

"ماما اور مشعل تمہیں میری زندگی میں لانا چاہتی ہیں۔" داؤد جلدی سے بولا مبادا پھر نہ دیر ہو جائے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" شاہ نور کی انا زخمی ہوئی۔

www.pklibrary.com

"میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا......" داؤد کے لفظ مدھم سروں گنگنائے تھے۔ سارے زخم بھرنے لگے تھے۔ سارے درد مٹنے لگے تھے۔

"اور کچھ؟"

وہ آفس میں تھا اور یقیناً مصروف بھی اب شاہ نور کیا پوچھتی؟؟ اب تو کوئی سوال سوال رہا ہی نہ تھا۔ سارے سوال جواب ہوئے تھے لیکن آج پھر کئی ایک سوال ابھرتے تھے، شکوہ بلبلہ بنتے اور "میں تو ہمیشہ سے یہی چاہتا تھا" سے پھٹ جاتے۔

شاہ نور گھر کو تالا لگائے چڑیا ہاؤس چلی آئی۔ دن روشن اور چمک دار تھا۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا کی موجودگی میں گرم دھوپ چبھتی نہ تھی۔ چڑیا ہاؤس کے گیٹ کے قریب کھڑے ہو کر اندر جانے کا ارادہ ترک کرتی وہ پارک میں چلی آئی۔ بنچ پہ بیٹھتے ہی بیتے دن اپنا عکس سمیٹتے اس کے قریب آٹھہرے۔ وہ ایک ایک دن سے کوئی نہ کوئی یاد کشید کرنے لگی۔ آہٹ پر مڑ کر دیکھا تو یاد مجسم تھی۔

"میں یہاں روز آتا ہوں......" وہ بنچ کے دوسرے سرے پر بیٹھا۔

"میں روز نہیں آتی۔"

نہ آکر بھی روز یہیں ہوتی تھیں تم......" داؤد اب کوئی احساس...... کوئی جذبہ کوئی بات اپنے دل میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"لیکن تم کہیں بھی نہیں ہوتے تھے......" شاہ نور کے لبوں سے شکوہ باہر پھسلا۔ اب آ گیا ہوں تو نہ آنے کے سب ہی شکوے مٹا دوں گا۔" وہ کہہ رہا تھا۔

شاہ نور کو لگا اس نے وعدہ کیا ہو۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ نور کے مقابل کھڑا ہوا اور گھٹنوں پر جھکا۔

"میری زندگی میں شامل ہو جاؤ شاہ نور۔ میں اپنی زندگی کے سب سکھ دکھ ہنسی خوشیاں تمہارے ہمراہ دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کا انداز ملتجی تھا۔ لہجہ مضبوط اور آواز پر عزم۔

"انصاف کر سکو گے!" شاہ نور نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"میں عدل کروں گا۔"...... داؤد کا ارادہ مصمم تھا۔

"آپ نے مجھے بہت ہرٹ کیا۔" شکوہ لبوں سے پھسلا۔

"میں اب تمہیں خوش رکھوں گا۔ بس مشعل کے بارے کچھ مت کہنا تم محبت ہو اور وہ ضرورت۔ میں دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ بڑے دل کی مالک ہے اور تم اچھے دل کی۔ تم دونوں ہی آپس میں خوش رہوگی۔" داؤد اٹھ کر اس کے مقابل بیٹھا۔

زندگی میں یہی پہلا مرد اس کے دل میں جگہ بنا پایا تھا۔ وہ اسے زندگی میں جگہ کیسے نہ دیتی؟

☆☆☆

موبائل کان سے لگائے شاہ نور نے کال پک کیے جانے تک کا انتظار کیا۔

"غلام فاطمہ......"

"غلام فاطمہ کی بیٹی ہوں......" نور حرا چہکی تھی۔

"میں شادی کر رہی ہوں نور حرا۔

مبارک ہو......" نور حرا کا لہجہ سپاٹ ہوا۔

"تم آؤ گی؟" شاہ نور نے بالآخر ان حقیقی رشتوں کو حقیقی طریقے سے نبھانے کا ارادہ کر ہی لیا تھا۔

"تم آؤ گی۔" نور حرا نے اس کے ارادے کی حوصلہ افزائی کی۔ "تم یہاں آؤ گی ہم برابر آپ کی شادی کا فنکشن کر کے یہاں سے رخصت کریں گے......" نور حرا بے تکلفی سے بولی مگر اس بے تکلفی میں بھی تذبذب تھا۔

"میں ایسا نہیں چاہتی۔"

"آپ نے مجھ سے بہن ہونے کا حق چھینا۔ آپ مجھ سے سالی ہونے کا بھی حق چھیننا چاہتی ہیں......" نور حرا کے لہجے میں دکھ بھرا تھا۔

"میرے اندر ابھی بھی اتنی ہمت نہیں آئی نور حرا، کہ میں ان اندر اترتی نظروں کی تاب لا سکوں۔ میرا وہ بچپن سے خوف گیا ہی نہیں۔"

"کیوں کہ آپ نے جانے دیا ہی نہیں شاہ نور...... آپ نے تو بڑے لاڈ اور پیار سے اس خوف کو

www.pklibrary.com

پالا ہے پرورش کی ہے۔ چھوٹے سے بڑا کیا ہے۔ اور اسی پرورش میں آپ اپنے سے وابستہ سب رشتوں کو بھولی رہیں، آپ کی وجہ سے وہ کتنی تکلیف میں رہے۔ ابو، مما اور ہم بہن بھائی۔ اپنے خوف کے آگے آپ کو کوئی رشتہ نظر ہی نہ آیا۔ نظر آتے بھی رہے تو وہ لوگ جنہیں ہر دن ایک نیا تماشا، ایک نئی بات ایک نیا قصہ چاہیے ہوتا ہے۔" نورحرا آج سب کہہ دینا چاہتی تھی۔

"نیا واقعہ نہیں چاہیے ہوتا نور۔ وہ پرانے قصے بھی یاد رکھتے ہیں۔"

"کیونکہ آپ جیسے لوگ ان لوگوں کو یاد کرواتے ہیں۔ آپ کا خوف اور بزدلی...... آپ آئیں یہاں۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں۔ گردن اکڑا کے چہرہ اٹھا کے۔ اس کے بعد بھی کوئی آنکھیں، باتیں آپ کو خوف زدہ کریں تو مجھے بتاؤ۔ میں ان لوگوں کی آنکھیں نکال کے ہاتھ پہ رکھوں گی اور زبان کے ٹکڑے کر کے کسی کنویں میں پھینکوں گی۔" نورحرا کا لہجہ دبنگ تھا۔

"یہ قصائیوں والے کام کب سے شروع کر دیے تم نے......" شاہ نور نے لہجے کو ہلکا پھلکا کیا۔

"شروع بچپن سے ہی...... برداشت کر سکتے ہو برداشت کرو، اگنور کر سکتے ہو اگنور کرو۔ منہ توڑ سکتے ہو توڑ دو۔ بس باتوں کو خود پہ کبھی بھی حاوی نہ کرو۔ اپنی زندگی جیو۔ لوگوں کے لہجے، باتیں نظریں نہیں۔"

"داؤد بھی تمہارے جیسی باتیں کرتا ہے۔"

"داؤد!"

داؤد اسماعیل۔ جس سے شادی کرنی ہے۔"

"کب ہے شادی؟"

"آپ لوگوں کو پتا ہو...... جو میں کر سکتی تھی رشتہ ڈھونڈنا، میں نے کر لیا۔ جو تم علی اور غلام فاطمہ کر سکتے ہو انتظامات ...... تم کر لو......" شاہ نور نے ہوا میں ایک گہری سانس خارج کر کے خود کو آزاد محسوس کیا۔

☆☆☆

کتنے دن کا قیام ہے؟" داؤد نے سوٹ کیس اٹھاتے شاہ نور سے پوچھا۔

دو تین روز کا ہی......" بالوں کو لپیٹتے شاہ نور نے مصروف لہجے میں بتایا۔

"سوٹ زندگی بھر کے رکھ لیے ہیں۔"

"ابھی تو کتنی ہی چیزیں واپس نکالی ہیں۔" شاہ نور نے احسان دھرا۔

"چھوٹے شہر کی لڑکی، دل بڑا رکھا کرو سوٹ کیس نہیں......" داؤد نے پھر سے ہمت کی سوٹ کیس کو اٹھانے کی۔

"اللہ ہو چوک سے گاڑی دائیں طرف موڑ لیجیے گا۔ چڑیا ہاؤس والی روڈ سے ہوتے ہوئے جائیں گے......" شاہ نور نے خواہش کی۔

"راشدہ آنٹی سے ملنا ہے؟"

"نہیں یونہی کچھ یادیں تازہ کرنی ہیں......"

"مجھے لگا کسی کو قید کرنا ہے......" داؤد نے چھیڑا۔

"قید تو کر لیا......" شاہ نور مطمئن تھی۔

"وہ بھی بامشقت......" گاڑی کی ڈگی میں سوٹ کیس رکھتا داؤد پھر سے جھنجلایا۔

"آپ گاڑی نکالیں، میں ماں اور خالہ سے مل کر آتی ہوں۔" شاہ نور چادر لپیٹتے اندر بڑھی۔

داؤد گاڑی سے ٹیک لگائے اس کے آنے کے انتظار میں تھا کہ نظر سامنے اوپر اٹھی۔ متصل ریلنگ پہ جھکی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ داؤد نے مسکرا کے ہاتھ ہلایا۔ جواباً وہ بھی مسکرا دی۔

کیسی جاندار سی مسکراہٹ تھی ناں داؤد کی۔ کئی احساسات لیے ہوئے۔ احسان مندی، اس کی وسیع القلبی کی قائل مسکراہٹ۔

حلیمہ خالہ ٹھیک ہی کہتی تھیں کبھی کبھی ہمیں خوشیاں ان ڈائریکٹ ملنا ہوتی ہیں۔ کسی اور کے توسط سے، کسی اور کے وسیلے سے۔ ذرا سی وسیع القلبی سے اس کی حقیقی خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔

شاہ نور جا رہی تھی میکے تو حلیمہ خالہ نیچے والے پورشن میں اکیلی ہوں گی۔ وہ اپنی ضروری اشیاء سمیٹتی دو روز کے لیے نچلے پورشن میں شفٹ ہونے والی تھی

☆☆

www.pklibrary.com

عطیہ خالد

تیری یاد آئی تیرے جانے کے بعد

مجھے اس کی کوئی ایک بات بھی پسند نہیں تھی۔ کوئی ایک بات بھی نہیں۔ ایسا نہیں تھا کہ اس میں کوئی خوبی نہیں تھی۔ بس مجھے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اس لیے کہ میں ساس تھی اور ساسوں کو تو بہوؤں کی اچھی بھی بری لگتی ہیں۔

میں ہمیشہ سے بیوگی کے بعد سے گاؤں میں اپنے بھائی کے پاس رہی تھی۔ عمر میرا اکلوتا بیٹا تھا، جسے میں نے پڑھائی کی غرض سے شہر بھیج دیا تھا۔ میٹرک کے بعد سے اس کی ساری تعلیم شہر میں ہی مکمل ہوئی تھی۔ پھر اس نے شہر میں ہی نوکری بھی کر لی۔ شہر میں ہی وہ ایک لڑکے کے ساتھ فلیٹ میں رہنے لگا۔ گاؤں وہ ہر بیس پچیس دن بعد چکر لگا لیا کرتا تھا۔ گاؤں میں جب میرا پڑھا لکھا بیٹا چار لوگوں میں بیٹھ کر اتنی اچھی اردو بولتا، بیچ میں بھی کبھار انگریزی کے الفاظ کا تڑکا لگاتا تو میرا کلیجہ اتنا بڑا ہو جاتا۔ جب تک وہ گاؤں میں رہتا، میرے گرد ہی گھومتا رہتا، میرے ہاتھوں کے بنائے کھانے کھاتا اور تعریف کرتا۔ میں رب کا شکر کرتی کہ میرے بیٹے کو بیوہ ماں کا خیال تھا ورنہ آج کل کے بچے کہاں والدین کی پروا کرتے ہیں۔

ایک دن وہ گاؤں ملنے آیا تو رات میں میری ٹانگیں دباتے ہوئے خود سے بات شروع کی۔

''اماں! وہ اس دن آپ میری شادی کی بات کر رہی تھیں نا۔'' اس کی بات پہ میرا چونکنا بنتا ہی تھا۔ سیانے کہتے ہیں جب لڑکا اپنے منہ سے اپنے رشتے کی بات کرے تو سمجھو کہ اب وہ شادی کے لیے اتاولا ہو چلا ہے۔

''تو وہ ایک فیملی ہے بہت اچھی شہر میں۔ میرے جاننے والے ہی سمجھیں انہیں۔'' اس نے کسی لڑکی کا نام نہیں لیا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی نا کوئی معاملہ ہے۔

''تو کیسے جانتا ہے اس فیملی کو۔؟'' میں نے اپنی منجی (چارپائی) پہ پڑا گاؤ تکیہ قریب کر کے اس سے ٹیک لگا لی تا کہ میں اونچی ہو کر اس کی بات سن سکوں۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ سکوں۔

''میرا دوست ہے نا تیمور۔ اس کے رشتے دار ہیں اماں۔'' تیمور کا نام وہ اکثر لیتا رہتا تھا۔ اس لڑکے کے ساتھ وہ نوکری پہ آتا جاتا تھا۔

''لڑکی کا بتا مجھے۔ کیا کرتی ہے وہ۔؟'' مجھے خاندان سے زیادہ لڑکی کا اتا پتا چاہیے تھا۔

''بہت پڑھی لکھی ہے اماں۔ اور کسی اچھی جگہ نوکری بھی کرتی ہے۔'' میرا ماتھا ٹھنکا۔ پڑھی لکھی اور نوکری پیشہ تو میری چوٹی پکڑ کر باہر کرے گی۔

''نہ نہ۔ مجھے ایسی لڑکی اپنے پتر کے لیے نہیں چاہیے۔ یہ پڑھی لکھی لڑکیاں بہت ہوشیار ہوتی ہیں۔ خاوند کو فوراً مٹھی میں دبا لیتی ہیں۔ خاندان سے الگ کر دیتی ہیں۔'' میں نے پاس پڑی ہتھ والی پنکھی جھلنا شروع کی کہ جس درخت تلے میری منجی تھی، وہ ہوا دینا بند کر چکا تھا۔

''اماں! اب کیا میں اتنا پڑھ لکھ کر آپ کی گاؤں برادری کی کسی ان پڑھ لڑکی سے شادی کروں گا۔؟'' وہ منہ بنا کر خفا ہو گیا۔

www.pklibrary.com

بات تو اس کی ٹھیک تھی۔ بیٹے کو اتنا پڑھا لکھا کر میں کیا کسی گنوار سے اس کی شادی کر دیتی۔ بھلے میری برادری بہت بڑی تھی لیکن اس میں عمر کی جوڑ کی کہاں تھی کوئی؟

''وہ غلام محمد کی شیلا (شہلا) کیسی ہے۔؟'' مجھے یکدم اپنی دانست میں ایک پڑھی لکھی لڑکی یاد آ گئی جو میرے مامے زاد کی دھی (بیٹی) تھی۔ عمر نے جھٹ سے برا منہ بنایا۔

''بارہویں پاس ہے وہ۔ کیا خاک اچھی ہو گی۔''

''اور وہ شہد (شاہد) کی فاطمہ؟'' خاندان کی ایک اور پڑھی لکھی بچی ذہن میں آئی۔

''اماں! وہ بھی بی اے ہی پاس ہے۔ بی اے میں بھی شک ہی ہے کہ پاس ہے بھی یا نہیں۔'' اس کا موڈ مزید بگڑ گیا۔

''اماں! مجھے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی چاہیے جو



www.pklibrary.com

نوکری بھی کرتی ہو کیونکہ آج کل دونوں مل کر کمائیں تو گزارا ہوتا ہے۔" اس کی اس بات پہ مجھے چپ لگ گئی۔ میری بہو کے حوالے سے سوچ الگ تھی اور میرے بیٹے کی الگ۔ اب کیا کرتی میں۔ گزارہ تو اس نے کرنا تھا۔

"کب چلنا ہے شہر۔؟" اس کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر مجھے پوچھنا ہی پڑا۔

"کل ہی چلتے ہیں۔" میرے اس سوال پہ اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

میں بیوہ ماں ایک ہی سہارے پہ تو جیتی تھی۔ میرا بیٹا۔ بھلا اسے میں خفا کیسے کر کے یہاں سے بھیج سکتی تھی؟

☆☆☆

میں جب عمر کے ساتھ شہر آ کر اس خاندان سے ملی تو اندر سے ایک رعب بیٹھ گیا۔ وہ سب بڑے پڑھے لکھے لوگ تھے اور میں سادی دیہاتن مائی۔ بس ایک بات اچھی تھی کہ پڑھ لکھ کر بھی ان میں سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔ لڑکی بھی بھلے پڑھی لکھی تھی، نوکری کرتی تھی لیکن باپردہ تھی۔ وہ میرے بیٹے کے سامنے نہیں آئی۔ الٹا میں اسے دیکھنے اندر اس کے کمرے میں گئی تھی۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ اور معصومیت تو اتنی تھی چہرے پہ کہ میرا دل کیا اس کی بلائیں لے ڈالوں۔ دل اتنا مطمئن تو ہو گیا کہ عمر کا اس سے کوئی معاملہ نہیں تھا کیونکہ وہ ایک پردہ دار لڑکی تھی۔ وہ تو بس ایک پڑھی لکھی اور نوکری پیشہ بیوی چاہتا تھا اور بس۔

وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے نہ صرف بات پکی کر ڈالی بلکہ تاریخ لے کر ہم گھر بھی آ گئے۔

"شکریہ اماں۔ آپ نے میری خواہش کا مان رکھا۔" عمر میرے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگانے لگا تو میرا دل سرشار ہو گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ انکار کی کوئی وجہ نہ تھی۔ پڑھے لکھے، خاندانی اور سادہ سے لوگ تھے۔ مجھے ہاں کرتے ہی بنی۔

دو مہینے بعد عمر کی شادی تھی تو میں نے گاؤں آ کر تیاریاں شروع کر دیں۔ میں جب عمر کو فون پہ بتاتی کہ میں نے اس کی بری میں رکھنے کے لیے صابن دانی، سرمہ دانی، کنگھیاں، پراندے خرید لیے ہیں تو وہ ہنس دیتا۔ میں پوچھتی کہ وہ کیوں ہنستا ہے تو وہ کہتا۔

"کچھ نہیں اماں۔ جیسے آپ خوش۔" یہ بات تو مجھے بعد میں پتا چلی کہ وہ اس لیے ہنستا تھا کہ شہری پڑھی لکھی لڑکیاں کہاں یہ سب استعمال کرتی ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں تو گاؤں میں یہ سب بری میں رکھنے کا رواج تھا۔

عظمیٰ بیاہ کر سیدھی عمر کے فلیٹ میں ہی آئی۔ حالانکہ میرا بڑا دل تھا کہ وہ میرے گاؤں آئی، میں سب سے ملواتی اسے لیکن عمر نے منع کر دیا۔ اس نے تو اپنے ماموں کے علاوہ کسی کو بارات پہ بھی نہیں بلانے دیا حالانکہ میری اتنی بڑی برداری تھی جو سب ناراض ہو رہے تھے۔ اب گاؤں کی بھری پری برادری میں ایسا تھوڑا ہی ہوتا ہے، سب کا آنا جانا ملنا ملانا لگا ہوتا ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ ولیمہ ہم گاؤں میں ہی کریں گے۔

ولیمہ اگلے ہفتے گاؤں میں، میں نے اپنے طریقے سے ہی کیا تھا۔ ساری برادری کو بلوایا۔ آخر میرا اکو اک پتر تھا۔ گاؤں کی ساری عورتیں نازک سی عظمیٰ کو ہاتھ لگا کر یوں دیکھتیں کہ کہیں وہ میلی تو نہیں ہو گئی۔ سچ یہ تھا کہ سب بڑا مرعوب ہوئیں کہ فرزند کی بہو بڑی میم اور سوہنی ہے، اور میرا کلیجہ اندر سے یہ بڑا ہوتا رہا کہ ایک بہو بھی میں چن کر لائی ہوں کہ واہ واہ ہو رہی ہے۔

ولیمے کے اگلے روز شام کو ہی بہو بیٹا دونوں شہر واپس چلے گئے اور میرا ویڑا خالی ہو گیا۔

☆☆☆

عمر کی شادی کے بعد میرا گاؤں میں دل نہیں لگتا تھا حالانکہ سب ہی تو موجود تھے۔ لیکن مجھ سے اب اکیلے کام نہیں ہوتا تھا۔ دل کرتا تھا کہ بہو آ گئی ہے تو کچھ خدمت کوئی میری بھی کرے۔ میں نے

www.pklibrary.com

سوچ لیا کہ مجھے عمر کے پاس شہر جا کر رہنا چاہیے۔

سامان باندھ کر میں نے عمر کو فون ملا دیا کہ مجھے لے جائے۔ وہ اگلے ہفتے ہی مجھے لینے آ گیا۔

عمر کا فلیٹ تو سامان سے بھرا پڑا تھا۔ میری ہمت نہیں ہوئی پوچھنے کی یہ سامان سارا بہو کا تھا یا عمر نے خود بھی کچھ بنایا تھا۔ بہر حال ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وہ وہ چیزیں جو وہاں گاؤں میں، میں نے نہیں دیکھی تھیں نہ ہی مجھے استعمال کرنا آتی تھیں۔ لیکن فلیٹ تھا بالکل بند ڈبا، جہاں میرا سانس رکتا تھا۔ میں ہر وقت کرسی ڈال کر باہر بالکونی میں بیٹھی ہوا کھاتی، نیچے آتے جاتوں کو دیکھتی رہتی۔ گاؤں کے کھلے ڈلے گھر کی جو عادت تھی مجھے۔

بہو سارا دن نوکری پہ ہوتی۔ واپس آتی تو چپ چاپ بجھی تھکی ہاری صورت لے کر کچن میں گھس جاتی۔ سارا کچن کا کام کرنے کے بعد وہ اپنا کمپیوٹر (لیپ ٹاپ) گود میں رکھ کر کام کرنے لگتی۔ میرا بڑا دل کرتا کہ وہ مجھ سے باتیں کرے لیکن اس کے پاس ٹائم کہاں تھا۔ کوئی بات کرو۔ بس ہوں ہاں۔ کسی رشتے دار کی بات بتاؤ تو سر ہلا دیا۔ اچھا کہہ دیا۔ نہ مسکراتی نہ میری طرف دیکھ کر مزید کچھ پوچھتی جیسے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔ لو بھلا یہ کیا بات ہوئی کیا میں وہاں دیواروں سے بات کرنے آئی تھی۔ عمر سے شکایت کی تو وہ مجھے ہی سمجھانے لگا۔

"اماں! وہ نوکری کرتی ہے۔ واپس آ کر لیپ ٹاپ پہ ایک اور نوکری کرتی ہے۔ پھر گھر کا سارا کام بھی وہی دیکھتی ہے۔ صبح سے آپ کے سامنے شروع ہوتی ہے اور رات تک لگی رہتی ہے۔ اسے کہاں کسی چیز کا ہوش ہوتا ہے۔" بیٹے کی ایسی طرف داری مجھے زہر ہی لگتی تھی۔

"تو کس نے کہا دو دو نوکریاں کرے؟"

"اماں مہنگائی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ کو کیا پتا کہ ہم کیسے گزارا کر رہے ہیں۔ میری تنخواہ میں پورا نہیں پڑتا اسی لیے اب وہ دوسری نوکری بھی کر رہی ہے۔" میں نے منہ بنا لیا۔ سب فضول باتیں لگتیں کیونکہ میں نے کبھی نہ نوکری کی نہ گھر چلایا۔ بیوگی سے پہلے عمر کے ابا، بیوگی کے بعد بھائی۔ گھر چلانے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ سب ہاتھ بڑھانے پہ مجھے مل جایا کرتا۔ ایسے میں بہو کی نوکری کرنا، گھر چلانا مجھے کہاں سمجھ میں آتا تھا۔

☆☆☆

بہو مجھے کسی طرح بھی نہیں بھاتی تھی لیکن اس کی کمائی سے آئی چیزوں کو میں نے خوب استعمال کیا۔ سارا سارا دن ٹی وی دیکھنا، اس کے فرنیچر پہ ٹھسے سے بیٹھنا، اس کی استری، اوون چلانا سب پسند تھا بس وہی سب سے بری لگتی تھی۔

میرا گاؤں اور شہر کے درمیان آنا جانا لگا رہتا تھا۔ گاؤں میں اپنے کام خود کرنے پڑتے۔ یہاں شہر میں سب کرا کرایا مل جاتا۔ پھر بھی بہو مجھے نہیں پسند تھی۔

عمر مجھ سے پہلے جیسا اچھا تھا۔ پہلے جیسا پیار کرتا، محبت جتاتا لیکن جب وہ اس کے لیے پرواہ دکھاتا تو مجھے عمر نہیں بہو ہی بری لگتی۔ پہلے جس بیٹے کی محبت پہ پورا اختیار میرا تھا اب وہ شریکا بن گئی تھی تو مجھے کیسے اچھی لگ سکتی تھی۔ جب جب میں اسے عمر کے گھر میں چلتا دیکھتی میرے سینے پہ سانپ لوٹنے لگتے۔ ہم ماؤں کو بیٹے کی شادی کا ارمان بھی بڑا ہوتا ہے اور بہو سے عناد بھی۔ کیا کریں رشتہ ہی ایسا ہے اب۔

ایک دن جب وہ نوکری سے واپس نہیں آئی تھی تو میں نے عمر سے کہہ دیا۔

"مجھے یہ لڑکی نہیں پسند۔ تو اسے چھوڑ دے۔"

عمر ہکا بکا میری شکل دیکھنے لگا۔

"اماں وہ میری بیوی ہے۔ ایسے کیسے چھوڑ دوں۔ پھر اس نے کیا کیا ہے۔ چپ چاپ اپنا کام کرتی ہے۔ آپ سے تو کبھی اونچی آواز میں بات بھی نہیں کی۔ نجانے آپ کو وہ کیوں پسند نہیں ہے۔"

"چپ چاپ رہتی ہے کیونکہ مجھ سے بات کرنا اسے پسند نہیں۔ میٹھی نہیں کی۔ سارا سارا دن پتا

www.pklibrary.com

نہیں کون سا کام کرتی ہے آفس میں، اس کمپیوٹر پہ اور تجھے بھی آگے لگایا ہوا ہے۔ میرے بیٹے کو قابو میں کر لیا اس میسنی نے۔ کسی سے ملنا ملانا اسے پسند نہیں۔ اتنی بڑی ہماری برادری، کسی کو فون تک نہیں کرتی۔ سارے تھو تھو کرتے ہیں کہ فرزند کی بہو تو اس کے بیٹے کو لے کر ایک طرف ہو گئی۔ خاندان سے کٹ گیا ہے عمر۔ دو سال گزرنے کو ہیں، ابھی تک کوئی خیر کی خبر تک نہیں سنا سکی۔ کیا فائدہ ایسی عورت کا جو گھر میں ایک ننھا منا سا کھلونا نہ دے سکے۔"

عمر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"بس اسے چھوڑ۔ میں کوئی اور ڈھنگ کی لڑکی لاؤں گی اور اس بار تو نے میری نہ سنی نا تو میں سچ بتا رہی ہوں ساری زندگی میرا منہ دیکھنے کو ترس جائے گا۔ میری ہائے لگے گی تجھے۔" عمر نے دونوں ہاتھوں سے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مجھ سے پیچھے کھڑی اعظمیٰ کو۔ اس کی رنگت بدلی کہ اعظمیٰ سب سن چکی تھی۔ میری بلا سے سنتی رہتی۔ مجھے کیا پرواہ تھی۔

وہ سلام دعا کیے بغیر غصے سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ عمر اس کے پیچھے گیا۔ مجھے مزید غصہ آ گیا۔

"جورو کا غلام۔"

گھنٹے تک اعظمیٰ اپنا سامان باندھ کر جا رہی تھی۔ عمر اس کی منتیں کر رہا تھا۔ میں بیٹھی غصے سے کھول رہی تھی کہ جاتی ہے تو جائے۔ نجانے عمر کو کیا پڑی اس کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑنے کی۔ پڑھی لکھی لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، ذرا کسی نے کچھ کہا نہیں اور چل پڑی ہیں اپنے میکے۔ ہمارے گاؤں میں تو عورت کو مرد جوتیاں بھی مارے تو بھی وہ اسی سے بندھی رہتی ہے۔

"اماں! اعظمیٰ کو روکیں پلیز۔" عمر میرے قدموں میں بیٹھ کر منت کرنے لگا۔ میں نے دفع کرنے والے انداز میں ہاتھ جھٹکا۔ روکتی تھی اسے میری جوتی۔

"جانے دے۔ میں اتنی اچھی لڑکی لاؤں گی تیرے لیے کہ سب بھول جائے گا۔" عمر اس کے پیچھے لپکا جو دروازے سے باہر جا چکی تھی۔

اعظمیٰ چلی گئی اور میرا بیٹا بستر سے لگ گیا۔

"کیا کمی تھی اس میں اماں۔؟ کبھی اس نے آپ کے خلاف کوئی بات مجھ سے نہیں کی۔ کوئی شکایت نہیں کی۔ سارا گھر سنبھالتی تھی۔ کمائی تھی۔ اس گھر پہ، ہم پہ خرچ کرتی تھی۔ کیا کمی تھی اس میں۔؟ سادہ مزاج، خاموش طبع لڑکیاں کہاں ملتی ہیں، لوگ ترستے ہیں ایسی بہوؤں کو۔ لیکن آپ کو اس سے نجانے کیوں چڑ ہو گئی۔"

جب میں اسے کچھ کھلانے کی کوشش کرتی وہ کھانا کھانے کے بجائے مجھ سے یہی سب پوچھتا رہتا۔

گھر کا سارا کام اب مجھے کرنا پڑ رہا تھا جو مجھے بڑا مشکل لگ رہا تھا۔ چلو جب نئی بہو آ جائے گی تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں خود کو تسلی دیتی۔ لیکن نئی بہو تو تب آتی جب پچھلی بیٹے کی زندگی سے جاتی۔ وہ اسی کا روگ لگا کر بیٹھا ہوا تھا۔

مہینہ ختم ہونے سے پہلے راشن ختم تھا۔ عمر سے کہا تو اس نے اپنا خالی بٹوا سامنے کر دیا۔

"راشن اعظمیٰ ڈلواتی تھی۔ میں کہاں سے کروں؟" میں چپ کی چپ رہ گئی۔

"بجلی کا بل کیوں اتنا زیادہ آتا ہے۔ اتنی تو بجلی ہم استعمال بھی نہیں کرتے جتنا بل آ رہا ہے۔ آج بھیجا ہے بل اور پرسوں آخری تاریخ بھی ہے۔ جمع کروا دینا۔" میں نے بل سامنے میز پہ رکھا۔

"بل اعظمیٰ جمع کرواتی تھی۔ مہینے کے آخر میں میرے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ تنخواہ آنے میں ابھی بہت وقت ہے۔"

"تو اس کے پاس کہاں سے خزانے آتے تھے۔ جو چیز پوچھو۔ اعظمیٰ کرتی تھی۔ سب وہی کرتی تھی تو تو کیا کرتا تھا؟ تو کیا کماتا تھا؟" میں پھٹ پڑی۔

"میں بس اس فلیٹ کا کرایہ اور پیٹرول پورا کر لوں اماں وہی بہت ہے۔ باقی سب اعظمیٰ کرتی

www.pklibrary.com

تھی۔ تبھی تو اسے دو دو نوکریاں کرنا پڑتی تھیں۔" میرا تو ذہن ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ یہ کیا حساب کتاب تھا مجھے نہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"سوچ رہا ہوں اعظمی کا سامان اسے واپس بھیج دوں۔ جب وہ چلی گئی تو اس کا سامان ہم کیوں رکھیں۔" عمر کی بات پہ میں اچھل پڑی۔

"تو ہم کیا کریں گے پیچھے۔؟" میں نے بھرے پرے گھر کو دیکھا۔

"میں واپس اسی دوست کے فلیٹ پہ اور آپ گاؤں جائیں گی۔" گاؤں کا سوچ کر مجھے ہول اٹھنے لگے۔ وہاں ایسی سہولیات کہاں تھیں جو اس گھر میں تھیں اور اتنے مہینے رہ کر مجھے ان سہولیات کی عادت ہو گئی تھی۔

"تو دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتا۔؟" اس بات پہ وہ نہیں آتا تھا۔

رات پوری میں نے سوچ سوچ کر گزاری اور صبح ناشتے کی میز پہ مجھے کہنا پڑا۔

"آفس سے واپسی پہ بہو کو لے آنا۔" عمر حیران ہوا۔

"مگر آپ تو کہتی تھیں کہ وہ آپ کو پسند نہیں۔ آپ اپنی مرضی سے بہو لائیں گی۔"

"مجھے تیری خوشی پیاری ہے۔" عمر میرے گلے لگ گیا۔ وہ خوش تھا اور میں بھی کچھ کچھ خوش ہی تھی۔

سچ بات بتاؤں تو گھر کا سارا انظام بہو چلا رہی تھی اور کیا اچھے سے چلا رہی تھی۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا کام کرنے کا دم نہیں تھا جتنا وہ کر لیتی تھی۔ اس کی دو نوکریوں کی کمائی کتنے خرچے پورے کر رہی تھی یہ مجھے اس کے جانے کے بعد پتا چلا۔ میں کوئی دوسری لڑکی لے بھی آتی تو یہ تمام خرچے کون پورے کرتا۔ عمر کی تنخواہ کی حقیقت تو میرے سامنے تھی کہ وہ کتنا کر سکتا تھا۔ پھر کیا پتا نئی بہو چرب زبان ہوتی۔ میرے خلاف عمر کو پٹیاں پڑھاتی اور مجھے نکال باہر کرتی تو کیا پھر میں تیسری بہو لاتی۔ کچھ دل میں نے مارا اور مان لیا کہ بہو اتنی بری نہیں تھی جتنی مجھے لگتی تھی۔ مجھے اس کی قدر تب آئی جب وہ یہاں نہیں تھی۔

☆☆☆

گاڑی میں سامان رکھتے خوشی خوشی عمر ہنستے ہوئے اعظمی سے کہہ رہا تھا۔

"اگر یہ چھوٹا سا ڈرامہ نہ کیا ہوتا تو اماں کو کہاں سے تمہاری قدر آتی۔؟ دیکھ لو میں نے کہا تھا نا کہ کچھ دن کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اعظمی بھی ہنس دی۔

اس دن اماں کی باتیں سن کر اسے برا لگا تھا اور وہ روہانسی ہو کر کمرے میں گئی تو عمر بھی اس کے پیچھے گیا۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگیں۔

"اماں پرانے خیالات کی ہیں۔ انہیں گھر بیٹھی، برائیاں کرتی، سارے خاندان میں آتے جاتے ملتے ملانے والی بہو درکار تھی اور تم ایسی نہیں ہو تو انہیں برا لگتا ہے۔"

"کیا یہ سب کرنا ہم افورڈ کر سکتے ہیں۔ میں کتنی ذمہ داریاں اٹھا رہی ہوں تم جانتے ہو۔ اس مہنگائی میں ہم کیسے محنت کر کے اپنا سرکل چلا رہے ہیں یہ ہمیں ہی پتا ہے۔" عمر سمجھتا تھا لیکن اماں کو کیسے سمجھاتا۔

"میرے پاس اس مسئلے کا بھی حل ہے کہ تم کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلی جاؤ۔ جب سب کچھ اماں کو دیکھنا پڑے گا تو اماں کو خود احساس ہو جائے گا کہ تم اس گھر کے لیے کیا ہو۔" اعظمی نے کچھ سوچ کر سر ہلا دیا۔ یوں دونوں کی پلاننگ سے اعظمی اپنے میکے چلی گئی اور پیچھے جو کچھ اماں کے سر پہ پڑا تو انہیں لگ پتا گیا کہ بہو اتنی بری نہیں جتنا وہ سمجھتی تھیں۔

عمر نے گاڑی میں بیٹھ کر اعظمی کو چھیڑا۔

"تیری یاد آئی، تیرے جانے کے بعد۔ تیری یاد آئی۔" اعظمی بھی کھلکھلا کر ہنس دی۔

دونوں کی تھوڑی سی سمجھداری نے ان کا گھر بچا لیا تھا۔

☆☆

www.pklibrary.com

عقیلہ ہاشمی

ایک لمحہ جاوداں

مکمل ناول

تیز ہوا لمبے ستونوں سے لپٹی رنگون بیل کے زرد پتوں کو ٹھراتی گزر رہی تھی۔ محراب دار برآمدوں میں لگے بھاری پردے ہوا کے دوش پر لمبی اڑان بھر رہے تھے۔

دوپہر ڈھلتے بادل سارے آسمان پر چھا گئے تھے۔ خورشید میاں سویرے یوں ڈرتے ڈرتے بادلوں کی اوٹ سے جھانک کر غائب ہو گئے تھے مانو کوئی چور نقب لگانے سے پہلے حالات کا جائزہ لینے کی خاطر دائیں بائیں جھانک کر تسلی کر لے اور حالات موافق نہ پا کر چھپے رہنے میں ہی عافیت جانے۔

اصلی صندل کے منقش جھولے پر بیٹھی وزیر بیگم (اماں بی) الطاف صاحب (شوہر) کی راہ تک رہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ فخر النساء (بڑی بہو) تخت پر پان دان کھولے سردی سے سکڑی بیٹھی تھی۔ سرد ہوا کمرے کے کونوں کھدروں میں گھسی جا رہی تھی۔

وہ تو بھلا ہو کونے میں جلتے ہیٹر کا جس نے کمرے کو تھوڑا گرما ڈالا تھا۔ ہیٹر کے آگے بیٹھی کشور (فخر النسا کی بیٹی) ان دونوں سے بے نیاز سفید چادر پر لگے فریم پر جھکی پورے انہماک سے پھول کاڑھ رہی تھی۔ آنے والے دنوں میں اس کی شادی ہونے والی تھی۔ وہ سارا دن آنکھوں میں بدثر (منگیتر) کے سپنے سجائے اردگرد سے لاپروا ریشمی دھاگوں میں الجھی مستقبل کے خواب سجاتی رہتی۔ جھولے کی مسلسل ہلتی زنجیریں اماں بی کی بے تابی کی عکاسی کر رہی تھیں۔ ان کی نگاہیں داخلی دروازے پر ٹکی تھیں۔ ظہر کی نماز کا وقت کب کا ختم ہو چکا تھا الطاف صاحب ابھی تک نماز پڑھ کر گھر نہ لوٹے تھے۔

"اللہ خیر کرے۔ تمہارے میاں جی ابھی تک مسجد سے نماز پڑھ کر واپس نہیں آئے؟" وہ فخر النسا کی طرف دیکھتے ہوئے فکرمندی سے بولیں۔

"فکر کیوں کرتی ہیں۔ میاں جی اب کوئی دودھ پیتے بچے تو نہیں کہ کہیں کھو جائیں گے۔" اس نے پاندان میں جھانکتے ہوئے بے خیالی میں جواب دیا۔

ساس کا اس عمر میں شوہر پر محبت نچھاور کرنا اسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ہر وقت انہیں پلو سے باندھ کر ساتھ لیے پھرتیں۔ نیا پان بناتے ہوئے وہ جل کر بولی۔

"نماز کے بعد سرفراز چچا کی دکان پر چلے گئے ہوں گے۔ دونوں بھائی تنہائی میں ایک دوسرے کو حال دل سنا رہے ہوں گے۔ سرفراز چچا کو بھی کبھار دل کا غبار نکالنے کا موقع ملتا ہے گھر میں تو بیگم کے آگے ان کی ایک نہیں چلتی۔" جتنی تیزی سے اس کی زبان چل رہی تھی اتنی ہی تیزی سے پان تیار کر کے ان کے سامنے پلیٹ میں رکھ دیا۔ اپنے تئیں وہ انہیں یہ جتا گئی کہ میاں جی (سسر) کو بھی بھائی سے راز و نیاز کر لینے دیجیے۔ ایک سرفراز چچا ہی نہیں میاں جی بھی اس موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں اگر آپ انہیں پلو سے آزاد کریں تو۔

اس کی بات سن ان کے چوڑے ماتھے پر شکنیں

www.pklibrary.com



pklibrary.com

www.pklibrary.com

نمودار ہو گئیں جس کی زبان قینچی کو مات دیتی تھی، لیکن ان کا نام بھی وزیر بیگم تھا۔ ایک صرف گھر پر ہی نہیں لوگوں پر بھی ساری زندگی راج کیا تھا جھٹ سے اس کی بات کاٹ ڈالی۔

"فخر النسا! بھی تو سیدھی بات کر لیا کر، میں سوچ رہی ہوں شہر کے حالات کچھ اچھے نہیں چل رہے۔ آئے دن مسجدوں میں بم دھماکے ہوتے رہتے ہیں اور تو اپنی ہی کہے جا رہی ہے۔ اللہ نہ کرے تم لوگ سرفراز کی دکان کا گمان کیے بیٹھے رہو اور معاملہ کچھ اور ہی نکلے۔ میرے منہ میں خاک۔"

پلیٹ میں رکھے پان کو اٹھا کر منہ میں رکھتے ہوئے انہوں نے برا سا منہ بنایا۔

پتا نہیں اب یہ اس کے لہجے کی کڑواہٹ کا اثر تھا یا پھر دیور کی طرف سے بدگمانی ذہن میں آئی تھی بڑی بی کے، فوراً اشرف (ملازم) کو سرفراز میاں کی دکان پر روانہ کرنے کا خیال آیا۔ ہیٹر کے پاس بیٹھی کشور کی طرف رخ موڑے بولیں۔

"کشور! اٹھ، اور، ذرا جا کر اشرف کو دیکھ۔ کہنا اماں بی کہہ رہی ہیں جا کر سرفراز میاں کی دکان پر میاں جی کا پتا کر کے آئے۔"

اس کی ساری توجہ ہرے پیلے، لال دھاگوں پر لگی تھی دادی کی آواز اس کی سماعتوں پر گراں گزری تھی۔

"پریشان کیوں ہوتی ہیں۔ وہ کون سا پہلے دن لیٹ ہوئے ہیں۔ اکثر ہی دیر سویر ہو جاتی ہے......"

فریم پر جھکے اس کی طرف سے صاف گوئی سے جواب آیا۔ "میاں جی آتے ہی ہوں گے۔ اشرف ابھی آدھے راستے میں پہنچے گا اور وہ گھر پہنچ جائیں گے۔"

یہ تو روز کا قصہ تھا جو گھر کا بچہ بچہ جانتا تھا۔ بے چارے اشرف کی آئے روز دوڑ لگی رہتی۔ اماں بی اسے سرفراز میاں کی دکان کی طرف دوڑا دیتیں اور میاں جی گھر پہنچ جاتے۔ فخر النساء تو کہتی تھی اماں آپ میاں جی کے لیے ایک ملازم اور رکھ لیں جو چوبیس گھنٹے صرف آپ کو ان کی اطلاع دیتا رہے۔ اشرف کو تو گھر کے اور کام بھی کرنے ہوتے ہیں۔

تب وزیر بیگم تنک کر جواب دیتیں۔

"ہاں اور اس ملازم کو تنخواہ تم دے دینا۔"

کشور کی بات سن وہ منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

"تیرے پاس بھی ماں کی طرح پہلے سے گھڑا ہوا جواب موجود ہوتا ہے۔ انکار کے سو بہانے۔ اور یہ وحیدن (ملازمہ) بھی نظر نہیں آ رہی۔ کہیں گئی ہے کیا؟" اس کی طرف سے مایوس ہو کر اب انہوں نے وحیدن کی تلاش میں کھلے دروازے سے باہر نظر دوڑائی۔

سارا آنگن پتوں سے اٹا پڑا تھا۔ مرغیاں ڈربے سے باہر دندناتی پھر رہی تھیں۔ اور وحیدن کی کوئی خبر نہ تھی وہ سویرے سے کہیں غائب تھی۔

"جانا کہاں ہے کام چور نے، اوپر جا کر کوئی کونا آرام کے لیے ڈھونڈ لیا ہو گا یا پھر پڑی ہو گی فردوس (چھوٹی بہو) کے قدموں میں، دونوں سر جوڑے کر رہی ہوں گی زمانے بھر کی برائیاں۔" فخر النسا نے تخت پر پڑے پاندان کو تھوڑا سرکا کر کمر سیدھی کرتے ہوئے اندازہ لگایا۔

"ایسا بھی ہو نہیں سکتا تھا وہ دونوں اکٹھی بیٹھی ہوں اور کسی کی برائی نہ ہو رہی ہو۔"

فردوس کی طرف سے اسے جو خطرات لاحق تھے وہ نا چاہتے ہوئے بھی زبان پر جاری ہو جاتے۔

وزیر بیگم اس کی بات سن کر چپ نہ رہ سکیں۔

"بے شک کسی کی برائی کرنے والے کا ٹھکانا جہنم ہے بہو رانی۔ اللہ پاک سب کو ہدایت دے۔ وحیدن کی تو شروع سے لگائی بجھائی کی عادت ٹھہری۔ کام وام اب اس سے ہوتا نہیں۔ اور جہاں تک فردوس کی بات ہے اس نگوڑی کے تو رات سے سر میں درد ہو رہا ہے ثقلین میاں (چھوٹا بیٹا) رات ڈاکٹر سے دوا لے کر آئے تھے۔"

اسے وحیدن اور فردوس کے بارے میں بدگمان ہوتا دیکھ کر انہوں نے فوراً بات کی وضاحت کر دی۔ ان کا اپنا دل آئینے کی طرح صاف تھا

www.pklibrary.com

دوسروں کے بارے میں کبھی بدگمان نہ ہوتی تھیں اور نہ کسی کی برائی سنتی تھیں۔

ساس کی بات ہمیشہ کی طرح سیدھی اس کے سینے پر جا کر لگی تھی۔ پیٹھ پیچھے بھی فردوس کی برائی نہیں سن سکتی تھیں۔

"بس رہنے بھی دیں اماں، سب جانتی ہوں میں وہ ٹھہری آپ کا خون، اس کی بات آپ کب برداشت کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ وحیدن کا بھی پوری طرح دفاع کرتی ہیں بھلے وہ سارا دن محلے میں گزار کر آ جائے۔"

اسے روز اول سے ان سے گلہ تھا وہ فردوس کی برائی نہیں سنتی تھیں۔ بھتیجی جو ٹھہری۔ وہ سارا دن کام کر کے تھک جاتی پر کبھی اس کے لیے تعریف کے دو لفظ زبان سے نہ نکلتے۔

"توبہ ہے میری، تم سے تو بات کرنا بے کار ہے فخر النساء۔" انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگاتے توبہ کی۔ "خواہ مخواہ میں بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔"

کھلے دروازے سے اسی وقت بشریٰ (فخر النسا کی بہو) روتے ہوئے عثمان کو گود میں لیے اندر چلی آئی، اسے دیکھتے اس کی زبان پر آئے الفاظ رک گئے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ ان کی بات اتنی آسانی سے ہضم نہ ہونے دیتی وہ تو بشریٰ کی حیا کر گئی اس کے سامنے اگر ساس سے زبان لڑائی تو ڈر تھا وہ بھی اس پر وہی فارمولا نہ استعمال کر ڈالے۔ کھسیانی سی ہو کر کشور کو دیکھ کر رہ گئی۔ تب ہی بشریٰ کے پیچھے پیچھے الطاف صاحب کمرے میں اندر داخل ہوئے۔

"یہ اشرف کو کہیں بھیجا ہے کیا؟۔ گھر کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ اور موصوف خود کہیں غائب ہیں......" ہاتھ میں پکڑی چھڑی کا سہارا لیے وہ چلتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان پر نظر پڑتے وزیر بیگم کے چہرے پر رونق لوٹ آئی۔ "کوئی بھی چور آ چکا منہ اٹھا کر اندر داخل ہو جائے۔" قریب پڑی خالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ ان سب پر برس پڑے جیسے اشرف کے غائب ہونے میں انہی کا قصور ہو۔

"انہیں کیا ضرورت ہے بھئی کسی سے پوچھنے کی۔ ۔ایک اشرف ہی نہیں یہاں سب آزاد ہیں۔ جس کا جب دل چاہتا ہے منہ اٹھا کر چلا جاتا ہے۔"

صبح سے وحیدن بھی کہیں غائب تھی۔ وزیر بیگم کو کیا خبر کون کہاں گیا تھا شوہر کی بات سن کر انہوں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

"ابا میاں! آپ کے لیے کھانا لاؤں؟"

سسر کو بیٹھتا دیکھ کر فخر النسا فوراً تخت سے اٹھ کھڑی ہوئی جانتی تھی اب اشرف اور وحیدن کے بعد بہت جلد بات بہوؤں پر آ کر ٹھہرنے والی تھی۔ اس لیے یہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت تھی۔

☆☆☆

وہ نہا کر غسل خانے سے باہر آیا تھا۔ تولیے سے گیلے بالوں کو رگڑتا سنگھار میز کے سامنے آ گیا۔ گیلے بالوں میں کنگھی کرتے اس کی نظر کھڑکی سے پرے روشن اور چمک دار صبح پر پڑی تھی۔ وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ کئی دنوں کے بعد آج آسمان پر سورج نمودار ہوا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے رچی ہوا کمرے میں خوش گواریت کے احساس کو بڑھاوا دے رہی تھی۔

گھر کا آنگن فردوس چچی کے ہاتھ کے بنے پراٹھوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر نیچے آیا تو ہمیشہ کی طرح اماں بی مسکراتے چہرے کے ساتھ تخت پر بیٹھی تھیں۔ سرما کی دھوپ برآمدے کے لمبے ستونوں پر اتر آئی تھی۔ وحیدن مرغیوں کو دڑبے سے باہر نکال کر دانہ ڈال رہی تھی۔ صحت مند اور توانا مرغیوں نے چاروں اور سے اسے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ میاں جی تخت کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ ابو جان (سبطین رضا)، فضل بھائی اور ثقلین چچا ناشتا کر رہے تھے۔

ان تینوں کا کاروبار ایک تھا۔ سونے جاگنے کے اوقات بھی ایک سے تھے۔ کپڑے کی جو چھوٹی سی دکان الطاف صاحب نے کسی زمانے میں شروع کی تھی وہ ان دونوں بھائیوں کی محنت سے اب پھیل

www.pklibrary.com

کر چاروں کانوں پر محیط ہو چکی تھی۔ فضل (سبطین کا بڑا بیٹا) پڑھائی میں کمزور تھا دوبار میٹرک میں فیل ہوا تو میاں جی نے پڑھائی سے اٹھا کر دکان پر بیٹھا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن ماشاءاللہ سے اب تو وہ باپ اور چچا سے بھی اچھی دکان داری سیکھ چکا تھا۔

"السلام علیکم" اس نے آگے بڑھ کر ایک ساتھ سب کو سلام کیا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔ مولا کریم لمبی زندگی عطا کرے۔" اماں بی نے سب کی طرف سے مشترکہ جواب دے کر اسے پاس بٹھالیا اور کشور کو آواز دی۔

"کشور! چھوٹے بھائی کے لیے بھی ناشتا لے آؤ۔"

اماں بی روزانہ اپنے بیٹوں اور پوتوں کو اپنی نگرانی میں ناشتا کروا کر اپنی دعاؤں کے سائے میں گھر سے رخصت کرتی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں کشور اس کے سامنے رکھی میز پر گرم گرم پراٹھا اور آملیٹ رکھ چکی تھی۔ وہ سر جھکا کر ناشتا کرنے لگ گیا۔

وزیر بیگم قریب بیٹھی بیٹوں اور پوتوں کو ایک ساتھ دیکھ کر دل ہی دل میں ان کی نظر اتار رہی تھیں۔ اللہ پاک کا جتنا بھی شکر ادا کرتیں کم تھا۔ خدا نے صحت و تندرستی کے ساتھ فرماں بردار بیٹے عطا کیے تھے۔ وہ اگر صبح کو شام کہہ دیتیں تو سبطین اور ثقلین (بیٹے) کی جرات نہ تھی ان کی بات سے اختلاف کر جاتے۔ دونوں بہویں (فخر النساء اور فردوس) بھلے سارا دن ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتیں لیکن جہاں وہ کھڑا کر دیتیں وہیں ان کی شام ہو جاتی۔ سبطین کے بچے (فضل، کشور، ہاشم) اور ثقلین کی بیٹی (افشاں) دادی دادا کی زندگیوں کا محور تھے۔ سب کو ناشتا کرتا دیکھ کر ان کی نگاہیں افشاں کو ڈھونڈنے لگیں۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"افشاں چلی گئی کالج؟" کشور میاں جی کا ناشتا لائی تو انہوں نے پوچھا۔

وہ باورچی خانے کی کھلی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ دادی کی آواز سن کر وہیں سے جواب دیا۔ "نہیں اماں۔ ابھی میں گھر پر ہی ہوں۔"

گرم پراٹھے پر اچار رکھے ساتھ چائے کا کپ لے کر وہ باورچی خانے میں ناشتا کر رہی تھی۔ کالج جانے کا وقت ہو رہا تھا تب ہی باہر دروازے سے رکشا رکنے کی آواز ابھری ساتھ ہی ڈیوڑھی سے اشرف نے آواز دی۔

"افشاں بیٹیا! منور رکشا لے کر آ گیا ہے۔"

چائے کا کپ وہیں چھوڑ کر وہ بیگ لینے کمرے میں چلی آئی۔ بیگ لے کر جب وہ سب کو سلام کرتی برآمدے کا زینہ اتر رہی تھی تو وہ ناشتا ختم کر کے اٹھ گیا۔ یونیورسٹی کی بس آنے میں دس منٹ رہ گئے تھے۔ گھر سے بس اسٹاپ کا یہ پیدل سفر اسے دس منٹ میں طے کرنا ہوتا تھا۔

☆☆☆

وہ کچھ دیر پہلے صائمہ (بیٹی) کو اسکول سے لے کر آئی تھی۔ اس کا اسکول کوئی ایسا دور نہ تھا دو گلیاں چھوڑ کر اسی محلے میں تھا۔ جانے کو وہ روز اشرف کے ساتھ آ جا سکتی تھی لیکن بچی تھی روز ضد پکڑ کے بیٹھ جاتی۔ امی مجھے آپ کے ساتھ اسکول جانا ہے، مجبوراً اسے گھر کے کام چھوڑ کر خود اسکول جانا پڑتا۔ عثمان (بیٹا) ابھی چھ ماہ کا تھا وہ اگر سویا ہوتا تو وہ چپ کر کے نکل جاتی ورنہ تو وہ بھی رونا شروع کر دیتا اور اسے اٹھا کر وہ اسکول تک جاتی، واپس آتے آتے گھر تک وہ بری طرح تھک چکی ہوتی۔

گھر آ کر اس نے صائمہ کو کپڑے تبدیل کروا کر کھانا دیا، اسی دوران عثمان فیڈر لے کر سو گیا تو کمرے کا دروازہ ہلکا سا بند کر کے وہ رات کے کھانے کی تیاری کے لیے باورچی خانے میں چلی آئی۔

بچوں والی عورت کے پاس کام کرنے کا اس سے بڑھ کر کوئی وقت نہیں ہوتا جب بچے سو رہے ہوں تو وہ جھٹ پٹ کام ختم کر لیا کرتی تھی۔ لیکن بچوں کے اوپر نیچے کی پیدائش نے اسے اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ ذرا سا کام کرتی تو سانس چڑھ جاتا۔

اس وقت وہ باورچی خانے میں آ کر ہانڈی میں گوشت چڑھا رہی تھی۔ لہسن ادرک پیاز امام دستے میں ڈال کر کوٹ رہی تھی جب فردوس باورچی

www.pklibrary.com

خانے میں چلی آئی۔

کیا بات ہے بشریٰ۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" پانی کے نل سے گلاس بھر کر مڑی تو اس کے چہرے پر چھائی زردی دیکھ کر رک گئی۔

وہ کئی دنوں سے دیکھ رہی تھی وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ گھر کے کاموں کے ساتھ بچوں کو سنبھالتے ہوئے اس کی صحت آدھی رہ گئی تھی۔

"ٹھیک ہوں پھوپھو۔ بس ذرا اسکول سے چل کر آئی ہوں تو تھکاوٹ سی محسوس ہو رہی ہے۔"

وہ فردوس کی سگی بھتیجی تھی۔ فخر بھابھی نے کبھی سیدھے منہ اس سے بات نہ کی تھی۔

"اس گھر میں کسی کو تمہاری پروا نہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں۔ سارا کام تمہاری ذمہ داری تو نہیں۔ بچوں کو سنبھالنا۔ گھر کا کام کرنا۔ پر نہیں بھا بھی تو پتا نہیں کس چیز کا بدلہ لے رہی ہے تم سے۔"

جیٹھانی کا اس کے ساتھ سلوک دیکھ کر وہ کڑھتی رہتی۔ کر کچھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے اختیار میں ہوتا تو کبھی بشریٰ کا رشتہ فضل سے نہ ہونے دیتی لیکن وہ مجبور تھی۔ فضل نے کسی کو موقع ہی نہ دیا تھا، اس کی محبت جیت گئی اور باقی سب ہار گئے۔ پانی پی کر وہ نیچے چوکی پر بیٹھ کر غصے سے شلجم کاٹنے لگ گئی۔

"میرا تو خون جلتا ہے تمہیں دیکھ کر۔ بھئی دشمنی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کر ہی لی تھی بیٹے نے اپنی مرضی تو کوئی قیامت تو نہیں آ گئی تھی۔ چار سال ہو گئے اس قصے کو بھول جاؤ۔ پر نہیں ان کی دشمنی تو قبر کی دیواروں تک چلے گی۔ نہ بچوں کی کوئی پروا نہ بہو کی کوئی قدر۔ اور فضل کا تو کام یہیں تک تھا وہ تو تمہیں گھر میں ڈال کر بھول ہی گیا ہے......" فردوس کا بس نہیں چلتا تھا جو سلوک اس کے ساتھ ہو رہا تھا وہ چاہتی تو روز اس بات پر فخر النسا سے ایک جھڑپ لے سکتی تھی۔ "شادی سے پہلے تو مرا جاتا تھا تمہارے لیے اور اب دیکھو کیسے سانپ سونگھ جاتا ہے ماں کو دیکھ کر۔ ساری بہادری اس وقت دکھا دی اب جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھتا۔"

وہ سبزی کاٹتے ہوئے فخر النسا کا غصہ بھی فضل پر اتار رہی تھی۔ جس کی وجہ سے یہ سب ہو رہا تھا۔ جب سے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی وہ بالکل افشاں (بیٹی) کی طرح اس کا خیال رکھتی تھی۔ بھلے اس کے اور فخر النسا کے تعلقات ہر لمحہ اتار چڑھاؤ کا شکار رہتے، وہ دونوں ماں بیٹی ہر وقت بشریٰ کی مدد کے لیے دل و جان سے تیار رہتیں۔ ساری سبزی کٹ چکی تو وہ چوکی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو تم کمرے میں جا کر آرام کرو۔ کھانا میں بنا لیتی ہوں۔"

"ارے نہیں پھوپھو، میں ٹھیک ہوں۔ آپ نے پہلے ہی اتنے سارے کام اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔"

ناشتے کی ذمہ داری، صفائی، برتن کوئی ایک کام بھی کبھی کسی اور نے پوری ذمہ داری سے نہ نبھایا تھا۔ فردوس سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ اسے اس سے شرمندگی محسوس ہوتی۔

"تم کب سے اتنی سیانی ہو گئیں۔ میں جو کہہ رہی ہوں جاؤ جا کر آرام کرلو۔"

"بچے سو رہے ہیں تو خود بھی آرام کر لینا چاہیے۔ کھانا میں بنا لوں گی۔" اس کے ہاتھ سے امام دستہ لے کر اس نے زبردستی اسے باورچی خانے سے باہر نکال دیا۔

اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ فردوس پھوپھو کی محبت ان کی شفقت پر دل و جان سے نچھاور ہوتی رہی۔ وہ جب سے اس گھر میں آئی تھی فردوس نے ہمیشہ اس کی مشکلوں کو آسانیوں میں بدلا تھا۔ بچے سنبھالنے سے لے کر گھر کے چھوٹے چھوٹے کام وہ ہر جگہ اس کا سہارا بنتی آئی تھی۔

☆☆☆

وہ زینہ پھلانگتی چھت پر آئی تھی۔ سردیوں کی مضمحل دھوپ منڈیروں پر الوداعی نشان چھوڑتی رخصت ہو رہی تھی۔ الگنیوں پر دھلے کپڑے سوکھ چکے تھے۔ وہ اپنی دھن میں کپڑے اتارنے آگے بڑھی۔ چھت کے اس کونے میں کرسی پر بیٹھے ہاشم کو

www.pklibrary.com

دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔

آج چھٹی کا دن تھا وہ صبح سے دھوپ میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ پہلے وحیدن کے ہاتھ اس کا دوپہر کا کھانا اوپر آیا پھر چائے کا کپ گیا، اس کے بعد مابدولت کے لیے مالٹوں کی ٹوکری چھت پر روانہ ہوئی۔ اماں بی اور میاں جی کا لاڈلا پوتا تھا اور سونے پر سہاگہ کامیابی سے تعلیم کے سارے مرحلے پار کرتا یونیورسٹی تک پہنچ چکا تھا۔ نخرے تو اٹھائے جانے تھے۔ اس کے گرداگرد پھیلے پھیلاوے پر نظر پڑتے اس نے افسوس زدہ ہو کر سوچا۔ مالٹوں کے چھلکوں اور کاغذوں کے ٹکڑوں کو دیکھتی وہ الگنی کی طرف بڑھی۔

اسے سر جھٹک کر کپڑے اتارتا دیکھ کر وہ کتاب پر جھکا اونچی آواز میں بولا۔

"کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو جان بوجھ کر دوسروں پر رعب جھاڑنے کے لیے اپنے اوپر مصنوعی خول چڑھا لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس خول میں دوسروں سے کٹ کر بہت محفوظ ہیں۔"

کہنے کو یہ وہ الفاظ تھے جو وہ اس کے محتاط رویے کی وجہ سے اس سے کہنا چاہتا تھا لیکن اس وقت وہ یہاں کسی سبق کی طرح پڑھ رہا تھا۔ اس کی بات سن کر اس کے بدن میں آگ لگ گئی وہ سیدھا اس پر حملہ آور تھا۔ وہ کپڑے چھوڑ کر اس کی جانب بڑھی۔

"کسی کی خاموشی کو اس کی کمزوری نہیں سمجھنا چاہیے۔" کمر پر ہاتھ رکھے وہ فردوس چچی کے انداز میں بولتی سامنے آ گئی۔ "میں خود پسند لڑکی نہیں ہوں اور نہ ہی اس گھر میں کسی سے کٹ کر رہ رہی ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھنا اگر خود پسندی ہے تو ٹھیک ہے ہوں میں خود پسند۔"

"کیا ہو گیا بھئی۔ میں تو کتاب میں لکھا پڑھ رہا ہوں......" اسے سامنے پا کر وہ صاف مکر گیا۔ "تمہارا تو وہ حال ہے چور کی داڑھی میں تنکا۔ تم تو فردوس چچی کی طرح ہوا میں تلوار لہراتی فوراً میری گردن اتارنے پہنچ گئی ہو۔" وہ کتاب بند کر کے اب اس کے حسین سراپے پر نظریں جمائے تھا۔

"دیکھو ہاشم، جو بات ہے ہمارے درمیان رہنی چاہیے۔" اس نے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرتے اسے خبردار کیا۔ "بیچ میں ماؤں کو لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب بڑی امی کو کوئی بات کروں گی تو پھر تمہیں برا لگے گا۔ اس لیے بہتر ہے تم میری امی کے بارے میں منہ سنبھال کر بات کرو۔"

اس سے مزید الجھنے کا ارادہ چھوڑ کر وہ ایک بار پھر سے کپڑے اتارنے لگ گئی۔

"یار! یہ ہر بار ہمارے درمیان میں ہماری مائیں کہاں سے آ جاتی ہیں۔" وہ سامنے تھی تو اب کس کافر کو پڑھائی کرنا تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

کبھی کسی روز یوں بھی تو مل مجھے
تو اپنی ماں کو بھول جائے
میں اپنی ماں کو بھول جاؤں"
"اور تو اپنے باپ سے مار کھائے
اور میں اپنے باپ سے مار کھاؤں"

اس کی بے تکی شاعری کا جواب اس نے اسی کے انداز میں دیا۔

"اس سے ایک بات تو ثابت ہو گئی کہ ہم دونوں کو شاعری نہیں آتی۔"

وہ الگنی پر پھیلی چادر کو سمیٹ کر اس کے اور قریب آ گیا۔

"نہیں اس سے یہ ثابت ہوتا ہے ہمارے درمیان شاعری نہیں ہو سکتی صرف لڑائی ہو سکتی ہے۔" وہ اسے پیچھے دھکیلتی الگنی سے چادر اتار کر نیچے دوڑی۔ اس کی دلنشین آنکھوں کے سامنے زیادہ دیر تک ٹکے رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس نے کپڑے سمیٹ کر وہاں سے دوڑنے میں عافیت جانی۔

☆☆☆

"کہاں تھیں تم؟ میں نے کب سے وحیدن کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا۔ کشور سے کہو میرے لیے چائے بنا دے۔"

گھنٹہ بھر ہونے کو آیا تھا فخر النسا کا دل چائے

www.pklibrary.com

پینے کو کر رہا تھا وحیدن کو بھیج کر اسے کہلوایا تھا۔ اسے خالی ہاتھ کمرے میں آتا دیکھ کر اسے غصہ چڑھ دوڑا۔

"لوگوں کی بیٹیاں ہیں۔ ماؤں کے اشارے سمجھتی ہیں ایک میری اولاد ہے نہ بیٹوں کو کوئی پروا ہے۔ نہ بیٹی نے بھی پوچھا۔ ایک وہ افشاں ہے ہر وقت ماں کے گرد منڈلاتی رہتی ہے۔ اس سے کچھ سیکھ ہی لے۔" دھلے کپڑوں کو تہہ لگاتے ہوئے اس وقت صحیح معنوں میں اسے اپنی بے وقعتی پر رونا آرہا تھا۔

"ارے امی قسم لے لیں۔ میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔"

وہ نہیں جانتی تھی کمرے میں قدم رکھتے ماں کا مزاج بگڑا ہوگا۔ وہ تو سوچ رہی تھی پہلے تکیے سی لے پھر بنا دے گی بعد میں دماغ سے نکل گیا۔

"وحیدن نے مجھے کہا تھا۔ میں ہی کام میں لگ کر بھول گئی تھی۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔"

وہ تکیے کے غلاف پلنگ پر پھینک کر الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ باورچی خانے میں جا کر جھٹ پٹ دو کپ اچھی سی چائے بنا کر لے آئی۔

"یہ لیں گرما گرم چائے پئیں۔" ان کے ہاتھ سے کپڑے لے کر اس نے چائے کا کپ آگے بڑھا یا تو فخر النسا کو بیٹی کی محبت کا یقین آگیا۔

"تم کہتی ہو تو پی لیتی ہوں ورنہ میرا جی نہیں چاہ رہا تھا......" بھاپ اڑاتی چائے دیکھ کر اس کا غصہ ہوا بن کر اڑ گیا تھا۔

"ایک تو یہ فردوس نے پتا نہیں سارے گھر پر کیا جادو کر رکھا ہے جسے دیکھو اسی سے کام ہے۔ جس دن سے اس گھر میں آئی ہے ساس سسر کو تو ہاتھ میں کیا ہی تھا اب تو میرے بچے بھی اس کی قسم نہیں کھاتے۔"

چائے پیتے ہوئے اس کی زبان پر وہی پرانا شکوہ تھا۔ فردوس کی چکنی چپڑی باتوں کے جال میں سب پھنسے ہیں۔

"تجھے کس نے مشورہ دیا تھا اس سے تکیے کے غلاف کٹوا! اتنا سا کام خود نہیں کر سکتی تھی پھر تیری دادی کہے گی فردوس جیسی بہو خدا سب ہی کو دے، سلیقہ تو ختم ہے اس پر۔" فخر النسا کے دل میں ایسی چھوٹی چھوٹی رنجشیں نفرتوں کے پہاڑ بنا چکی تھیں۔ ساس کی ہر وقت اس کی طرف داری اس کے ہر کام کی تعریف سن سن کر وہ نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف سے بدگمان ہو چکی تھی۔

کشور کو ماں کی یہ بدگمانی کبھی پسند نہ آئی تھی۔ وہ گلہ کرتی تو فوراً ٹوک دیتی۔

"ایک بات کا تو اب آپ بھی اعتراف کر لیں امی جان۔ فردوس چچی ہیں سلیقہ شعار۔ سلائی کڑھائی سے لے کر کھانا پکانے تک گھر کے ہر کام میں طاق ہیں۔ میرا تو دل کرتا ہے پلنگ کی ایک اور چادر ان سے بنوا ڈالوں۔" چائے ختم کر کے اس نے باقی کپڑوں کو تہہ کرنا شروع کر دیا۔

اس کی بات سن کر وہ حیرت سے منہ پر انگلی رکھے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پہلے ہی سات چادروں کے سیٹ تیار کر چکی تھی یہ لڑکی اور اب ایک اور چادر کی بات کر رہی تھی۔

"کیوں اتنی چادروں کی تو نے کیا دکان کھولنی ہے۔ کوئی مفت کا مال نہیں آیا تیرے باوا کے پاس۔ مانا کہ تو ہماری اکلوتی بیٹی ہے لیکن یہ کہیں نہیں لکھا ہم اپنا سارا کچھ بیچ کر تجھے جہیز میں دے دیں۔ تیرے جانے کے بعد بھی ہم نے جینا ہے۔ خیر سے ابھی ہاشم کی شادی کرنی ہے۔"

وہ پہلے ہی اپنی حیثیت سے زیادہ اس کا جہیز تیار کر چکی تھی۔ اب بات بات پر اس کی رال ٹپکتی دیکھ کر اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملا سکتی تھی۔

"لیکن۔ اماں۔" وہ برا سا منہ بنا کر منمنائی۔

"فردوس چچی بھی کہہ رہی تھیں بنفشی رنگ پر یہ لال دھاگا کچھ زیادہ اٹھا نہیں۔ اس کی جگہ اگر بادامی رنگ پر یہ دھاگہ لگتا تو غضب ڈھاتا۔"

اسے نئی چادر بنوانے کے لیے سو جتن کرنے پڑنے تھے۔ وہ کپڑوں کو چھوڑ کر اس کے قریب آگئی۔

"شمیم بھی اس چادر کو دیکھ کر کوئی زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی۔ میں تو کہتی ہوں یہ والی چادر آپ گھر پر رکھ لیں۔ آپ کے پلنگ پر بڑی جچے گی۔ اپنے

www.pklibrary.com

لیے میں دوسری بنالیتی ہوں۔"

اسے امید تھی شاید تھوڑی سی خوشامد کام آجائے لیکن وہ تو ادھار کھائے بیٹھی تھی۔ چائے کا کپ خالی کر کے اس پر برس پڑی۔

"عقل کے ناخن لے لڑکی۔ جو کوئی کچھ سمجھاتا ہے اسی کے پیچھے لگ جاتی ہے۔ شمیم کی چالاکیوں کو بھی میں بڑے اچھے سے جانتی ہوں اور فردوس کی تو کیا ہی بات ہے۔ وہ تو اس قدر چالاک اور ہوشیار ہے کہ ایک دن اماں بی کے کندھے پر بندوق رکھ کر اپنی بیٹی میرے لائق فائق بیٹے کو دلا ڈالے گی اور میرے جیسی بدھو عورت دیکھتی رہ جائے گی۔"

اپنے بچوں کے پھوڑپن پر وہ ماتھا پیٹ کر رہ جاتی جنہیں ہرا ایرا غیرا پیچھے لگا لیتا تھا۔ اس کے ہاتھ تو ہر طرف سے بندھے تھے۔ بچے اور شوہر من موجی تھے اور گھر پر ساس صاحبہ کی حکومت تھی۔ ان کی طرف سے اسے کوئی اچھے کی امید نہ تھی۔ بچپن سے ہاشم اور افشاں کے رشتے کی بات سبطین کے دماغ میں ڈال رکھی تھی۔ وہ سب جانتے ہوئے بھی سوائے لڑنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ جانتی تھی اس گھر میں وزیر بیگم کے حکم کے آگے مکھی بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔

"افشاں کا رشتہ کوئی ایسا برا بھی نہیں ہے۔" ماں کو کسی طرح قابو میں نہ آتا دیکھ کر وہ پوری صاف گوئی سے بولی۔

"آپ تو صرف چچی جان کی دشمنی میں ایسا سوچتی ہیں۔ لیکن سوچیں ذرا بیٹھے بٹھائے ثقلین چچا کی ساری جائیداد آپ کے ہاتھ لگ جائے گی۔ اور مجھے تو لگتا ہے اب آپ کے بیٹے کے دل میں بھی صرف افشاں ہی افشاں سمائی ہے۔"

تہہ کیے ہوئے کپڑوں کو الماری میں رکھتے ہوئے اس نے ماں کو مشورہ دیتے ہوئے بیٹے کی طرف سے بھی خبردار کر دیا تھا۔

"تو اپنے مشورے اپنے پاس رکھ۔ پہلے ہی اس کے طرف دار کیا کم تھے جو ایک تو بھی پیدا ہو گئی۔ یہ گندے برتن اٹھا اور باورچی خانے میں چھوڑ کر آ۔" اس وقت وہ کسی قسم کی کوئی ایسی بات نہیں سننا چاہتی تھی جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ اس نے گندے برتن دے کر اسے باورچی خانے کی طرف روانہ کر دیا۔

☆☆☆

وزیر بیگم کے حکم کے بغیر گھر میں پتا نہ ہلتا تھا۔ فخر النسا کی مجال کہاں تھی ان کی حکم عدولی کرتی فوراً سے پہلے لائن حاضر کر لیتیں۔ خود تو جی بھر کر بے عزتی کرتی ہی تھیں سبطین میاں سے الگ کلاس لگواتیں۔

فضل (بڑا بیٹا) کا رشتہ کیا تب بھی اسے کسی کام میں نہ پوچھا۔ وہ بشریٰ کو بہو بنانے پر بالکل بھی آمادہ نہ تھی لیکن پتا نہیں فضل نے کیا چکر چلایا اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہونے پائی اور بشریٰ بیاہ کر گھر آ گئی یہی کچھ کشور کے رشتے میں کیا۔ مدثر (کشور کا منگیتر) الطاف صاحب کی خالہ زاد بہن ثریا آپا کے نواسے تھے میاں جی کسی سے پوچھے بنا ایک دن ثریا آپا کو زبان دے آئے۔ اس نے سنا تو شوہر پر خفا ہوئی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ میاں جی بات پکی کر آئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ لوگ کشور کو دیکھنے آئے تو اسے بھی لڑکا پسند آ گیا۔ پہلی بار اس نے میاں جی کی پسند سے اتفاق کیا تھا۔ رہ گیا ہاشم تو اس کا رشتہ دادی نے پیدا ہوتے ہی افشاں سے طے کر دیا تھا۔ اسے گلہ تھا، کسی ایک بچے کا رشتہ وہ اپنی پسند سے نہ کر پائی تھی۔

وزیر بیگم ہر معاملے میں فردوس کو اس پر فوقیت دیتی تھیں۔ وہ سوچتی جو پابندیاں اس پر لگائی گئی تھیں فردوس ان سے مبرا تھی۔ اماں بی نے ہر موقع پر اسے نیچا دکھا کر فردوس کو اوپر اٹھایا تھا۔ یہ ساری باتیں ایک ایک کر کے اس کے دل میں فردوس کے خلاف گرہ باندھتی چلی گئیں ورنہ اس کے دل میں اس کے خلاف کوئی ایسی نفرت نہ بھری تھی یہ تو فردوس کے لیے اماں بی کی حد سے بڑھی چاہت تھی جس نے اسے اس کے خلاف بدگمان کر دیا تھا۔ وہ بدگمانی جب حد سے بڑھ جاتی تو دونوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کھٹ پٹ شروع ہو جاتی۔

www.pklibrary.com

☆☆☆

"فخر بھابھی۔ فخر بھابھی۔" آنگن میں مرغیوں کو دندناتا پا کر وہ پورے گلے سے فخر النسا کو پکار کر رہی تھی۔

غضب خدا کا جس سفید کپڑے پر اس نے تھوڑی دیر پہلے منگوچیاں سکھانے کے لیے دھوپ میں پھیلائی تھیں اس کپڑے کو منگوچیاں سمیت مرغیوں کے پنجوں کی گرفت میں دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ساری منگوچیاں آنگن کے لال فرش پر لڑکی پڑی تھیں اور مرغیاں ان پر پوری طاقت سے ٹوٹی پڑیں تھیں۔

"ہش...... ہش مرو کہیں جا کر کمبخت ماریوں۔ خدا غارت کرے تم سب کو۔ جہنم رسید ہو ساری کی ساری۔" ایک ہاتھ سے اپنی ساڑھی سنبھالے وہ دوسرے ہاتھ سے مرغیوں کو پرے ہٹاتے ہوئے رو دینے کو تھی۔ "کتنی محنت سے میں نے منگوچیاں بنائی تھیں۔ ان کمبختوں کو کس نے کھلا چھوڑ دیا۔ پھوپھو آپ دیکھ رہی ہیں۔ جان بوجھ کر پوری تیاری سے یہ سب کیا گیا ہے۔"

اپنی محنت سے بنائی منگوچیوں کے ساتھ یہ سلوک وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ اسے پتا تھا فخر النسا نے اس کے اندر جاتے مرغیوں کو دڑبے سے باہر نکالا ہو گا۔ اس کے شور مچاتے مرغیاں تو کان دبا کر کب کی گلی سے ہو لی تھیں۔

بچی کچی منگوچیوں کو اکٹھا کرتے ہوئے اس نے فخر النسا کے نام کی دہائی دیتی اماں بی کو باہر بلایا۔

اس کا شور سن کر نہ صرف فخر النسا بلکہ وزیر بیگم بھی باہر آ گئیں۔

"میری ساری منگوچیوں کا بیڑا غرق کر ڈالا۔ میں پوچھتی ہوں جب میں اندر گئی تھی تب تو ساری مرغیاں دڑبے میں بند تھیں میرے اندر جاتے ہی یہ ساری باہر کیسے آ گئیں۔"

منگوچیاں چھوڑ کر فردوس فخر النسا کی طرف بڑھی جس کے ایما پر مرغیوں نے اس کا اتنا نقصان کیا تھا۔ فخر النسا شور سن کر کمرے سے باہر نکلی تھی۔ اس کی جانے بلا باہر مرغیاں کیا گل کھلا گئی تھیں۔

"میری جانے جوتی۔ مرغیوں کو کون کھلا چھوڑ گیا۔ وہ کون سا مجھ سے اجازت لے کر تمہاری منگوچیوں پر حملہ آور ہوئی تھیں۔ یہ تو وہی بات ہوئی گری گدھی سے اور غصہ کمہار پر۔"

فخر النسا بھلا کہاں اس کے قابو میں آنے والی تھی اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالے اس نے فضا میں ہاتھ لہرایا۔

"منہ سنبھال کر بات کرنا مجھ سے۔ بلا وجہ کے الزام میں برداشت نہیں کروں گی۔ تمہارا تو کام ہے ہر کام کی ذمہ داری تم میرے اوپر ڈال کر خود نکل جاتی ہو۔ بعد میں بھلے تمہیں منہ کی کھانی پڑے لیکن تم باز نہیں آتیں۔" فردوس بنا ثبوت کے اس پر الزام دھر رہی تھی وہ کیسے چپ رہ جاتی۔

وزیر بیگم پاس کھڑے ہوئے دونوں کی جھڑپ دیکھ رہی تھیں۔ فخر النسا پروں پر پانی نہ پڑنے دے رہی تھی لیکن انہیں سب خبر تھی ہو نہ ہو یہ سب کیا دھرا اسی کا تھا۔ اپنی گردن کو افسوس میں ہلاتے ان کے ہونٹوں سے سرد آہ نکلی۔

"ہونہہ۔ دشمنی کی بھی حد ہوتی ہے فخر النسا۔ میں نہیں جانتی تھی اب تم ان اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آؤ گی۔" لہجے کا تاسف بتا رہا تھا شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

صبح ساری مرغیاں ان کے سامنے دڑبے میں گئی تھیں پھر انہیں اس کے علاوہ کوئی جن نکال گیا تھا۔

"مرغیوں کا تو بس بہانہ ہے تمہیں تو بہانہ چاہیے فردوس کو تنگ کرنے کا۔ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں تم۔ آج تم بتا ہی دو کس جنم کا بدلہ لے رہی ہو اس سے۔"

وہ تفتیش کرتے کچھ زیادہ ہی سخت گیر ہو گئی تھیں۔ ان کی بات سنتے فخر النسا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"اماں۔ آپ کے جو جی میں آ رہا ہے آپ بولے جا رہی ہیں۔ اس گھر میں میرے ساتھ ہمیشہ ہی ناانصافی ہوئی ہے۔ بنا ثبوت کے الزام لگانا تو کوئی آپ کی اس چہیتی سے سیکھے۔ میری جانے بلا

www.pklibrary.com

انہیں کس نے دڑبے سے نکال باہر کیا۔ میں تو سویرے سے اپنے کمرے میں پڑی ہوں مجھے کیا خبر یہ سب کون کر گیا۔"

صبح ناشتے کے بعد وہ درد کی گولی لے کر سوئی تو اس کی چیخ و پکار سے اب آنکھ کھلی تھی پر یہاں کون اس کی بات پر یقین کرنے بیٹھا تھا۔ فردوس نے شور مچا کر پھوپھو جان کی ہمدردیاں بٹور لی تھیں۔

"منگو چیاں نہ ہوئیں سونے کی ڈلیاں ہو گئیں جنہیں مرغیاں کھا کر ڈکاریں مار گئیں۔ غضب خدا کا اب تو یہاں اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے واسطے کہیں قرآن شریف پر ہی فیصلہ نہ کرنا پڑ جائے۔"

اس سارے قصے میں وہ واقعی آج بے قصور تھی لیکن جو کچھ مرغیوں نے کیا تھا اس سے وہ اندر ہی اندر بہت خوش تھی۔

وزیر بیگم منہ پر انگلی رکھے کبھی فخر النسا کو دیکھ رہی تھیں جو کولہوں پر ہاتھ رکھے اپنی صفائی پیش کر رہی تھی اور کبھی غصے سے غراتی فردوس کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے درمیان ہمیشہ کی طرح فیصلہ کرنا کتنا مشکل تھا۔

دونوں کو ہار نہ مانتا دیکھ کر وہ خود چپ ہو گئیں تھیں۔ فخر النسا ہار ماننے والی نہ تھی آج تو فردوس بھی قابو سے باہر ہو رہی تھی۔

"بھئی! تمہاری لڑائی تو کوئی بڑے سے بڑا منصف بھی ختم نہیں کروا سکتا۔ میری کیا مجال ہے جو میں بول جاؤں۔"

وہ دونوں کے درمیان کھلنے والے اس نئے محاذ پر لعنت بھیج کر اپنے تخت پر آن بیٹھی۔

"یہ تو اکھاڑے کا رستم زماں ہے۔ اسے کون پچھاڑ سکتا ہے۔ میری کیا جرات میں بیچ میں پڑنے کے لیے چلی آؤں۔"

ان کی عقل میں بھی آ گیا تھا ان کے معاملے سے دور ہی رہنا اچھا تھا۔

دونوں کے درمیان ابھی بھی کوسنوں اور طعنوں کے وار جاری تھے۔

افشاں کالج سے گھر لوٹی تو ڈیوڑھی میں قدم رکھتے بڑی امی اور امی کو دست و گریباں دیکھ کر گردن جھکائے برآمدے کی طرف بڑھ گئی۔

اب رات تک اس بات کو لے کر گھر میں تناؤ رہنا تھا۔ اتنے سال ہو گئے تھے ان دونوں کو ایک چھت کے نیچے رہتے ہوئے لیکن ابھی تک بچوں کی طرح لڑتی تھیں۔ لڑائی ہو جاتی تو کئی کئی دن ایک دوسرے کی طرف دیکھنا پسند نہ کرتیں اور اماں بی ان دونوں کے درمیان (افشاں اور ہاشم) کے رشتے کی صورت میں ایک نیا رشتہ بنانے کا سوچ بیٹھی تھیں۔ یہ سب بھلا کیسے ممکن تھا؟

☆☆☆

"پتا نہیں یہ اشرف آج کہاں سے ساگ لے کر آیا ہے؟" فردوس اشرف کے لائے ساگ کو ہاتھ سے ٹٹولتی تخت پر آن بیٹھی۔ "نہ تو ساگ میں کوئی خوشبو ہے اور نہ ہی پالک میں کوئی مہک۔ مجھے تو یہ ساگ کم اور گھاس پھوس زیادہ لگے ہے۔"

وہ باورچی خانے کے کام سے فارغ ہو کر اب ساگ کاٹنے بیٹھی تو قریب بیٹھی وحیدن سے کہے بنا نہ رہ سکی۔

"خدا بھلا کرے چھوٹی بیگم! آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔" وحیدن جو جلی کٹی بیٹھی بےزاری سے ساگ کاٹ رہی تھی اس کی بات سن کر جھٹ سے لقمہ دیا۔

"مجھے تو لگے ہے یہ موا رحمت کے کھیت تک تو گیا ہی نہیں۔ یہیں کہیں سے اٹھا لایا ہے۔ دیکھو تو کوئی جان ہے ان میں۔"

اس نے سرسوں کی گندلوں کو ہاتھ میں لیے سونگھا۔

"یہ رحمت کے کھیت کا ساگ ہے ہی نہیں۔ اس کا ساگ تو ایسے ملائی کی طرح نرم اور کھوئے کے جیسا میٹھا ہوتا ہے۔ درانتی پر رکھو تو اپنے ہی آپ کٹ جائے اور پکے تو پورے محلے کو پتا چلے فلاں گھر میں ساگ پکا ہے۔"

رحمت کے کھیت کا تازہ ساگ تو وہ بند آنکھوں

www.pklibrary.com

سے پہچان سکتی تھی۔ درانتی پر ساگ کاٹتے ہوئے اس نے پورے وثوق کے ساتھ گواہی دی اپنی طرف سے وہ یہ باور کروانا چاہتی تھی جس اشرف کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں آج وہ بے ایمانی کر گیا۔

وزیر بیگم برآمدے کے زینے پر بیٹھی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر اشرف پر سخت تپ چڑھ آئی۔

"کام چور کہیں گندے نالے سے اٹھا کر لے آیا ہوگا۔

وہاں تک جاتے تو راستے میں ندی پڑتی ہے۔"

گھر کے ملازموں میں اب وہ پہلے والی ایمانداری نہ رہ گئی تھی۔ وحیدن تھی تو وہ سارا دن کام سے بچتی رہتی اشرف تھا تو سارا دن گھر سے دوڑا رہتا۔

وہ کئی دنوں سے اس کے پیچھے پڑی تھیں۔ رحمت کے کھیت کی طرف جانا ہو تو ساگ ضرور لے کر آئے۔ اس کے کھیت کا ساگ کھائے کئی دن ہو گئے تھے۔ پکی ہوئی گندلوں کو دیکھ کر جل بھن گئیں۔ ان میں کوئی جان نہ تھی۔ جانوروں کا چارہ تھا بس۔

"تب ہی کہوں یہ اتنی جلدی کیسے واپس لوٹ آیا وہاں تک جاتے تو وقت لگتا ہے، یہ تو بوتل کے جن کی طرح آن حاضر ہوا، یہ سڑی ہوئی سوغات لے کر۔" وہ مرغیوں کو دڑبے سے نکالے دانہ ڈال رہی تھیں سارا غصہ غریب اشرف پر اتار دیا۔ جو ساگ دے کر جا چکا تھا۔

مٹی کی ہانڈی میں ساگ پک کر تیار ہو چکا تھا پیڑوں پر سورج کی نارنجی کرنیں گہرے سائے چھوڑتی آنگن سے رخصت ہونے لگی تھیں۔ شام کے جھٹ پٹے سے ذرا پہلے دروازے پر ڈاکیا آن کھڑا ہوا۔ اماں بی نے اشرف کو بھیج پتا کروایا۔ وہ تھوڑی دیر میں ہاتھ میں خط لیے اندر آ گیا۔

"کس کا خط ہے۔" خاکی رنگ کا لفافہ اس نے آتے ہی کشور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"نجمہ بھو پھو کا ہے۔"

اپنی اکلوتی بیٹی کا نام سن کر وزیر بیگم کو تشویش ہوئی۔ پچھلی بار وہ جو سوال ڈال کر گئی تھی۔ وہ ایک بار ذہن میں گھوم گیا۔

"چل لا ادھر مجھے دے۔" اس سے پہلے وہ خط کھول کر سناتی انہوں نے فوراً اس سے خط لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ اسے اندر بھیج کر اب وہ سوچ رہی تھیں نجمہ کا خط تنہائی میں الطاف صاحب سے پڑھوائیں گی۔

پچھلی بار نجمہ اچانک آندھی اور طوفان کی طرح نازل ہوئی تھی۔ اسے یوں بنا کسی اطلاع کے دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی تھی۔ نہ کوئی چٹھی نہ کوئی تار یوں اچانک چلی آئی سب خیریت ہو۔ جمال میاں (داماد) بھی ساتھ نہ تھے۔

"سب خیریت تو ہے ناں نجو؟"

اماں بی ابھی تک اس گتھی کو سلجھانے میں لگی تھیں۔ نجو اور خیریت دو مختلف لفظ تھے۔ اتنے برس ہو گئے تھے اس کی شادی کو اب تو بچے بھی جوان ہو گئے تھے لیکن اس کی طرف سے کبھی اچھی خبر نہ آئی تھی

"کیوں میں بنا چٹھی یا تار کے نہیں آ سکتی۔" برقع اتارتے ہوئے اس نے سوال کیا۔ "یہ میرے باوا کا گھر ہے یہاں آنے کے لیے اب مجھے کسی کی اجازت لینی ہو گی؟" چادر اوڑھتے ہوئے اس نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

"اماں کا یہ مطلب نہیں تھا نجو، تم تو خواہ مخواہ میں غصہ کر بیٹھیں۔ وہ تو تمہیں اکیلا دیکھ کر ایسا کہہ رہی تھیں۔ جمال بھی تو ساتھ میں نہیں۔" فخر النسا نے فوراً بات سنبھال لی ورنہ اس سے بعید نہ تھا اسی بات پر واپسی کی گاڑی پکڑ لیتی۔

"ہم سب تمہیں اکیلے دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں۔"

شام ڈھل رہی تھی۔ وہ گھر سے اکیلی چل پڑی تھی۔ شوہر نہ سہی ساتھ میں کوئی گھر کا ملازم ہی لے لیتی۔

اماں بچاری اپنی جگہ شرمندہ ہو گئیں۔ بھلائی کا

www.pklibrary.com

زمانہ نہ رہ گیا تھا اپنی اولاد بھی دشمن سمجھتی تھی۔

اچھا اب اتنا بھی پریشان نہ ہوں۔ طیب (بیٹا) بٹھا کر گیا تھا مجھے اسٹیشن سے۔ اور بھابھی دوپہر کا کھانا بچا پڑا ہو تو جلدی سے گرم کر کے لے آئیے۔ مجھے زور کی بھوک لگی ہے......" اماں کے پلنگ پر بیٹھتے اس نے فردوس کو کھانا لانے کا کہا۔ "اور کشور سے کہیے گا میں کھانا کھالوں تو ایک کپ اچھی سی چائے بنادے۔ سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔"

اس کی بات سنتے فردوس تیر کی طرح باورچی خانے کی طرف دوڑی۔

"تفلین بھائی اور سبطین بھائی دکان سے نہیں لوٹے ابھی۔" کھانا آگیا تو وہ اماں کے پلنگ پر کھانا کھاتے ہوئے اس نے بھائیوں کے متعلق پوچھا۔

"بس تھوڑی دیر میں آتے ہی ہوں گے۔"

اماں بی نے نماز کے لیے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ مغرب کا وقت ہوا جاتا تھا ابھی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہونے کو تھی تب تک وہ وضو کر کے نوافل ادا کرنا چاہتی تھیں۔

☆☆☆

"اور سناؤ گھر میں سب خیریت سے ہیں ناں۔

جمال میاں، طیب اور شبانہ کیسی ہے؟" تنہائی میسر آئی تو اماں بی اس سے گھر کے حالات کے ساتھ ساتھ شوہر اور بچوں کے بارے میں دریافت کرنے بیٹھ گئیں۔

"جی اماں! ماشاء اللہ سے ہر طرح کی خیریت ہے۔" کھانے اور چائے سے فارغ ہو کر اب وہ تھوڑی آسودگی محسوس کر رہی تھی۔

"آپ کی دعا سے طیب کو پچھلے مہینے بینک میں نوکری مل گئی ہے اور شبانہ بارہویں جماعت کے امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ میں تو اپنے رب کا جتنا شکر ادا کروں اتنا کم ہے۔ جمال نے کبھی ماتھے پر بل نہیں ڈالا۔ بچے ہیں تو جہاں پاؤں رکھوں وہاں ہتھیلیاں رکھتے ہیں۔"

بچوں اور شوہر کے بارے میں بتاتے ہوئے ہمیشہ کی طرح اس کے لہجے میں عاجزی کے ساتھ تفاخر بھی سمٹ آیا تھا۔ خدا نے ہر نعمت سے نوازا تھا اسے۔ گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ طیب کی نوکری ہو گئی تو وہ فوراً اس کے لیے افشاں کا ہاتھ مانگنے چلی آ ئی۔

"ماشاء اللہ۔ ماشاءاللہ۔ اللہ پاک میرے سارے بچوں کی آنکھیں اپنے بچوں کے حوالے سے ٹھنڈی رکھے اور تمہیں طیب کی خوشیاں دیکھنا نصیب کرے۔"

"آمین......" اماں کی بات ابھی پوری بھی نہ ہو پائی کہ اس کی زبان پر آمین کے الفاظ اتر آئے۔ "آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی اماں۔ میں تو آپ سے اسی سلسلے میں بات کرنے آئی ہوں۔ آپ تفلین بھائی سے بات کر کے افشاں کا رشتہ میری جھولی میں ڈال دیں۔"

اس کی بے تابی دیکھ وزیر بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ طیب اس کا منتوں مرادوں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بچپن سے وہ افشاں کی خواہش رکھتی تھی۔ یہ الگ بات تھی انہوں نے شروع سے افشاں کے لیے ہاشم کا خیال دل میں بسا رکھا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی افشاں ان کے ہاشم کی دلہن بن کر سبطین کے آنگن کو منور کرے۔ تفلین کا کون سا کوئی بیٹا تھا، ایک ہی بیٹی تھی۔ اس صورت میں وہ ساری زندگی اس کی نظروں کے سامنے رہ سکتی تھی۔ لیکن فخر النساء اور فردوس کے آپس کے تعلقات دیکھ کر انہیں یہ بیل منڈھے چڑھتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ اب بیٹی نے آ کر جھولی پھیلائی تھی تو ایک لمحے کے لیے وہ سوچ کر رہ گئیں اگر ایسا ہو جائے تو ایسی بری بات نہیں۔

"کیا بات ہے اماں۔ میری بات سن کر آپ کو تو چپ ہی لگ گئی۔" اماں کو سوچ میں پڑا دیکھ کر نجو کو ایک ساتھ کئی وہموں نے گھیر لیا۔ وہ پریشان ہو اٹھی۔

www.pklibrary.com

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تیرے ابا اور ثقلین سے بات کرتی ہوں۔۔ خدا کو منظور ہوا تو سب اچھا ہی ہوگا۔" انہوں نے بجھے دل کے ساتھ بیٹی کو تسلی دی۔ طیب ان کا نواسا تھا لیکن ہاشم میں تو ان کی جان تھی۔ یہ بھی خدشہ تھا کیا پتا اس بار فخر النسا ایسا نہ ہونے دے۔

"ابا سے بات کریں گی تو اگر شبانہ اور ہاشم کے لیے بھی مشورہ کر لیں تو کیسا رہے گا۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنی بات پوری کی۔ "اماں میری شبانہ کا مقدر بھی اس گھر سے جڑ جائے تو میری ساری پریشانیاں ختم ہوں۔ جمال کو بھی ہاشم بہت پسند ہے۔ مجھے کہہ رہے تھے تم جا کر اماں سے بات کر کے آؤ۔"

اس کی بات سن کر وزیر بیگم کو تھوڑی حیرت ہوئی شبانہ کہیں سے بھی ان کے ہونہار پوتے کا جوڑ نہ تھی۔ کیسے منہ پھاڑ کر اس نے بات کہہ دی تھی۔ "دیکھ نجو! تو تو جانتی ہے فردوس اور فخر النسا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تیرے کہنے پر میں فردوس سے تو بات کر سکتی ہوں لیکن فخر النساء میری بات مان جائے اس بات کی میں تجھے تسلی نہیں دے سکتی۔ ان کے بچے ہیں جہاں چاہیں ان کے رشتے کریں۔"

ان کی طرف سے ایسے جواب کی اسے امید نہ تھی۔ نانیاں تو اپنے نواسے نواسیوں کے لیے گھر میں جھگڑا ڈال کر بیٹھ جاتی ہیں لیکن ان کا جواب سن کر پتہ چل رہا تھا وہ ایسا کوئی ارادہ نہ رکھتی تھیں۔

"اماں! میں بھی اچھے سے جانتی ہوں سبطین بھائی کے بچوں کے رشتے کون کرتا آیا ہے۔ فضل اور کشور کے رشتوں میں تو آپ نے اور ابا نے اپنی من مانی کی۔ اور اب ہاشم کی دفعہ میں فخر بھابھی کو آگے کر دیں گی......" ماں کا سفید جھوٹ وہ بھلا کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ فوراً جتا دیا وہ اس گھر کی بیٹی ہے سارا کچھ جانتی ہے۔ "آپ سیدھے سے کہیں آپ کو یہ رشتہ منظور نہیں۔ فخر بھابھی کو بیچ میں لانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کا مزاج بگڑتا دیکھ کر وزیر بیگم کو نا چاہتے ہوئے بھی اسے تسلی دینا پڑی۔

"اے نجو۔ میں تیری ماں ہوں۔ اب تو مجھ سے تو یوں بدگمان نہ ہو۔ تسلی رکھ ایسے کاموں میں جلدی نہیں کرتے۔ میری بچی کہا ناں میں بات کروں گی۔"

وقتی طور پر وہ اسے اسی طرح ٹال سکتی تھیں ورنہ تو یہ لڑکی ابھی اٹھ کر واپسی کی گاڑی پکڑ لیتی۔ انہوں نے ٹھنڈا کیا تو دو دن رہ کر واپس گئی تھی۔ جاتے جاتے وہ اماں کو ایک بار پھر سے پکا کر کے گئی تھی ابا سے بات کر کے اسے جلدی کوئی خوش خبری دیں۔ وزیر بیگم اس کی اس ڈیل پر اسے صرف گھوری ڈال کر رہ گئی تھیں۔ وہ اگر اکیلے طیب کے رشتے کی بات کرتی تو شاید ممکن ہوتا لیکن وہ تو ساتھ میں شبانہ کا رشتہ دینے پر بضد تھی جو انہیں قبول نہ تھا۔ اب یقیناً اس نے خط میں یہی بات لکھی ہوگی۔

☆☆☆

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

وہ کمرے سے باہر نکلی تو اس کے ہاتھوں میں لڈوؤں سے بھرا مرتبان دیکھ کر ٹھٹکی۔ یہ تو وہی مرتبان تھا جس میں تل والے لڈو پڑے تھے جو اس نے امی سے بنوائے تھے۔ وہ اکیلا بیٹھا لڈو اڑا رہا تھا۔ وہ غصے سے بھری اس کی طرف بڑھی۔

"چھوڑو اسے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ کسی دوسرے کی چیز کھانے سے پہلے اس سے تو پوچھ لینا چاہیے"

اس کے غصہ کرنے پر بھی اس کے اطمینان میں کوئی کمی نہ آئی تھی وہ اسی طرح پورے اعتماد کے ساتھ لڈو کھاتا جا رہا تھا۔

"دیکھو ہاشم، میں بولتی نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں تم بنا پوچھے ہماری چیزیں اڑا جاؤ اور ہم خاموشی سے دیکھتے رہیں۔"

مرتبان پوری طرح اس کے قبضے میں تھا۔ وہ چھیننے کے لیے آگے بڑھی لیکن وہ کمال چالاکی سے پہلو بدل گیا۔

www.pklibrary.com

"تمہیں یہ چوری کے لڈو کبھی ہضم نہیں ہوں گے۔ ابو کہتے ہیں حرام کا مال کھاؤ تو وہ ایک دن باہر آ ہی جاتا ہے۔ دیکھنا کیسے مروڑ اٹھیں گے تمہارے پیٹ میں۔"

اسے کوسنے دیتا دیکھ کر اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"دے لو۔ دے لو۔ تم کوسنے دینے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ جس کے پاس جو ہوتا ہے وہی دیتا ہے" وہ ہنوز اسی اطمینان سے مزے لیتا لڈو اڑا رہا تھا۔ وہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"یہی لڈو اگر بڑی امی نے بنائے ہوتے تو میں دیکھتی تم کیسے مجھے ہاتھ لگانے دیتے۔"

وہ مجھ کی طاقت سے وہ مرتبان ہتھیا نہیں سکتی، منت سماجت سے ہو سکتا تھا وہ چھوڑ دیتا۔

"بھئی، یہ اس گھر میں میری تیری چیز کہاں سے آ گئی۔ اماں بی کہتی ہیں تم سب مل بانٹ کر کھایا پیا کرو اس سے محبت بڑھتی ہے۔" مرتبان اٹھائے وہ اب تسلی سے قریب پڑی کرسی پر جا بیٹھا۔

"واہ بھئی مزا آ گیا۔ بہت ذائقہ ہے چچی جان کے ہاتھ میں۔۔ لو تم بھی کھاؤ۔ میرے ہاتھ سے کھاؤ گی تو ہمارے درمیان محبت بڑھے گی۔" اس نے ہاتھ میں ایک لڈو لے کر اس کی طرف بڑھایا۔

ڈھیٹ پن کی انتہا تھی۔ وہ پورے حلق سے غرائی۔

ہاشم کے بچے۔ چھوڑتے ہو یا بلاؤں امی کو۔ اور تم اپنی یہ سخاوت اپنے پاس ہی رکھو۔ جس دن اپنی چیزیں دان کرو گے اس دن دیکھوں گی۔" اس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس نے اس بار مضبوطی سے مرتبان پر ہاتھ ڈالا تھا۔

وہ اس کے اس اچانک حملے لیے بالکل تیار تھا۔ مرتبان تک ہاتھ پہنچنے سے پہلے ہی اس کا ہاتھ اس کی گرفت میں تھا۔

"چھی، چھی ہماری بلی اور ہمیں ہی میاؤں... یہ داؤ ناکام ہو گیا میم صاحب۔ لڈو کیا چیز ہیں ہم تو یہاں دل ہارے بیٹھے ہیں۔" مرتبان کھینچتے ہوئے وہ اس کے برابر آ گیا۔ اس کی آنکھیں محبت کے انگنت رنگوں سے سجی دیکھ کر اس نے فوراً گھبرا کر اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

"قسم سے تم اس وقت بالکل فردوس چچی لگ رہی ہو۔ ان کے جیسا سڑا ہوا لہجہ جی کو جلانے والا لگتا ہے، آج ان کا اثر قبول کر لیا ہے۔"

لڈوؤں سے زیادہ اسے اس میں دلچسپی تھی جو موٹی غزالی آنکھوں پر گھنی پلکوں کے غلاف جھکائے اس کے سامنے تھی۔

"اور اگر میں کہوں تمہارے اندر آج بڑی امی کا عکس ابھر آیا ہے تو کیسا ہوگا۔" مرتبان سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے وہ اسی کے انداز میں بڑبڑائی۔

"عکس تو ہے...... " اس کی دلچسپی لڈوؤں سے پھسل کر اس پر مرکوز ہو چکی تھی۔ "امی کا نہیں۔ محبت کا عکس ہے میرے اوپر۔" اس کی آنکھوں میں سیدھا دیکھتے ہوئے وہ دل تک جا پہنچا تھا۔ اس کا مزاج بدلتا دیکھ کر وہ اس سے تھوڑا دور ہٹ گئی۔

"ہمارے درمیان جنگ تو ہو سکتی ہے محبت کبھی نہیں ہو سکتی۔" جو فخر النسا اور فردوس کے آپس کے تعلق تھے اسے دیکھتے ہوئے یہی کہا جا سکتا تھا۔ وہ لڈو چھوڑ کر پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

"جنگ ہے تو پھر جنگ ہی سہی۔ اب میں تمہیں جنگ میں جیت کے دکھاؤں گا۔" مرتبان ابھی بھی اس کے قبضے میں تھا۔ وہ مرتبان پر ہاتھ رکھے خود سے بات کرتا مسکرا دیا۔

☆☆☆

دادی کے منہ سے کئی بار اپنے اور ہاشم کے رشتے کی بات سن کر اس کے دل میں اس کی محبت کا اتر آنا ایک فطری سی بات تھی۔ اس نے اپنے لیے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ انگنت پیغام پائے تھے اس کی خاموش نگاہیں اسے دیکھتے ایک دم سے بولنے لگتیں۔ وہ حیلے بہانوں سے اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے خوشی محسوس کرتا۔

وہ بھی محسوس کرتی۔ اس کے سامنے آتے ہی اس کا بجھا بجھا سا دل خوشی سے اچھلنے لگ جاتا۔ دل

www.pklibrary.com

کرتا اس سے ہونے والی یہ پیار بھری چھیڑ چھاڑ چلتی رہے۔ اس کی ساری باتیں وہ مہوش اور نگینہ (سہیلیاں) کے ساتھ کالج میں کرتی۔ وہ ساری باتیں جو وہ ابھی تک وہ اس سے نہ کہہ پائی تھی وہ سب ان دونوں کو پتا تھیں۔ وہ اس کی خاموش محبت کے سارے راز جانتی تھیں۔ وہ دونوں جانتی تھیں ان کی محبت کی سب سے بڑی دشمن خود اس کی تائی تھی اگر ان کی شادی کسی وجہ سے نہ ہو سکی تو اس کی وجہ فخر النسا ہوں گی۔

موسم بہار پورے اہتمام کے ساتھ آنگن میں لگے پیڑ پودوں پر جلوے دکھا رہا تھا۔ پیلے بنفشی لال پھولوں سے کیاریوں کا حسن پہلے سے کہیں بڑھ گیا تھا۔ آم کے بور کی مہک سے معطر ہوائیں سارا دن گھر آنگن کو مہکائے رکھتیں۔

"افشاں۔"

وہ برآمدے میں بیٹھ پڑھ رہی تھی جب کشور آپا کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"ادھر آنا ذرا......" وہ باورچی خانے کی کھلی کھڑکی میں کھڑی اسے بلا رہی تھی۔ وہ کتاب بند کر کے قریب چلی آئی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ چوپٹ کھلے تھے۔

"جی آپا۔" قریب آ کر اس نے دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ وہ باورچی خانے میں رات کا کھانا بنا رہی تھی۔ اس کی شادی کے دن جیسے جیسے قریب آ رہے تھے وہ باورچی خانے میں زیادہ پائی جانے لگی تھی۔ اب وہ اکثر باورچی خانے میں آ کر فردوس چچی یا بشریٰ کو (جو بھی وہاں موجود ہوتا) یہ کہہ کر نکال باہر کرتی کہ آج کھانا میں بناؤں گی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ بھی خوشی خوشی اسے سب سونپ کر چل دیتیں۔ اس وقت بھی وہ گنگناتے ہوئے کھانا بنا رہی تھی۔ اچانک اسے یاد آیا شادی میں مہندی کس سے لگوائے گی۔ اسے افشاں کی سہیلی کا خیال آیا۔

"افشاں! وہ تمہاری سہیلی کا کیا نام ہے جو بڑی اچھی مہندی لگاتی ہے؟" اسے پتا تھا ڈپٹی صاحب کی بیٹی مہندی کے ڈیزائن بڑے اچھے بناتی تھی۔ وہ اگر اس کی شادی میں آ جائے تو اسے بڑی اچھی مہندی لگا سکتی ہے۔

"جی۔ نگینہ نام ہے اس کا۔" اس نے چولہے پر پکتے سالن کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تم ناں شادی میں اسے ضرور دعوت دے دینا......" شادی سر پر تھی تو اس کا ذہن کام کرتے ہوئے بھی ادھر ہی لگا رہتا۔

"بڑی اچھی مہندی لگاتی ہے۔ وہ میں تو اسی سے مہندی لگواؤں گی۔"

اس عید پر وہ گھر آ کر افشاں کے ساتھ کشور کو بھی مہندی لگا کر گئی تھی اس نے تب ہی اسے پکا کر دیا تھا میری شادی پر مہندی تم ہی لگانا۔

ان کی بات سن کر اس نے فوراً اسے بلانے کی حامی بھری۔

"بلا لوں گی، وہ تو ویسے بھی شادی میں شرکت کے لیے مری جا رہی ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ کشور آپا کی شادی میں مجھے اسے ضرور بلانا۔" ان کا مسئلہ حل کر کے اب اس کی نگاہ دیگچی کی طرف تھی۔

"ویسے پکا کیا رہی ہیں۔ خوشبو تو اچھی آ رہی ہے۔"

اس نے لمبی سی سانس لے کر ساری خوشبو کو اندر اتارتے ہوئے پوچھا۔

"آلو گوشت بنا رہی ہوں۔ لیکن ابھی تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔"

مہندی کا مسئلہ حل ہو گیا تو پھر سے وہ سالن کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ وہیں کھڑکی میں کھڑی انہیں کام کرتا دیکھ رہی تھی۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا اسے کبھی کھانا بناتے نہیں دیکھا تھا۔ اب شادی ہونے والی تھی تو وہ پورے شوق سے گھر کے سارے کام سیکھ رہی تھی۔

"آپا! آپ کی شادی ہو جائے گی تو آپ سچ

www.pklibrary.com

میں چلی جائیں گی۔"

ان کی ماؤں کے آپس کے تعلقات جیسے بھی تھے وہ دونوں ایک چھت کے نیچے پل کر جوان ہوئی تھیں۔ کشور کے جانے کا سوچ کر وہ اداس ہو جاتی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں نہ چاہتے ہوئے نمی تیر گئی۔ کشور اس کی محبت پر دل و جان سے نثار ہوتی ایک بار پھر سے قریب چلی آئی۔

"پگلی۔ دکھی نہیں ہوتے......" پیار سے اس کی گال چھوتے وہ بھی اداس ہو گئی۔ "بیٹیاں تو ہوتی ہی پرائی ہیں۔ کل کو تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔"

وہ اس کی محبت پر نم آنکھوں سے مسکرادی

"جاؤ جا کر پڑھو۔ میں بھی کھانا بنالوں۔ اگر سالن میں کچھ کسر رہ گئی تو اماں بی میرے کان کھینچ دیں گی۔ لڑکی شادی سر پر ہے اور ابھی تک کوئی ڈھنگ کا کام کرنا نہ آیا تجھے۔"

اماں بی کے ذکر پر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ ابھر آئی فخر النساء روز اسی طرح دستر خوان پر بنائے گئے سالن کا پوسٹ مارٹم کرتی تھی۔

☆☆☆

گھر میں کشور کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فخر النسا کا ایک پیر گھر میں ہوتا تو دوسرا بازار میں۔ کشور کو لیے صبح کی گئی شام پڑے گھر لوٹتی۔ گھر کی ساری ذمہ داری ایک بار پھر فردوس اور بشریٰ کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ اوپر سے سفیدی والے جب سے گھر میں گھسے تھے کام تھا کہ شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے کا نام نہ لیتا۔ دو بچوں کے ساتھ اگر فردوس اور افشاں کا ساتھ نہ ہوتا تو بشریٰ تو شاید پاگل ہو جاتی۔

اس کی طبیعت ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ دل بوجھل بوجھل سا رہتا ذرا سی کوئی چیز کھانے کی دیر ہوتی ابکائیاں شروع ہو جاتیں، رنگت ہلدی کی مانند ہو رہی تھی۔ فردوس کئی دنوں سے اس کی حالت دیکھ کر اندازے لگا رہی تھی۔

" کیا بات ہے بشریٰ؟ تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی؟"

دوپہر سر پہ چڑھ آئی تھی اس کا چکروں اور قے سے برا حال ہو رہا تھا۔ فردوس کمرے میں جھانک کر گئی تو وہ پلنگ پر عثمان کو سلاتے ہوئے خود بھی گری پڑی تھی۔

فخر النسا کشور کے ساتھ بازار گئی تھی۔ اس نے اشرف کو بھیج کر دلشاد دائی کو گھر بلایا۔ تھوڑی دیر میں وہ اشرف کے ساتھ آ گئی۔ بشریٰ کا چہرہ دیکھنے کی دیر تھی جھٹ سے وزیر بیگم کو نئے مہمان کی آمد کی خوشخبری سنا ڈالی۔

کہنے کو تو یہ خوشی کی خبر تھی لیکن بشریٰ کی حالت دیکھتے ہوئے فردوس کو بچے سے زیادہ اس کی جان کی فکر لاحق ہو گئی۔ سوکھی سڑی سی تو تھی۔ پہلے ہی اوپر نیچے دو بچے پیدا کر چکی تھی۔ عثمان ابھی چھ ماہ کا تھا تو اگلے کی تیاری ہو گئی تھی۔ اللہ ہی خیر کرے۔

☆☆☆

خدا خدا کر کے گھر میں سفیدی کا کام ختم ہوا تھا۔ شادی میں اب گنتی کے دن رہ گئے تھے۔ کشور کو مایوں بٹھایا تو اس کی باہر کی دوڑیں رکی تھیں۔ وزیر بیگم اس کی تیاریاں دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتیں۔

"غضب خدا کا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا لڑکیاں چھ مہینے پہلے گھر کے مردوں سے گھونگٹ اوڑھ لیتی تھیں۔ ہم اپنی بات کرتے ہیں۔ ہم نے تو یہ سارا وقت پردے میں گزار دیا تھا۔ ہمارے ابا مرحوم ہماری صورت دیکھنے کو ترس گئے تھے۔" وہ اکیلی بیٹھی پان بناتے ہوئے وحیدن سے دل کا حال کہتی رہتیں۔ "مجال ہے جو کبھی باپ اور بھائی کے سامنے بھی آئے تھے۔ بس کونے میں پڑے رہتے سارا دن۔ وہیں آنسو بہاتے رہتے۔ ایک یہ لڑکی ہے کہیں ٹک کر نہیں بیٹھی۔ یوں بازاروں میں گھومتی پھرتی ہے میں تو سوچتی ہوں بازار سے ہی اس کی ڈولی سسرال نہ روانہ کرنی پڑ جائے۔"

ان کی بات سن وحیدن منہ پر دوپٹا رکھے کھی کھی کی آواز نکال کر رہ جاتی۔ الطاف صاحب بیگم کی

www.pklibrary.com

بات سن کر اخبار سے منہ اٹھا کر پہلے وحیدن کی طرف دیکھتے جس کی بتیسی باہر ہی دھری رہتی تھی پھر اپنی بھاری آواز میں بولتے۔

"حد کرتی ہیں آپ بھی بیگم۔ اپنی ہی پوتی کی برائیاں کوئی ایسے کرتا ہے۔" "زمانہ بدل گیا ہے اب وزیر بیگم۔ اب وہ وقت نہیں کہ لڑکیاں کونوں کھدروں میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ بھئی ان کی شادی ہے، انہیں پورا حق پہنچتا ہے وہ سارے کام اپنی پسند سے کریں"۔

وحیدن کے اٹھتے وہ پیار سے انہیں سمجھانے لگتے۔ گھر کا ماحول اچھا رکھنے کے لیے وہ چھوٹے چھوٹے گر اکثر انہیں سکھاتے رہتے تھے، ان کا خیال تھا گھر پر حکومت کرنے کے لیے پہلے دلوں پر حکومت کرنا ضروری ہے لیکن وزیر بیگم کا فارمولا الٹا تھا۔ وہ ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانکنے کی قائل تھیں۔

"خدا غارت کرے ایسی ترقی کو۔ جو شرم وحیا کا خاتمہ کر دے۔ یہ سراسر بے حیائی ہے میاں اور کچھ نہیں۔" ان کی اپنی ہی رٹ ہوتی۔ پاندان پر جھکی وہ اپنی بات کا مکمل دفاع کرتیں۔ "ہم نہیں مانتے ایسے زمانے کو جو لڑکیوں کو پردے سے نکال کر باہر بازاروں کی زینت بنا رہا ہے۔ بھئی ہم نے بھی سارے فیشن کیے تھے۔ لیکن بڑوں کی عزت وشرم کو بھی ملحوظ خاطر رکھا تھا۔ ان آج کل کی لڑکیوں کی طرح غیر مردوں سے کلائیوں میں چوڑیاں نہیں ڈلواتے پھرے تھے۔ توبہ...... توبہ......" وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتیں۔

☆☆☆

وہ آج دو دن بعد کالج گئی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں امی اور وحیدن کے ساتھ لگ کر گھر کا سارا پھیلاؤ سمیٹا تھا۔ رات دیر سے سوئی تو صبح کالج آ کر بھی وہ کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ مہوش اور نگینہ کا بھی پڑھنے کا کوئی موڈ نہ تھا ایک دو پریڈ لے کر وہ درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھی کشور آپا کی شادی کی باتیں کرتی رہیں۔

"اسے تو کشور آپا نے مہندی لگانے کے لیے خاص طور پر بلایا ہے۔ میں ابھی سوچوں گی مجھے آنا بھی چاہیے یا نہیں۔" کشور آپا کا نگینہ کے لیے آیا پیغام سن کر مہوش منہ بسور کر رہ گئی۔ دھیمی دھیمی ہوا نرم شاخوں کو سہلاتی گزر رہی تھی۔ دور کیاریوں میں کھلے پھولوں کو مالی پانی لگا رہا تھا۔ افشاں اپنی تھکی تھکی آنکھوں کو رگڑتے ہوئے اس کی جانب مڑی۔

وہ کشور آپا کے لیے آئے گی تو تم میرے لیے آ جانا۔ دونوں ایک دوسرے کو مل کر مہندی لگائیں گی۔" اس کے برا منانے کا سوچ کر وہ اس کی دل جوئی کی خاطر بولی۔

"تمہیں مہندی لگانے کا کہاں ہوش ہو گا۔ تمہارے آگے پیچھے تو بس ہاشم گھوم رہا ہو گا تمہیں میں کہاں یاد آؤں گی۔" وہ اس کے دل میں اتر کر اندر کے رازوں تک سے واقف تھی۔ جانتی تھی محبت کی آگ اس کے دل میں زور پکڑ چکی تھی بس اوپر اوپر سے بنتی تھی...... "تمہیں مہندی وہندی کی کہاں ضرورت۔ تم تو کچھ یوں کہو گی۔ ہمیں مہندی کی ضرورت نہیں ہے ہمیں تیرے پاؤں کے نشاں مل گئے ہیں۔"

اسے تنگ کرنے کے لیے وہ باقاعدہ سر میں گنگنانے لگی۔ اسے گاتا دیکھ کر نگینہ بھلا کہاں پیچھے رہنے والی تھی وہ بھی اس کے ساتھ سر ملا کر گانے لگی۔

"ہمیں راستوں کی ضرورت نہیں ہے ہمیں تیرے پاؤں کے نشاں مل گئے ہیں۔"

مارے حیا کے اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"کچھ شرم کرو۔ کوئی سنے گا تو کیا کہے گا۔ کیسی بے شرم لڑکیاں ہیں" دور کھڑے پودوں کو پانی دیتے مالی کو دیکھ کر اسے وہاں سے دم دبا کر دوڑنے کا خیال آیا۔ ان کا کوئی پتا نہ تھا کب تک اسے تنگ کرتی رہتیں اس سے بہتر تھا وہ اگلی کلاس لے لیتی۔ وہ گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

شام کو گھر میں کشور آپا کی سہیلیاں انہیں ابٹن لگانے آئی تھیں ساتھ میں چند ایک بڑی بوڑھیاں

www.pklibrary.com

بھی مل جاتیں تو شغل ہو جاتا۔ اس نے مہوش اور نگینہ کو بھی بلا رکھا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اماں بی کے کمرے میں سب سہاگ کے گیت گانے کے لیے جمع تھیں۔

فخر النسا نے ہاشم کو بھیج کر منشی حلوائی کی دکان سے برفی، جلیبی اور نمک پارے منگوائے تھے۔ وہ باورچی خانے میں چائے بنا رہی تھی۔ مہوش اور نگینہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ جب وہ ساری چیزیں لے کر آ گیا۔ اس کی سہیلیوں کو وہاں دیکھ کر وہ دروازے پر ہی سب کچھ رکھ کر چلتا بنا۔ نگینہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا۔

"مجھے تو تمہاری قسمت پے رشک آ تا ہے۔" اسے تیز تیز قدموں سے باہر جاتا دیکھ کر نگینہ نے چائے بناتی افشاں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی آہ بھری۔ "کیسا خوبرو بندہ خدا نے تمہارے نصیب میں لکھ دیا ہے۔ اس کا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو میں تمہاری دادی کے پاؤں پڑ جاتی۔۔ خدا کے لیے مجھے بھی اس گھر کی بہو بنا لو۔" وہ ایک بار پھر اسے ہاشم کے نام سے چھیڑنے لگ گئی۔

"ہاں ابھی تم نے صرف اسے دیکھا ہے۔ میری تائی کو نہیں جانتیں تم۔ جس دن انہیں جان لو گی کانوں کو ہاتھ لگاؤ گی۔"

ان کا یہ مذاق چلتا رہتا تھا کبھی وہ اسے ہاشم کے نام سے چھیڑتیں تو کبھی فخر النسا اور اس کی امی کی تازہ لڑائی ان کا موضوع ہوتی۔

"ان کے سامنے تو میری امی کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ وہ اکیلی میدان کی کھلاڑی ہوتی ہیں۔" پتا نہیں یہ فخر النسا کی تعریف تھی یا پھر برائی تھی جو وہ چائے بناتے ہوئے مسلسل بیان کر رہی تھی۔

چائے بن کر تیار تھی۔ مہوش نے برفی، جلیبیاں اور نمک پارے نکال کر پلیٹوں میں ڈال دیے تھے۔

"اس کی تائی سے بچ کے رہنا۔ تم جانتی نہیں ہو انہیں۔۔ تمہیں محبت کا سارا سبق زبانی یاد کروا دیں گی۔" مہوش کی بات پر افشاں کی بے ساختہ ہنسی چھوٹ گئی۔ بڑی امی کے مزاج سے ایک وہ ہی نہیں سارا محلہ واقف تھا۔

"اٹھاؤ سب کچھ، آؤ اندر چائے لے کر چلیں اس سے پہلے کہ چائے ٹھنڈی ہو جائے اور بڑی امی سارا غصہ مجھ پہ نکال دیں۔۔ جلدی کرو۔" ٹرے پکڑ کر وہ ان دونوں کو اپنے پیچھے باقی چیزیں لانے کا کہتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

گھر کا آنگن آج مہمانوں کی آمد سے گونجنے لگا تھا۔ فخر النسا کے میکے کے ساتھ ساتھ وزیر بیگم اور الطاف صاحب کے قریبی رشتہ دار بھی آ چکے تھے۔

اماں بی کی اکلوتی بیٹی نجمہ جہاں دو دن پہلے مع اہل و عیال اسٹیشن پر اتری تو گھر سے اشرف میاں بطور خاص انہیں لینے گئے تھے۔ جمال میاں (داماد) نے سالوں بعد سسرال کا رخ کیا تھا۔ انہیں پورے عزت و احترام کے ساتھ شادی میں سب سے الگ مقام تو ملنا بنتا تھا پھر نجمہ نے پہلے سے خط لکھ کر اماں کو جہاں رشتے کی یاد دہانی کروائی تھی وہیں جمال کی آؤ بھگت پر بھی لمبی چوڑی لسٹ ارسال کی تھی۔

وزیر بیگم نے ان کے آنے سے پہلے وحیدن سے کہلوا کر اوپر دو کمروں میں ان کا انتظام کروا دیا تھا اور کسی کو کچھ ملے نہ ملے جمال میاں کی عزت میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ فردوس، بشریٰ اور افشاں تو پہلے سے سب جانتی تھیں انہیں بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

اشرف انہیں گھر لایا تو کھانا پہلے سے تیار تھا۔ وحیدن نے افشاں کو ساتھ لگا کر دستر خوان کئی قسم کے کھانوں سے سجا رکھا تھا۔ کھانے کے بعد خالص دودھ پتی کی چائے سے سجے چینی کے کپ حاضر تھے۔ اتنے ناز نخرے اٹھانے کے باوجود جمال میاں کی ناک ابھی تک تنی ہوئی تھی سفید کاٹن کے جوڑے میں لگی کلف کی ساری اکڑ ان کی گردن میں سمائی ہوئی تھی۔

www.pklibrary.com

☆☆☆

دوپہر میں اس سے مہوش ملنے آئی تو وہ اسے لیے کمرے میں چلی آئی۔ سارا گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ وحیدن کا ہاتھ بٹانے کے لیے دو دو ماسیاں موجود تھیں پھر بھی بشریٰ آپا اور فردوس کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی۔

"میرا دوپٹا لا دیا تھا بازار سے۔" وہ خود تو گھر میں مصروف تھی۔ اپنے دوپٹوں پر گوٹا لگوانے کی ذمہ داری اسے دے رکھی تھی۔

"ہاں وہی دینے آئی ہوں۔" اس نے ہاتھ میں پکڑا دوپٹے والا شاپر اس کے حوالے کر دیا۔

"شام کو مایوں میں ضرور آنا۔"

اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر دوپٹا چیک کرتے ہوئے۔ اپنے مصروف سے انداز میں اسے ایک بار پھر سے دعوت دی۔

"ہاں ہاں آؤں گی لیکن پہلے تم یہ بتاؤ یہ تمہاری نجو پھوپھو کے بیٹے۔ کیا بھلا سا نام ہے ان کا۔" اس کے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے اس نے ذہن پر زور دیتے پوچھا

"طیب۔ طیب بھائی۔" اس نے فوراً نجمہ پھوپھو کے اکلوتے صاحب زادے کا نام بتایا۔

"انہوں نے کبھی کوئی حسین لڑکی نہیں دیکھی کیا؟ کل رات چھت پر کھڑے بنا پلکیں جھپکائیں مجھے تاڑتے جا رہے تھے۔" اس نے تنک کر پوچھا۔

طیب بھائی کی رنگین مزاجی کا کچھ کچھ اندازہ تو اسے بھی ہو گیا تھا جب سے آئے تھے اسے بھی انہی نظروں سے دیکھے جا رہے تھے۔ لیکن یہ نہیں جانتی تھی آتے ہی محلے میں بھی تانک جھانک شروع کر دیں گے، حد ہوتی ہے۔

اس نے دوپٹا لپیٹ کر رکھتے ہوئے طیب بھائی کی سوچ پر افسوس کیا۔

☆☆☆

ہریالی بنو...... ابا پیاری بنو
اماں پیاری بنو...... ہریالی بنو

وحیدن آنگن میں بیٹھی سویرے سے ابٹن اور مہندی تیار کر رہی تھی۔ کشور کو مایوں بٹھا کر زعفرانی غرارہ اور کرتا پہنایا گیا تھا۔ گھر کی عورتیں سویرے سے مایوں کی تیاری کر رہی تھیں۔ وہ تیار ہو کر باہر نکلی تو دادی نے اسے برآمدے میں روک لیا۔

"افشاں بٹیا! یہ ابٹن اور مہندی کا تھال لے جا کر کشور کو ابٹن لگاؤ۔"

وحیدن نے پیتل کے بڑے بڑے تھالوں میں مہندی اور ابٹن گوندھ کر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ پاس سے گزری تو انہوں نے مہندی کا ایک تھال اسے تھما دیا۔

ساری عورتیں تیار ہو کر بڑے کمرے میں جا چکی تھیں جہاں لڑکیاں ڈھولک کی تھاپ پر سہاگ کے گیت چھیڑے بیٹھی تھیں۔

چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
سجن موہے تم بن بھائے نہ گجرا
نہ موتیا چنبیلی نہ جوہی نہ موگرا
سجن موہے تم بن بھائے نہ زیور
نہ جھمکے نہ کنگن نہ جھومر نہ جھانجر
سجن موہے تم بن بھائے نہ سنگار
نہ کاجل نہ سرخی نہ مسی نہ مہندی
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے
چلے آؤ سیاں رنگیلے میں واری رے

وہ ہاتھ میں تھال لیے زینے کی طرف بڑھی۔ کشور اوپر کمرے میں بیٹھی تھی۔ سارا گھر چھوٹے چھوٹے برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ وہ زینہ چڑھ کر اوپر کے برآمدے میں آ گئی۔ سارے کمروں کے دروازے بند پڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ تھال اٹھائے کشور آپا کے کمرے کی طرف بڑھتی ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور طیب اچانک سے نمودار ہو گیا۔ اسے یوں اچانک سامنے پا کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھوں میں پکڑا تھال کانپ گیا۔ اس کی طبیعت کی رنگینی سے تو وہ واقف تھی۔

www.pklibrary.com

"السلام علیکم"

اسے دیکھتے اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ فوراً سلام کے لیے ہاتھ ماتھے تک چلا گیا۔

"وعلیکم السلام" چاروناچار اسے رک کر اس کے سلام کا جواب دینا پڑا

"کیسی ہیں آپ؟" اس کے سراپے پر نظریں گاڑے وہ اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ پر یہ رنگ بہت جچ رہا ہے، ایسے لگ رہا ہے جیسے مہتاب زمین پر اتر آیا ہو۔" وہ اس کے بسنتی رنگ غرارے میں اس کی اٹھتی اٹھان کو مدہوش نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی اس نے تھال پر رکھے اس کے نازک ہاتھ پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

اس کے ہاتھوں میں پیتل کا تھال کانپ گیا۔

اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ تھال وہیں پھینک کر دوڑ جانا چاہتی تھی لیکن اسے یوں لگا اس کے پیروں کو زمین نے جکڑ لیا ہو، وہ طیب بھائی کی اس جرأت پر حیران تھی اس کی موٹی موٹی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ اس سے پہلے کہ پانی نین کٹوروں سے نکل کر گالوں پر بہہ نکلتا سامنے سے آتے ہاشم نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ طیب اسے دیکھتے ہوا ہو گیا۔ وہ کسی کام کے لیے اوپر آیا تھا اسے وہاں طیب کے پاس کھڑا دیکھ کر چلتا ہوا قریب چلا آیا۔

"کیا بات ہے یہاں کیوں کھڑی ہو؟" طیب کو تیر کی طرح بھاگتا وہ دیکھ چکا تھا۔ اس کی ہلدی پڑتی رنگت کو دیکھتا غصے سے غرایا۔ "آؤ میرے ساتھ اندر چلو۔"

اس کے کہنے کی دیر تھی وہ فوراً سر پر پاؤں رکھ کر ہاشم کے پیچھے دوڑ پڑی۔

☆☆☆

شادی کا ہنگامہ ختم ہوتے سب مہمان واپس ہو لیے۔ جمال میاں بھی کل سویرے کی گاڑی سے گھر چلے گئے تھے۔ نجمہ شبانہ اور طیب کے ساتھ کچھ دن کے لیے رک گئی تھی۔ مئی کا مہینہ اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ ایک بار پھر سے آن دھمکا تھا۔ لمبے گرم دن شروع ہوتے تو ختم ہونے میں نہ آتے۔ دھوپ آہستہ آہستہ آنگن میں پیر پسارتی جارہی تھی۔ پرندے ابھی سے پیڑوں کی گھنی چھاؤں میں پناہ ڈھونڈنے لگے تھے۔ ان کی بھانت بھانت کی بولیوں نے سارا گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔

نجمہ نہا کر اماں بی کے پاس برآمدے میں بیٹھی تھی۔ برآمدے میں لگا پرانا پنکھا غوں غوں کی آواز کے ساتھ ہلکی ہلکی ہوا پھینک رہا تھا۔ اس نے ناگواری سے چھت کی طرف دیکھا۔

"اماں! خدا کے لیے سبطین بھائی سے کہہ کر اب یہ پنکھا بھی بدلوا لیں۔ کس زمانے کا لگا ہے بے چارہ۔" وہ بچپن سے اس پنکھے کو دیکھتی آ رہی تھی۔ سبطین بھائی تو اسے اماں کے جہیز کا پنکھا کہتے تھے۔

"جتنی اس کی عمر ہے ناں اس کے حساب سے یہ اب بھی بڑی اچھی ہوا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ کے تو کب کے اگلے جہاں سدھار گئے۔ یہ ابھی بھی کام کر رہا ہے۔" وزیر بیگم نے ذہن پر زور ڈالا ٹھیک سے تو انہیں بھی یاد نہ تھا یہ پنکھا کب سے یہاں لگا تھا۔

"پرانی چیزوں سے تو آپ کو عشق ہے۔ اور پیسہ سبطین بھائی کچھ نہیں ہلاتے۔" سانجھے گھر کے مسائل سے وہ اچھی طرح واقف تھی ہر کوئی اپنی جیب دبا کر رکھتا تھا۔

اس کی بات سن کر سبزی بناتی وحیدن کھل کر ہنس پڑی۔

"یہ بات خوب کہی آپ نے نجو آپا۔" اس کے مطلب کی بات ہوئی تھی وہ بھی ٹکڑا دیے بغیر نہ رہ سکی۔

"اے چپ کر، تیری زبان بھی بڑی لمبی ہے۔ آرام سے سبزی بنا۔" انہوں نے ڈانٹ کر اسے

www.pklibrary.com

چپ کروایا جس کی بولتی بند ہونے میں نہ آتی تھی۔

بشریٰ عثمان کو نہلا کر کپڑے بدل رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر ہاتھ پیر مار رہا تھا اس بے چاری کی اپنی حالت ایسی تھی۔ گرمی سے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ فیڈر بنا کر لائی تو اب وہ سکون سے اس کی گود میں دودھ پی رہا تھا۔

"کون سا مہینہ چل رہا ہے؟" اسے پاس بیٹھا دیکھ کر نجمہ نے سوال کیا۔

"پھوپھو! ابھی ساتواں لگا ہے۔" اس نے زرد چہرے کو تھوڑا جھکا کر جواب دیا۔ عثمان دودھ پیتے سو گیا تھا۔

"تمہاری حالت کچھ اچھی نہیں لگتی مجھے۔ رنگ زرد پڑ گیا ہے اور دبلی بھی کتنی ہو گئی ہو۔ اوپر سے دو دو بچے بھی سنبھالنے پڑتے ہیں۔"

وہ دیکھ رہی تھی فخر بھابھی نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ بے چاری سارا دن بچوں کے ساتھ کام کرتی نظر آتی۔ ایک صرف فردوس تھی جسے اس سے کوئی ہمدردی تھی ورنہ تو وہ کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتی۔

"اماں! اب تو خیر سے کشور اپنے گھر کی ہو گئی۔ سارے کام اچھے سے انجام پا گئے بس اب آپ میاں جی سے طیب اور افشاں کے رشتے کی بات کریں۔" وہ اسی مقصد کے لیے رکی تھی۔ افشاں کا رشتہ ثقلین بھائی اس کی جھولی میں ڈال دیں تو اس کی دلی مراد پوری ہو جاتی۔

اماں نے اس کی بات سن کر اس کی بے وقوفی پر اسے گھوری ڈالی۔ کھلے برآمدے میں بیٹھی راز کی بات کہہ ڈالی تھی وہ بھی وحیدن کے سامنے ابھی اس نے جا کر سارے گھر میں تیلی لگا دینی تھی۔

نجو آپا کی بات سن کر وحیدن نے جھٹ سے بشریٰ کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو یہ کیا کہانی ہے۔

"تجھے کاہے کی جلدی ہے۔ ہم کون سا دوڑے جا رہے ہیں، صبر رکھ۔" اس لڑکی کی عقل پر ماتم کرتے انہوں نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

عثمان سو چکا تھا۔ بشریٰ گود میں اٹھا کر کمرے میں چلی آئی۔ نجو پھوپھو اور اماں بی اب کسی اور موضوع پر بات کر رہی تھیں لیکن اس کا ذہن ان کی اسی بات میں اٹک کر رہ گیا۔ افشاں کا رشتہ طیب کے لیے۔ نجو پھوپھو کیا اسی کام کے لیے یہاں رکی تھیں۔

☆☆☆

"چھوٹی مالکن۔ آپ کے لیے لاکھ روپے کی خبر لے کر آئی ہوں۔" وحیدن فخر النسا کے کمرے میں داخل ہوتے پلنگ پر جا بیٹھی۔

"کیوں نگوڑی، تو نے کیا روپے پیسے کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ کسی بینک میں نوکری مل گئی ہے تجھے۔"

فخر النسا کے قریب بیٹھتے وحیدن نے ہلکے ہاتھوں سے اس کی ٹانگیں دبانا شروع کر دیں۔

"خبریں تو تیرے پاس ہوتی ہیں لیکن میرے کام کی کبھی کوئی خبر نہ لاتی تو کمبخت۔ کام کی ساری خبریں تو تو دوسروں کو دے آتی ہے۔"

فخر النسا کو گلہ ہی رہا، برملا کہتی تھی وحیدن تو میرے تو کسی کام کی نہیں۔

"یوں ہی سمجھیں۔ بیٹھے بٹھائے آپ کی لاٹری نکل آئی۔ کل تک جو رشتہ اماں بی آپ کو دینے پر بضد تھیں وہی رشتہ اب ان سے نجو آپا مانگ رہی ہیں۔"

اس کی بات تو دھیان سے سننے والی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ کس رشتے کی بات کر رہی تھی۔

"نجو آپا افشاں کا رشتہ مانگ رہی ہیں۔"

"ہیں" ایک لمحے کو اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "تجھے کہاں سے خبر ملی؟" اس نے تاڑتی نگاہوں سے وحیدن دیکھا کہیں اپنے پاس سے بات نہ بنا رہی ہو۔ ایک بات کی چار بنا کر آگے چلانا اس کی عادت تھی۔

"ان گناہ گار کانوں سے خود سن کر آ رہی ہوں نجو باہر بیٹھی اماں بی سے یہی بات کر رہی ہے۔"

"تیرے منہ میں گھی شکر۔ اس فردوس کی بچی

www.pklibrary.com

سے میری جان چھوٹ جائے تو۔ مزا آجائے مجھے۔ میں تو دن رات سوچتی تھی کسی طرح اس سے خود ہی میری جان چھوٹ جائے۔ نجمہ نے تو میری مشکل ہی حل کر دی۔ اب تو نہ ہو گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔" فخر النسا خوشی سے جھوم اٹھی تھی وحیدن نے پہلی بار اسے کوئی کام کی خبر سنائی تھی۔

☆☆☆

"نجمہ پھوپھو کے ارادے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔"

شام کو فردوس بشریٰ کے کمرے میں آئی تو اس نے اسے نجمہ کے ارادے سے آگاہ کیا۔

"کیوں؟ کیا کہا اس نے؟"

"وہ طیب کے لیے افشاں کے رشتے کی بات کر رہی تھیں۔" اس نے جب سے سنا تھا سوچ سوچ کر غصہ آرہا تھا۔

"ہیں؟"

کچھ کچھ شک تو اسے بھی تھا آتی جاتی افشاں کو جن نگاہوں سے دیکھتی تھی اس سے شک تو گزرا تھا لیکن وہ ابھی سے اماں کے کان میں سرگوشی کر ڈالے گی یہ نہیں جانتی تھی۔

"پھوپھو۔ خدا کے لیے آپ پھوپھا جان سے بات کر کے انہیں انکار کر دیں۔ مجھے تو وہ طیب ایک آنکھ نہیں بھاتا۔"

افشاں کے لیے تو اس نے شروع سے ہاشم کا خیال کر رکھا تھا۔ خود اماں بھی تو یہی کہتی تھیں، اب وہ کیوں نجو پھوپھو کی بات سن کر خاموش رہیں۔ اسے یہ کیوں نہ کہا اس کا رشتہ تو ہاشم سے ہو گا۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ اگر پھوپھو نے ہاں کر دی تو کیا ہو سکتا ہے؟" فردوس جانتی تھی گھر میں وہی ہوتا آیا تھا جو اماں بی کہہ دیتی تھیں۔ نجو کو تو بھی انکار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"نہیں پھوپھو۔ آپ ہاشم کے مقابلے میں طیب کو کیسے پسند کر سکتی ہیں۔ آپ کو بولنا ہو گا۔" ہاشم اسے اپنے بچوں کی طرح عزیز تھا وہ جانتی تھی وہ بچپن سے افشاں کو پسند کرتا تھا۔ یہ اچانک طیب درمیان میں کہاں سے آگیا تھا۔

"ہاشم کی حد تک تو بات ٹھیک ہے لیکن فخر بھابھی کبھی اس رشتے پر راضی نہیں ہوں گی اور پھر سیانے کہتے ہیں بیٹی کا رشتہ اسے دو جو دل سے تمہاری عزت کرتا ہو۔ فخر بھابھی نے ساری زندگی میرے ساتھ لڑائی جھگڑے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ وہ میری بیٹی کے ساتھ بھی یہی کرے گی۔"

فردوس گویا فخر بھابھی کے بجائے نجمہ کی طرف سے مطمئن تھی۔ اس کا اطمینان دیکھ کر بشریٰ کی بے چینی بڑھ گئی۔

☆☆☆

کشور بیاہ کر چلی گئی تھی لیکن گھر میں ابھی بھی اسی طرح رونق لگی تھی۔ نجو پھوپھو اور ان کے بچے ابھی ادھر تھے شبانہ اچھی ملنسار لڑکی تھی افشاں کا جی چاہتا وہ شبانہ کے پاس بیٹھ کر اسے وقت دے لیکن شادی کی وجہ سے اس کی پڑھائی کا بہت حرج ہو چکا تھا اب وہ مزید وقت ضائع کیے بغیر پڑھائی میں مصروف ہو چکی تھی۔

گرمی بھی آہستہ آہستہ بڑھتی جارہی تھی۔ کمروں میں گھٹن اور گرمی کا احساس بڑھتے گھر کے سب ہی لوگوں کے لیے چھت پر چارپائیاں بچھائی جاتی تھیں۔ وحیدن سر شام ہی چھت پر چارپائیوں پر بستر لگا کر مچھر دانیاں تان دیتی۔ پہلے اس کے ساتھ ان سارے کاموں میں کشور مدد کرتی تھی اب وہ اس کا ہاتھ بٹا دیتی۔ آج بھی اس نے اس کے ساتھ لگ کر سارے بستر بچھائے تھے۔

صبح اس کا ٹیسٹ تھا۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے میں پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔ آج عام دنوں سے کچھ زیادہ گرمی تھی کمرے میں پڑھتے ہوئے اسے گھٹن سی محسوس ہوئی تو وہ کتاب لیے برآمدے میں چلی آئی۔ آنگن میں رات کے گہرے سناٹے گونج رہے تھے۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ پیڑ دن بھر کی گرمی سہنے کے بعد خاموش کھڑے

www.pklibrary.com

تھے۔ وہ کتاب لیے برآمدے میں روشن اکلوتے بلب کے نیچے بیٹھ کر پڑھنے لگ گئی۔ ابھی اسے پڑھتے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اچانک اسے اپنے عقب میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا طیب بھائی چلتے ہوئے طیب کے کافی قریب آ چکے تھے۔ رات کا مہیب سناٹا اس کا یوں اکیلے میں کھڑے ہو کر خود کو دل نشین نظروں سے تاڑتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔

"کوئی کام تھا؟" اس نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

وہ مسکراتا ہوا اور قریب آ گیا۔

"طیب بھائی کیا بات ہے؟"

وہ گھبراہٹ کے مارے کرسی سے اٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوس کی آگ کی لپٹیں اس کی بدن کو چھو رہی تھیں۔ چہرے پر بھی مسکراہٹ میں شیطانی عکس نظر آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر نیچے زمین پر گر گئی۔ ڈر اور خوف سے سارا بدن سوکھے پتے کی طرح کانپ اٹھا۔ پسینے سے ٹھنڈی پڑتی وہ برآمدے کی عقبی دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"طیب بھائی۔۔ ہوش کریں۔۔ میں آپ کی بہنوں جیسی ہوں۔" سوکھے ہونٹ پھڑ پھڑائے تو چند الفاظ زبان سے ادا ہوئے۔ وہ حلق پھاڑ کر چیخنا چاہتی تھی لیکن خوف سے سارے لفظ حلق میں دب گئے۔ وہ دیوار پر ہاتھ رکھے اس کے بہت قریب آ چکا تھا۔

"بہنوں جیسی ہو لیکن بہن تو نہیں ہو۔۔ ویسے بھی امی جان نانی اماں سے میرے اور تمہارے رشتے کی بات کر رہی ہیں۔" اس کی گرم گرم سانسوں کا لمس اسے اندر تک چھو کر گزر گیا۔

"پیچھے ہٹیں، میں شور مچا دوں گی۔" اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا وہ اپنے گھر میں کھڑی ہے۔ اس خیال کے آتے اس کے اندر ڈھیروں ہمت بھر دی۔ اس نے گریبان سے پکڑے اسے پیچھے دھکیلا تب ہی اس نے دیکھا اچانک چھت کی سڑھیاں اتر کر کوئی نیچے آیا تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ حواس باختہ سی ادھر کو دوڑتی ہاشم آن کی آن میں اس پر چیتے کی طرح جھپٹ پڑا تھا۔ وہ اس کا گریبان کھینچتا اسے اس سے کھینچ کر دور لے گیا۔ مکوں تھپڑوں کے ساتھ دونوں گتھم گتھا تھے۔ وہ دیوار کے ساتھ لگی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ شور کی آوازیں سن کر گھر کے باقی لوگ اٹھ گئے تھے۔ سبطین، ثقلین، فضل سب ایک ساتھ آگے بڑھ کر دونوں کو چھڑوانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر آدھی رات کو یہ دونوں کیوں لڑ رہے تھے۔

لیکن دوسرے ہی پل گھٹنوں میں سر دیے فرش پر روتی ہوئی افشاں پر نظر پڑتے اماں بی کی زمانہ شناس نگاہیں ایک پل سب سمجھ گئی تھیں۔

☆☆☆

"ہائے...... ہائے...... غضب خدا کا مار مار کر میرے بچے کو آدھ موا کر ڈالا۔ اس طرح بھی کرتا ہے کوئی اپنوں کے ساتھ۔ اتنی بے دردی سے مارا میرے بچے کو۔ ایسا تو کوئی غیر بھی نہیں کرتا۔ کوئی شرم کوئی لحاظ نہیں رکھا۔" نجوا نے اکلوتے بیٹے کا منہ نیلوں سے بھرا دیکھ کر سینہ پیٹ کر رہ گئی۔

"بھائی صاحب، آپ کے بیٹے نے کوئی کسر نہیں چھوڑی مارنے کی۔ سوتے میں حملہ کیا میرے لال پر۔ میں سوچتی ہوں اگر سب لوگ وقت پر اٹھ کر اسے نہ چھڑواتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا۔" اس کی دہائیاں تو اب ختم نہیں ہونے والی تھیں اس کی نظر میں وہ اب بھی بے قصور تھا۔ میاں جی اس کی باتیں سن کر تاؤ کھا گئے۔

"زیادہ زبان نہیں چلاؤ۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں ہے......" "ان کے علاوہ اس گھر میں اور کوئی اسے چپ نہیں کروا سکتا تھا۔" ہاشم کا کیا تو تمہیں نظر آ گیا۔ بیٹے کے کیے پر اب پردا ڈال رہی ہو۔ ہاشم نے جو کچھ کیا۔ بالکل ٹھیک کیا۔ تمہارے بیٹے

www.pklibrary.com

کو ذرا شرم نہیں آئی گھر کی بیٹی کے ساتھ ایسی گری ہوئی حرکت کرتے۔" ان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسی وقت طیب کو گھر سے نکال باہر کریں بھلے وہ ان کا نواسا تھا لیکن افشاں ان کا خون تھی۔

"پھٹکار پڑے ایسی جوانی پر۔ میری پھول جیسی بچی کو اکیلا دیکھ کر شیطان اتر آیا دماغ میں۔ کسی رشتے کا بھرم نہ رکھا اس نے، تو ہم کیوں اس کا کوئی لحاظ رکھتے۔ ٹھیک کیا ہاشم نے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔"

اماں بھی اسے آڑے ہاتھوں سے شروع ہو گئی جس کی تربیت نے آج یہ دن دکھایا تھا۔

"اماں! آپ سب کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے میرا بچہ ایسا نہیں ہے۔ وہ تو اس گھر کی ساری لڑکیوں کی شبانہ کی طرح عزت کرتا ہے۔ اس نے تو آج تک کبھی باہر کی کسی لڑکی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا پھر افشاں تو اس کے ماموں کی بیٹی ہے اس پر بری نظر کیسے ڈالے گا۔ یہ میرے خلاف کسی نے کوئی چال چلی ہے۔" وہ ابھی بھی اسے بے گناہ ثابت کرنے پر تلی تھی۔

"کسی کو کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی چال چلی ہے۔ ہم سب سمجھتے ہیں اس کے کرتوت بہت پہلے سے مار کھانے کے ہی لائق تھے۔ وہ تو تمہاری حیا اڑے آ جاتی تھی۔" ثقلین تو ابھی بھی اس کی حیا میں زبان پر تالا لگائے بیٹھے تھے لیکن سبطین چپ نہیں رہ سکے۔ وہ جانتے تھے طیب کی ہوا باہر بھی کوئی اچھی نہ تھی۔

"ٹھیک ہے اب جو بھی ہو گیا ہے اس پر مٹی ڈالو۔ ہمیں اس مسئلے کو ہوا دے کر زمانے میں اپنی جگ ہنسائی نہیں کروانی۔ تم بھی زبان بند کرواور اب بچے لو اور اپنے گھر جاؤ۔۔ بہت ہو گیا۔" گھر کا معاملہ تھا تھانے کچہری تک تو نہیں جا سکتے تھے۔ اسی طرح پردہ پوشی ہی ہو سکتی تھی۔

"سبطین۔ انہیں واپسی کی ٹکٹیں کروا کر دو۔ ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ایسے معاملات کو اتنا اچھالنے کی ضرورت نہیں۔ مرد کا تو کچھ نہیں جاتا بیٹی والے ضرور بدنام ہو جاتے ہیں۔"

میاں جی نے اٹھتے ہوئے جہاں نجو کو گھر روانہ ہونے کا حکم دیا تھا وہیں سب کو رات کے واقعے پر پردہ ڈالنے کا بھی کہہ دیا۔

☆☆☆

"تمہیں بڑا شوق ہے دوسروں کے معاملات میں کودنے کا، کیا ضرورت تھی طیب پہ ہاتھ اٹھانے کی؟" اس کا بس نہیں چل رہا تھا اس لڑکے کا کیا کرے جس نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تھا۔ "اگر اسے کچھ ہو جاتا تو سوچو نجمہ تمہیں معاف کرتی۔؟ اکلوتا بیٹا ہے اس کا۔ اور۔ وہ۔ جمال وہ تو کبھی بھی تمہیں نہ چھوڑتا۔ مجھے تو ڈر ہے تھانے میں تمہارے خلاف رپورٹ نہ کروا دے۔"

وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ جب فخر النسا اس کے سر پر آ کر کھڑی ہو گئی۔ جسے پرائی آگ میں کودنے کا شوق چڑھا تھا۔

"طیب پر ہاتھ اٹھانے سے پہلے تم کم از کم کسی سے مشورہ تو کر لیتے۔ کیا خبر وہ آدمی رات کو کسی کے بلانے پر آیا ہو۔"

وحیدن نے جو خوش خبری رشتے کی صورت میں اسے دی تھی اس پر اس کے اپنے بیٹے نے پانی پھیر دیا تھا۔ نجمہ جس طرح بے آبرو ہو کر میکے سے گئی تھی اب لوٹ کر نہ آنے والی تھی۔

اپنی ماں کو افشاں کے بارے میں بدگمان ہوتا دیکھ کر بالوں میں کنگھی کرتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے سنگار میز کے شیشے میں پورے اعتماد سے نظریں ملائیں۔

"وہ ایسی لڑکی نہیں ہے امی۔ میں مان ہی نہیں سکتا وہ طیب جیسے گھٹیا لڑکے کو پسند کرے گی۔ جس کی نظر میں گھر کی لڑکیوں کے لیے عزت نہیں تو وہ دوسری عورتوں کو کیا عزت دے گا۔"

خوشبو میں نہایا ہوا وہ تیار ہو کر اس کی طرف مڑا اس کی صاف شفاف نگاہوں کی پاکیزگی بتا رہی تھی

www.pklibrary.com

اس نے طیب کے ساتھ جو کچھ کیا وہ اسی کا حق دار تھا۔ اس کی بات سن فخر النسا جھنجلا کر رہ گئی۔

"ہاں تمہیں اس کے بارے میں سب پتا ہے وہ کیسی لڑکی ہے۔ پتا نہیں تو ہمیں ہی نہیں پتا۔"

وہ جانتی تھی اس سے بات کرنا فضول تھا وہ وہی کرتا تھا جو اس کے دل میں سما جاتا تھا۔ اس سے مزید الجھنے کے بجائے وہ اخبار پڑھتے سبطین کی طرف مڑی۔

"دیکھ رہے ہیں آپ اس کا قد اب اتنا اونچا ہو گیا ہے یہ اپنے فیصلے خود کرنے لگا ہے۔ کیا صحیح ہے اور کیا غلط اب ہمیں اسے بتانے کی ضرورت نہیں۔ پرائی آگ میں کود کر کیا ملے گا اسے۔"

اس کی طرف سے مایوس ہو کر وہ شوہر کی طرف بڑھی جو ابھی تک اخبار کی سرخیوں پر نظریں گاڑھے بیٹھے تھے اچانک مخاطب کیے جانے پر ترچھی نظروں سے اسے گھور کر رہ گئے۔

"کیسی باتیں کرتی ہو تم۔ یہ آگ پرائی نہیں۔ افشاں ہماری بچی ہے۔ اور یہ بات تم بھی اچھے سے جانتی ہو اماں اور میاں جی نے بچپن سے ان دونوں کے لیے کیا سوچ رکھا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس کا طیب پر ہاتھ اٹھانا غلط نہیں تھا۔"

انہوں نے بھی اسے یاد دلا دیا افشاں کا معاملہ اور ہے۔ ہاشم کا اس کے لیے اسٹینڈ لینا بنتا تھا۔

"واہ جی واہ! اماں کا کہنا سر آنکھوں پر اور میں جو اس کی ماں ہوں میری کوئی اہمیت نہیں۔ اس کے رشتے میں مجھے بولنے کی کوئی اجازت نہیں۔ اماں کون ہوتی ہیں میرے بیٹے کا فیصلہ کرنے والی۔"

اس کے کان کھڑے ہو گئے تھے اماں بی کے فیصلے سن سن کر فردوس کی بیٹی وہ ہر صورت میں اسے دلانے والی تھی۔

امی ابو کے درمیان نیا محاذ کھل گیا تھا۔ بات وہ طیب کی کرنے آئی تھی اور پہنچ گئی تھی اس کے اور افشاں کے رشتے پر اب خدا ہی حافظ تھا۔ وہ چپ چاپ یونیورسٹی جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔ یہ ایسا موضوع تھا جو پچھلے کئی سالوں سے التواء کا شکار تھا۔ ان دیورانی جیٹھانی کی لڑائیوں میں اس کی محبت کب سے سرحد پر کھڑی بارڈر کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

پچھلے دو دن سے وہ تیز بخار میں تپ رہی تھی۔ فردوس ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتے ہوئے چپ چاپ اس کے سرہانے آنسو بہاتی رہی۔ اس واقعے کے بعد ابھی تک گھر پر سوگ کے بادل چھائے تھے۔ گرمیوں کی لمبی اداس دوپہریں گھر میں پھیلے سناٹے کو اور بڑھا رہی تھیں۔ آم کے پیڑ پر لگی کیریاں کچھ دنوں میں پک کر تیار ہونے کو تھیں۔ بشریٰ کے گھر بیٹے کی ولادت بھی اس ماتمی ماحول کو کم کرنے میں ناکام رہی۔ آج اس کی طبیعت کچھ بہتر محسوس ہو رہی تھی وہ اٹھ کر بیٹھی تھی۔ تھوڑا دلیہ بھی کھایا تھا۔ فردوس اس کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی جب اماں بی اسے دیکھنے چلی آئیں۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر دیکھ کر ان کے دل کو تھوڑی تسلی ہوئی۔

"دیکھو بیٹا۔ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا۔ اسے برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔ زندگی میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ جسے بھولنا پڑتا ہے۔ تم ماشاء اللہ سے سمجھ دار ہو، یوں بیمار ہو کر بستر سے لگ جاؤ گی تو تمہاری پڑھائی کا کتنا حرج ہو گا......"

وہ بڑے پیار سے اسے اس رات ہونے والے قصے کو بھول جانے پر تیار کر رہی تھی۔ "زندگی کسی ایک جگہ ٹھہر جانے کا نام نہیں ہے۔ تمہیں بھی یہ سب بھول کر آگے بڑھنا ہو گا۔ پھر ہمیں تم پر پورا یقین ہے، تمہارا دامن پاک ہے۔"

دادی کی باتیں سن کر ایک بار پھر سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میرا کوئی قصور نہیں تھا اماں۔" اس کی پلکوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے۔ "میں نے ہمیشہ طیب بھائی کو بھائیوں کی طرح جانا ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ وہاں آ جائیں گے۔ پتا ہوتا تو میں اپنے کمرے سے

www.pklibrary.com

باہر نہ نکلتی۔" وہ دادی سے لپٹ کر رو پڑی۔ فردوس اکلوتی بیٹی کو روتا دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکی۔

"نہ۔۔۔۔۔۔نہ۔۔۔۔۔۔ میری بچی۔۔۔۔۔۔ رونا نہیں ہمیں پتا ہے۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے۔ میاں جی نے اسی وقت طیب کو گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے اس کی جرات کیسے ہوئی میری پوتی کی طرف میلی نظر ڈالنے کی۔"

اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے سسر کے الفاظ دہرائے۔ اس نے سر اٹھا کر دادی کے چہرے کی طرف دیکھا کہیں وہ نجمہ پھوپھو کی محبت میں اسے تو سزا نہیں دے دیں گی لیکن وہاں صرف اس کی بے گناہی کی تحریر رقم تھی۔

"ہاں بیٹا۔ تمہارے میاں جی تو غصے سے پاگل ہو رہے تھے۔ ایک منٹ بھی اسے اس گھر میں برداشت نہیں کر رہے تھے۔ وہ بھلے ہمارا نواسا ہے لیکن تم تو ہمارا خون ہو۔ تم سے بڑھ کر ہمیں کوئی نہیں ہوسکتا۔"

دادی کی باتوں سے اس کے دل میں پلنے والے سارے وہم دم توڑ گئے تھے۔ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹی ان کی باتیں سن رہی تھی، دل و دماغ پر چھایا غبار آہستہ آہستہ چھٹتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

کئی دنوں کے بعد آج وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تھی دوپہر کا کھانا کھا کر وہ عثمان کو کچھ دیر کھلاتی رہی وہ سو گیا تو صائمہ کو چھٹیوں کا کام کروانے لگ گئی گھر میں اس وقت مکمل سناٹا تھا۔ آم کے پیڑ پر بولتی ککھی کی آواز کبھی کبھی سناٹے میں گونج اٹھتی۔ صائمہ سر جھکائے کاپی پر لکھ رہی تھی۔ تب ہی اس نے دیکھا گیٹ کھول کر ہاشم اندر چلا آیا۔ اس دن کے بعد اس سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ کئی بار خیال آیا جا کر اس کا شکریہ ادا کرے لیکن پھر بڑھتے قدموں کو جیسے زمین جکڑ لیتی پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔

اس کا رخ اس کی طرف تھا۔ سر پر دھوپ سے بچنے کے لیے رکھی کیپ کا سایہ بنائے وہ چلتا ہوا قریب چلا آیا۔

"السلام علیکم چاچو۔" صائمہ نے سر اٹھا کر اسے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام گڑیا۔" اسے پیار سے تھپکاتے ہوئے اس نے جیب سے چاکلیٹ نکال کر اس کی طرف بڑھائی جسے لے کر وہ اندر کی طرف دوڑ گئی۔

وہ وہاں کھڑا اس کی طرف دیکھتا رہا چند دنوں میں وہ کتنی بدل گئی تھی۔ شوخ و چنچل چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ دبلی تو تھی ہی اب تو بہت کمزور لگ رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" پتا نہیں کیوں اس دن کے بعد ان کے درمیان وہ چھیڑ چھاڑ والا رشتہ ایک دم سے سنجیدگی کی نذر ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے یونہی نظریں جھکائے جواب دیا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسے خوف آ رہا تھا۔ کاپی کے صفحے پر بے وجہ انگلی چلا رہی تھی۔

وہ سامنے تھا تو دل عجیب الجھن کا شکار تھا۔ دل کہہ رہا تھا اس نے اس رات وہاں آ کر اس پر اتنا بڑا احسان کیا تھا۔ اس کا فرض بنتا تھا اس کا شکریہ ادا کرے دوسری طرف یہ ڈر بھی تھا پتا نہیں وہ اس کے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا۔ کہیں اس نے بھی بڑی امی کی طرح اسے غلط نہ سمجھا ہو۔ اسی کشمکش میں وہ اس کے سامنے اپنا جھکا سر نہ اٹھا سکی۔

"کچھ کہو گی نہیں۔" وہ سمجھ گیا وہ کسی گہری الجھن میں گھری ہے۔ شاید اس رات ایسا کچھ ہوا ہو جو اسے تنگ کر رہا تھا یا پھر وہ اس کی محبت کا اقرار کرنا چاہتی تھی۔

"و۔ وہ تمہارا بہت شکریہ۔" دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو مروڑتے ہوئے وہ بہت سنبھال کر بولی۔ "تم نے اس رات جس طرح آ کر میری عزت بچائی۔ میں تمہارا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکوں گی۔" اس کی آواز آنسوؤں میں گھلتی چلی

www.pklibrary.com

گئی اس نے دیکھا کتنے بے آواز آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ کر اس کی خالی جھولی میں گرنے لگے۔ "میں تو سوچتی ہوں۔ اگر تم وقت پر نہ آتے تو میرا کیا ہوتا۔" روتے روتے اس نے اچانک سر اٹھا کر پہلی بار اس کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں اس کے چہرے کا احاطہ کیے تھیں۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی تم پر غلط نظر ڈال جائے ایسا میں ہونے نہیں دیتا۔"

مضبوط لہجے میں بولتا ہوا وہ اس کے قریب تخت پر بیٹھ گیا۔ سر سے دھوپ کی کیپ اتر کر اب اس کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی۔ دھوپ اب رنگون بیل کے قرمزی پھولوں سے اتر کر آنگن کے گرم فرش پر رینگنے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ بولنا شروع ہوا تو اب وہ اپنے آنسو صاف کر کے صرف اسے سن رہی تھی۔

"وہ تو طیب کی قسمت اچھی تھی جو اپنی ٹانگوں پر چل کر یہاں سے چلا گیا۔ نجو پھوپھو کی دعائیں کام آگئیں ورنہ تو چار آدمیوں کے سہارے پر یہاں سے جاتا۔ لیکن تم بتاؤ اس کے علاوہ اور تو ایسی کوئی بات نہیں ہے ناں۔"

اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے دل میں اٹھنے والے خدشے کو زبان دی۔ اسے لگا جیسے وہ اندر تک اس کے دل کی تلاشی لے رہا ہو۔ وہ شپٹا گئی۔

"ن۔ نہیں...... نہیں...... اور کچھ نہیں ہوا تھا۔" مارے گھبراہٹ کے اس نے سر کو زور سے ہلا کر پوری ایمانداری سے صفائی پیش کی۔

"اور کچھ کرتا تو میں جان نہیں نکال دیتا اس کی۔" اس کے برابر بیٹھے ہوئے اس کے لہجے کا استحقاق اسے اپنی نظروں میں معتبر کر گیا۔ پیڑ پر ابھی بھی کلسی بول رہی تھی لیکن کچھ دیر پہلے اس کی آواز میں درد کا راگ چھپا تھا اور اب اس کے ساتھ نے اس کے اردگرد ملن کے مدھر گیت چھیڑ دیے تھے۔

☆☆☆

طیب کی حرکت کے بعد اب ہاشم اور افشاں کے رشتے کو لٹکائے رکھنے کا کوئی جواز نہ بنتا تھا۔ الطاف صاحب نے سبطین اور ثقلین میاں کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ فخر النسا اور فردوس ساس سسر کی موجودگی میں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ دل تو دونوں کے دھڑک رہے تھے۔ میاں جی کے چہرے پر چھائی سنجیدگی بتا رہی تھی بات کوئی خاص تھی۔ وہ حقے کی نلی کو بلاوجہ ہی گھما رہے تھے۔ ایک آدھا کش لگا کر گہری سوچ میں پڑ جاتے۔ سبطین اور ثقلین جانتے تھے وہ جب کسی ٹینشن میں ہوتے تو اسی طرح کرتے تھے۔ اماں بی ان کے برابر میں آزردہ سی بیٹھی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا وہ ہاشم اور افشاں کے رشتے کی خواہش رکھتی تھیں لیکن جو کچھ نجمہ کے ساتھ ہوا ایسا بھی نہیں چاہتی تھیں۔

میاں جی نے بیٹوں کو مخاطب کرتے ہوئے کمرے کی خاموشی کو توڑا۔

"جو کچھ طیب نے کیا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ لیکن ہر چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی......"

ان کی جھکی ہوئی گردن بتا رہی تھی وہ اس سارے واقعے پر شرمندہ تھے۔ "بچوں کے شادی بیاہ کے فیصلے جتنے جلدی اور بروقت کر دیے جائیں، اتنے ہی بہتر ہوتے ہیں۔ خود ہمارا دین بھی اسی بات پر زور دیتا ہے۔ کیوں سبطین میاں ٹھیک کہہ رہے ہم؟"

وہ جیسے کوئی فیصلہ سنانے سے پہلے انہیں بتانا چاہ رہے تھے۔

"جی میاں جی! بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بیٹا۔ ثقلین تمہارا بھائی ہے۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں۔ میری اور تمہاری ماں کی شروع سے یہ خواہش رہی ہے تم افشاں کا رشتہ ہاشم کے لیے لے لو۔ اس طرح تم دونوں بھائیوں کا ساتھ بنا رہے گا۔"

بات سن کر فخر النسا کو یا سر گھوم گیا۔ وہ اور بھی بہت کچھ بول رہے تھے لیکن اس کا دماغ تو کہیں اور

www.pklibrary.com

بھٹک رہا تھا۔ فضل کی دفعہ بھی اماں بی نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اس سے بنا پوچھے اپنے خاندان سے بشریٰ کا رشتہ لا کر اس کے سر تھوپ دیا اور نام فضل کا لگا دیا، یہ اس کی خواہش تھی۔ ان کے کہنے کی دیر تھی سعادت مند بیٹوں نے فوراً سر تسلیم جھکا دیے۔

"میاں جی! آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ افشاں میری بھی بیٹی ہے۔ وہ میری بہو بن جائے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہوگی۔"

سبطین سے بھی امید تھی ایسے ہی ملتے جلتے جملے ثقلین کی طرف سے بھی ادا ہوئے تھے۔ وہیں بیٹھے دونوں بھائیوں نے اٹھ کر ایک دوسرے کو گلے لگا لیا۔ تھوڑی دیر میں اشرف سے مٹھائی منگوا کر سب کے منہ میٹھے بھی کروا دیے گئے۔

فخر النسا اور فردوس کے تنے ہوئے چہروں پر کسی نے غور نہ کیا۔ دونوں بنا کچھ کہے سنے وہاں سے اٹھ کر اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیں۔

☆☆☆

"تم بھی منہ میٹھا کر لو۔" سب مٹھائی کھا چکے تو سبطین میاں نے مٹھائی کی پلیٹ بیگم کی طرف بڑھائی۔

"آپ ہی کھائیے۔ آپ کو مبارک ہو یہ نیا رشتہ۔ میری تو نہ کل کوئی حیثیت تھی اور نہ آج کسی نے اس قابل سمجھا۔" اس کا دل جلا تھا، پلیٹ میں پڑے گلاب جامن بھی اسے کونین کی گولیاں نظر آ رہے تھے۔

"ارے بھئی تم لڑکے کی ماں ہو۔ تم سے زیادہ کون اہم ہو سکتا ہے۔ آخر کل کو تو تم نے ہی بہو کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے ہیں۔" سبطین میاں اس کا موڈ بحال کرنے کو زبردستی ہنسے۔

"ہنس لیں۔ ہنس لیں۔ میرے ساتھ تو ہمیشہ سے اس گھر میں یہی ہوتا آیا ہے۔ پہلے بشریٰ کا رشتہ مجھے زبردستی سونپا گیا، اب افشاں کو میرے پلے باندھ دیا گیا۔ کوئی پہلی بار یہ سب نہیں ہوا۔ یہاں صرف اماں بی کی حکومت ہے۔ اس گھر میں تو وہی ہوتا آیا ہے، جو وہ چاہتی ہیں۔"

اپنے کمرے میں دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع ملا تھا۔ شوہر کو دل کا حال سنا رہی تھی جو ہمیشہ سے اس کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔ اس کی بات کو کبھی قابل غور نہ سمجھا تھا۔ اب بھی مسکراتے ہوئے اسے گھر میں رشتہ مل جانے کے فائدے گنوانے لگے۔

"بھئی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے بیٹھے بٹھائے مال دار بہو ہاتھ لگ گئی، نہ تمہیں کہیں جانا پڑا نہ لڑکی والوں کی آؤ بھگت پر کوئی خرچا ہوا۔ شادی پر بھی بہت سارے خرچے بچ جائیں گے۔"

اس کی نظر فائدوں پر کہاں تھی اسے تو یہ سراسر گھاٹے کا سودا لگ رہا تھا۔

"ہاں۔ ہاں بڑے فائدے ہیں۔ سمدھن سے لڑنے کے لیے بھی دور نہیں جانا پڑے گا۔ جب چاہوں گی ہاتھ بڑھا کر لڑائی کر لوں گی۔"

اس کے اور فردوس کے معاملات ان سے چھپے نہ تھے۔ باتوں باتوں میں وہ سب سے بڑا فائدہ بتا کر رہ گئی۔

"ہاہاہا۔" سبطین میاں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"یہ تو بھئی اب تم دونوں پر منحصر ہے۔ پہلے کی طرح لڑتی ہو یا پھر کیا خبر فردوس پر اب تمہاری دھاک بیٹھ جائے۔ آخر کو تم لڑکے کی ماں ہو۔"

☆☆☆

گھنگھور گھٹائیں آج پھر امڈ کر آئی تھیں۔ کالے کالے بادل آنگن میں برسنے کو تیار کھڑے تھے۔ محراب دار برآمدوں میں اڑتے پردے لمبی اڑان بھرنے لگے تو بادلوں نے گھن گرج کے ساتھ برسنا شروع کر دیا۔ آنگن کا پکا لال فرش بوندوں کی ٹپ ٹپ سے گونج اٹھا تھا۔ وہ اچانک سے برستی ساون کی کالی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ باورچی خانے کی کھلی کھڑکی سے اندر آتی ٹھنڈی ہوا نے گرمی کا سارا زور توڑ ڈالا تھا۔ املتاس کے پیلے پھولوں کو

www.pklibrary.com

بارش میں بھیگتا دیکھ کر اس کا اپنا دل بارش میں بھیگنے کو کرنے لگا۔ دیگچی میں چائے کا پانی رکھ کر مڑی تو وہ اچانک اندر چلا آیا۔

"ایک کپ چائے مجھے بھی ملے گی؟" وہ مسکراتا ہوا اس کے قریب چلا آیا۔ جس دن سے ان کا رشتہ طے ہوا تھا وہ اس کا سامنا کرنے سے کترانے لگی تھی۔ آج یوں اچانک اسے سامنے پا کر اس کی دھڑکنیں تیز ہو اٹھیں۔

"جی اچھا۔" اس نے نیچی نظروں سے جواب دیا۔ جیسے کہہ رہی ہو تم باہر جاؤ میں چائے بنا دیتی ہوں۔

"چولہے پر رکھے چائے کے پانی میں پتی چینی ڈال کر مڑی تو وہ ابھی تک وہیں کھڑا اسے دلچسپ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"وہ ...... میں ...... چائے بنا رہی ہوں۔ تم جاؤ۔ میں باہر لا کر دے دوں گی" اسے اپنے پاس کھڑا دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول رہے تھے۔ اس نے سرخ پڑتے چہرے کو اور جھکا کر اسے وہاں سے جانے کی التجا کی۔

"اور اگر نہ جاؤں تو۔"

اس کے لیے اس کا یہ روپ بالکل نیا تھا۔ کہاں وہ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہنے والی لڑکی اور کہاں اب یہ شرم و حیا کا مرقع۔ وہ تو دل و جان سے فدا ہونے کو تیار کھڑا تھا اور وہ اسے باہر بھیج رہی تھی۔

"بھئی، اب تو ہم اندر آ چکے ہیں اب تو تمہیں لے کر ہی یہاں سے جائیں گے۔" اس کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے وہ کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چائے تیار کر کے کپ میں ڈالتے ہوئے وہ بری طرح گھبرا گئی۔

"یہ چائے لو۔ اور۔ پلیز جاؤ یہاں سے۔" اسے چائے کا کپ دے کر وہ اس نے التجا کی۔

"اور اگر نہ جاؤں تو۔" آج اسے ستانے میں اور مزا آ رہا تھا وہ اس کے اور قریب آ گیا۔

"تو پھر میں اماں بی کو بلا لوں گی۔" اسے کسی طرح نہ ٹلتا دیکھ کر اس نے دادی کو آواز دی

"۔اماں۔ اماں بی۔ سنیے کا ذرا۔ ادھر باورچی خانے میں آئیے گا۔" اسے ٹالنے کا اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہ تھا۔ اسے منہ کھول کر دادی کو بلاتا دیکھ کر اب وہ گھبرا گیا۔

"چپ کرو بھئی۔ اماں میرے بارے میں کیا سوچیں گی۔" ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑ کر اسے دوڑتے ہی بنی۔

اسے بھاگتا دیکھ کر وہ پوری حسیات سے مسکرا اٹھی۔ آنگن میں برستی برکھا نے من آنگن میں نئے پھول کھلا دیے تھے۔ وہ اپنی چائے کا کپ لیے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔ باہر ابھی بھی اسی رفتار سے بارش برس رہی تھی۔ بارش کی آواز کے ساتھ اب فخر النسا اور فردوس کے درمیان شروع ہونے والی نئی جھڑپ کی آوازیں بھی اس کے کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔

"ہائے۔ ہائے، غضب خدا کا۔ اتنا سا کام نہ ہو سکا کسی سے۔ کوئی یہ کپڑے ہی الگنی سے اتار دیتا پر کہاں؟ مجال ہے جو اس گھر میں کوئی کسی کے کام آ جائے، خون سفید ہو چکا ہے سب کا۔"

اچانک سے اتر آنے والی بارش نے فخر النسا کے دھلے ہوئے کپڑے بھگو ڈالے تھے۔ وہ سو کر اٹھی تو اپنے کپڑوں کا یہ حشر دیکھ کر اماں بی سے گلہ کر رہی تھی۔

"دیکھ رہی ہیں آپ۔ یہ سب آپ کی چہیتی فردوس کے کارنامے ہیں۔ ذرا دید نہیں اس کی آنکھوں میں۔ برابر میں پڑے اپنے کپڑے سمیٹ لیے اور میرے کپڑوں کو ہاتھ لگانا گوارا نہ کیا۔ بندہ کم از کم آواز دے کر ہی کسی کو بتا دیتا ہے۔ بارش آ گئی ہے تم بھی الگنی سے اپنے کپڑے اتار لو۔"

اس کی بات پر آج پہلی بار اماں کا مزاج بگڑا تھا وہیں بیٹھے انہوں نے پورے جوش سے آواز دے کر فردوس کو باہر بلایا تھا۔

"فردوس ذرا ادھر آئیو۔" اماں بی کی آواز سن

www.pklibrary.com

کر وہ سارے کام چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آ گئی
"جی پھوپھو۔" ان کے پہلو میں بیٹھی فخر النسا کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔
"یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں۔ تم سے مجھے یہ امید نہ تھی۔ تم نے اپنے کپڑے اتار لیے اور فخر النسا کے کپڑوں کو بارش میں بھیگنے کے لیے چھوڑ دیا۔" انہوں نے انگلی سے اڑ کر فرش پر لوٹتے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔
"پھوپھو کی قسم لے لیں۔ کپڑے میں نے نہیں اتارے۔ میں تو خود اندر تھی۔ بادل دیکھ کر میں نے وحیدن سے کہا تھا جا کر الگنیوں سے کپڑے اتار دے"
فخر النسا کے کپڑوں کو بارش میں بھیگتا دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ پہلے کی بات اور تھی وہ صرف اس کی جیٹھانی تھی اب تو اسے بیٹی دے دی تھی۔
وحیدن کا نام سن کر بھی وزیر بیگم کے غصے میں کمی نہ آئی الٹا اسے ہی قصوروار ٹھہرا لیا۔
"وحیدن تو ٹھہری سدا کی کام چور، اس سے کسی کو کیا گلہ۔ قصور تو تمہارا ہے۔ اسے تو جتنا کام کہو وہ اتنا بھی نہیں کرتی۔ تمہیں چاہیے تھا اس سے کہتی الگنیوں پر پڑے سارے کپڑے سمیٹ لے۔"
آج پہلا موقع تھا جب وہ ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرتے ہوئے ترازو فخر النسا کی طرف جھکا رہی تھیں ورنہ تو ہمیشہ سے ہر حال میں فردوس کو ہی صحیح کہا جاتا تھا۔
"پہلے کی بات اور تھی۔۔ تم دونوں کے آپسی جھگڑے چلتے رہتے تھے لیکن اب بات اور ہے۔ اب دیورانی جیٹھانی کا رشتہ پس پشت چلا گیا۔ اب تم دونوں صرف سمدھنیں ہو۔"
ساس کو زندگی میں پہلی بار اپنے حق میں بولتا دیکھ کر آج اس کا سینہ خوشی سے پھول گیا تھا۔ اس کا کیس اماں بی لڑ رہی تھیں۔ وہ ٹھاٹ سے ان کے برابر بیٹھی پان بنا رہی تھی۔ لمبے ستونوں سے لپٹی رنگوں بیل کے گلابی اور قرمزی رنگ کے پھول خوشی سے بارش میں نہا رہے تھے۔
"وہ اس گھر کی بڑی بہو ہے۔ اس کا مرتبہ تم سے کہیں زیادہ ہے۔ اور پھر عمر میں بھی وہ تم سے بڑی ہے۔ چلو آگے بڑھ کر اس سے معافی مانگو۔"
اماں بی نے تو ایک ہی وار میں اس کے سارے پچھلے گلے دھو ڈالے تھے۔ وہ حیرت سے منہ پر ہاتھ رکھے دیکھے جا رہی تھی۔۔۔ یہی سب تو وہ چاہتی تھی۔ وہ بڑی تھی، اسے اگر اسی طرح شروع سے اس کا حق ملتا رہتا تو بدگمانیوں کو پنپنے کا موقعہ ہی نہ ملتا۔
"معافی چاہتی ہوں بھا بھی جان۔ مجھے وحیدن کو اچھے سے سمجھانا چاہیے تھا۔"
اس نے سنا فردوس کی مریل سی آواز ابھری تھی۔ اس نے بھی بڑے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھٹ سے کہا۔
"چلو کوئی بات نہیں۔ کپڑے ہی تھے دوبارہ دھل جائیں گے۔ تم آؤ ادھر یہاں بیٹھو۔ دیکھو موسم کتنا سہانا ہو رہا ہے۔ پھر نجانے ایسا ساون آئے نہ آئے۔ آج میں تمہیں اپنے ہاتھ کا بنا اچھا سا پان کھلاتی ہوں۔"
بارش ابھی بھی زوروں سے برس رہی تھی اس نے فردوس کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔
کون سا والا پان بناؤں تمہارے لیے۔ بھئی مجھے تو زیادہ قوام اور سونف والا پان پسند ہے۔"
اس نے آج دیکھا تھا بڑی امی کا دل دریا کے بہتے پانی کی طرح صاف اور شفاف تھا۔ جس میں ساری کثافتیں دھلنے کے بعد بھی وہ میلا نہیں ہوتا۔
فخر النسا اپنی پسند کا پان بنا کر فردوس کو پاس بٹھا کر کھلا رہی تھی۔ وزیر بیگم دونوں بہوؤں کی آپسی محبت دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھیں۔
وہ کھلی کھڑکی میں کھڑی مسکراتے ہوئے کبھی امی اور تائی کو دیکھتی تو کبھی آسمان سے چھاجوں مینہ برساتی کالی گھٹاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں آج مدت کے بعد ٹوٹ کر برسنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔

☆☆

www.pklibrary.com

ہاجرہ عمران

شیشے کی بگھار



وہ بہت مان اور چاؤ سے چھوٹے بھیا کی دلہن بیاہ کرلائی تھی۔ کیا کچھ جتن نہیں کیے تھے انہوں نے اس شادی کے لیے رشتے کے لیے سارہ کے گھر کے کتنے ہی چکر لگائے۔ سارہ کی اماں کے خدشات دور کیے۔ اپنی شان میں ان کے کہے کتنے ہی گستاخانہ جملوں کو تریاق سمجھ کر رگ جاں میں اتار لیا۔ بھائی کی خوشی پر اپنی انا اور خودداری کو وار کر پھینک دیا۔

کبھی سارہ اور عالم کی مائیں گہری سہیلیاں تھیں۔ سالوں سے ایک ہی محلے میں رہ رہی تھیں۔ دونوں کی کسی بات پر ناراضی ہوگئی۔ مگر سارہ اور عالم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ اسی لیے دونوں ماؤں کے درمیان صلح صفائی کی کوشش میں آپا ہلکان ہوگئیں مگر بھائی کی پسند اسے ملوا کر چھوڑی۔

اس کے بعد شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو آپا نے بہت آرام سے ساری ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھالیں۔ وہ بھائی کی بری بنانے کے چکر میں گھن چکر بن گئیں۔ گھر پینٹ کرا کے مکمل صفائی بھی کروادی۔ اپنے ہاتھوں سے بد کے بتاشے، چھوہارے اور بادام رنگین تھیلیوں میں بھرے۔ بری کے جوڑے اپنے ہاتھوں سے ٹانکے۔ تب کہیں جا کر وہ اپنے ماں باپ اور اکلوتے بھائی کے سامنے سرخرو ہوسکی۔ ماں ان کی بلائیں لیتے نہ تھکتیں اور والد صاحب دلچسپی سے ان کی پھرتیاں ملاحظہ کرتے رہے۔

"اکلوتی بہن ہونا بھی بڑی بھاری ذمہ داری ہے۔ جب ہم نے عاصمہ کی شادی کی اس وقت عالم چھوٹا تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس پر اتنی ذمہ داری کا بوجھ نہیں تھا مگر عالم کی شادی پر عاصمہ نے اپنی گھر گرہستی کے ساتھ ساتھ بھائی کے لیے سارے فرائض بڑی تندہی سے نبھائے ہیں۔ بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں حساس اور محبت کرنے والی۔" وہ عاصمہ کی تعریف میں رطب اللساں رہتے۔

www.pklibrary.com

عاصمہ کی ساس فراخ دل اور سمجھ دار عورت تھیں۔ وہ بہو کو سسرال اور میکے کے درمیان گھن چکر بنے دیکھتیں تو بجائے ناراض ہونے کے خوش ہوتیں۔ ہر آئے گئے کے سامنے عاصمہ کی تعریفوں کے راگ الاپتی رہتیں کہ عاصمہ نے کیسے ساری ذمہ داریاں احسن طریقے سے نبھائی ہیں۔

بچوں کے امتحان سر پر تھے۔ امتحان کے فوراً بعد شادی کی تاریخ تھی۔ دونوں بچوں کے فائنل امتحانات کی تیاری انہوں نے بہت پہلے اور نہایت جاں فشانی سے کرادی تاکہ سسرال والوں کو بات کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ بچوں کے امتحانات کی تھکاوٹ اتری بھی نہیں تھی کہ شادی کا ہنگامہ شروع ہوگیا۔

☆☆☆

سارہ نے شادی کے بعد ہر زبان پر آپا کی شان میں قصے سنے تھے۔ عالم بھی آپا کے مداحوں میں شامل تھا۔ سارہ کو آپا سے نامعلوم سی خار رہنے لگی تھی۔ آپا جب بھی میکے کا چکر لگاتیں اس کے پاس کچھ دیر کے لیے ضرور بیٹھتیں۔ آج بھی دوپہر کے کھانے کے بعد امی لیٹ گئیں تو وہ سارہ کے ساتھ باورچی خانہ سمیٹنے میں مدد دینے لگیں۔ سارہ نے ان سے بچوں کے احوال پوچھنے کے ساتھ ساتھ باتوں کو بگھار بھی لگا رہی تھی۔

جیسے دال کو بگھار لگا کر اس کا ذائقہ بڑھایا جاتا ہے اسی طرح کچھ لوگ اپنی عام سی باتوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے لیے شیخی کا بگھار لگاتے ہیں۔

سارہ شیخی بگھارنے کے فن میں طاق تھی۔ اگلے آدھے گھنٹے میں اپنے میکے اور بھائی کی تعریفوں کے ان گنت پل باندھ چکی تھی۔

عاصی آپا کو سارہ کے بھائی کی جائیداد، گاڑیوں کی تفصیلات زبانی یاد ہو چکی تھیں۔

سارہ کے والد ریٹائرڈ سرکاری ملازم تھے۔ اس کے بڑے بھائی باپ کی جگہ ملازمت پر لگ چکے تھے۔ جبکہ چھوٹے بھائی کا رجحان کاروبار کی طرف تھا۔ سارہ کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ اس کے بھائی کا کاروبار خوب چمک بھی رہا ہے۔ عاصی آپا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے ذہن پر سارہ کے بھائی کا کاروبار کیوں چھایا ہوا ہے۔ انہوں نے گھر آکر اپنے شوہر کے سامنے بھی یہی تذکرہ کیا تو وہ کچھ حیران ہوئے۔

"تم کیا سارہ کے بھائی کے کاروبار اور ترقی سے مرعوب ہوگئی ہو۔" رفیق کی بات سن کر عاصمہ چونک گئیں۔

"نہیں تو...... وہ تو سارہ نے اس بات کا اس قدر تذکرہ کیا کہ بات میرے دماغ سے نکل ہی نہیں رہی۔ میں نے سوچا آپ کے ساتھ بات کروں گی تو شاید ذہن سے زائل ہو جائے۔"

رفیق نے کھانے سے توجہ ہٹا کر پرسوچ انداز میں اپنی نصف بہتر کو دیکھا۔

"لگتا ہے آئندہ کچھ وقت تک سارہ تمہارے حواسوں پر چھانے والی ہے۔"

"کچھ کہا آپ نے رفیق صاحب؟" آپا اپنے خیالات سے چونکیں۔

"جی نہیں۔" وہ واپس کھانے پر جھک گئے۔

سارہ کی ترجیحات آپا سے بہت مختلف تھیں۔ اس کی باتیں فیشن، کپڑوں کی ڈیزائننگ اور برانڈ سے شروع ہوتیں اور شہر کے بہترین شاپنگ مالز اور ہوٹلز پر جاکر ختم ہوتیں۔ آپا کی دنیا گھر، گرہستی، بچے، شوہر، ساس، سسر کے گرد گھومتی۔ ان کی سوچ بجلی، پانی، گیس کے بلوں، بچوں کی فیسوں اور دواؤں تک محدود تھی۔

"میرے بھائی نے بھابھی کے لیے جاپانی گاڑی منگوائی ہے۔ بھابھی اب خود بچوں کو اسکول چھوڑنے جایا کریں گی۔" وہ شیخی بگھارتی۔

اگلی بار ان کے بھائی نے پوش سوسائٹی میں بنگلہ تعمیر کرلیا تھا۔

اس سے اگلی ملاقات میں ان کے بھائی نے دعوت کے بعد مشہور برانڈ کا جوڑا اسے تحفے کے طور پر دیا تھا۔

عاصمہ سارہ سے اچھی خاصی مرعوب رہنے لگی تھیں۔ پہلے بھی وہ اپنی امی کے گھر جاکر ان کا سارا انتظام سنبھال لیتی تھیں۔ بھائی کی شادی کے بعد بھی

pklibrary.com

www.pklibrary.com

وہ پہلے کی طرح گھن چکر بنی رہتیں۔ سارہ کو عاصمہ آپا کی مدد کی عادت ہوگئی تھی ۔وہ اس کا خوب ناجائز فائدہ اٹھاتی۔

☆☆☆

عاصمہ نے آج میاں کی پروموشن کی خوشی میں اپنے گھر والوں کی دعوت کررکھی تھی۔حسب معمول سارہ کا میکا نامہ جاری تھا۔عاصمہ کی ساس بہت دیر سے اسے اپنے میکے کی بے جا تعریفوں میں رطب اللساں دیکھ رہی تھیں۔

موضوع سخن وہ جوڑا تھا جو اسے اس کے میکے سے ملا تھا۔اوراب سلائی کے بعد اس نے پہن رکھا تھا۔

"میری امی اور بھابھی ہمیشہ مہنگے سے مہنگے برانڈ سے میرے لیے کپڑے لیتی ہیں۔برانڈ کی اپنی ہی بات ہے آپا۔اس برانڈ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سلوٹ نہیں پڑتی۔ہزار برانڈڈ کپڑوں میں تساہ برانڈ کے کپڑے باآسانی پہچانے جاتے ہیں۔"

عاصمہ کی ساس اب ٹھوڑی تلے انگلی رکھے سارہ کا برانڈ نامہ سن رہی تھیں۔انہوں نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔

ہماری تو دعا ہے کہ سارہ کی طرح عاصمہ کے میکے سے بھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئیں۔عاصمہ کا بھائی بھی تمہارے بھائی کی طرح گاڑی بنگلے والا ہوجائے۔اور وہاں سے بھی بہن کے لیے برانڈ کا جوڑا تحفے میں آئے۔ ورنہ اکلوتے بھائی کی شادی میں اسے عام سا جوڑا ہی ملا تھا۔"

سارہ نے نخوت سے سوچا۔میرا شوہر گاڑی اور بنگلے کا مالک بنے گا تو اس کا فائدہ مجھے ہی حاصل ہوگا۔ جیسے میرے بھائی کی ترقی کا فائدہ میری بھابھی اٹھارہی ہیں۔میں تو عزت بنانے کے چکر میں بلاوجہ ان کی کامیابی کے شادیانے بجاتی رہتی ہوں۔اپنے پاس سے جوڑے خرید کر میکے کا نام دینا پڑتا ہے۔میرا کیا دماغ خراب ہے اور توبہ ہے میری کیا ناں بہ بیلنے کے نیچے آئی ہے جو عاصمہ آپا کے لیے جوڑے خرید خرید کر انہیں تحفہ دوں وہ بھی برانڈڈ جوڑے......"

عاصمہ آپا کی ساس کی چھاپہ مار بات نے سارہ کو اچھے خاصے امتحان میں ڈال دیا تھا۔

"ویسے جب ترقی ہوگی تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو منیب شادی کا قرضہ اتارلیں یہ بڑی بات ہوگی۔" وہ پوری طرح پلٹی کھا چکی تھی۔

عاصمہ آپا کو تھوڑا سا رنج ہوا۔کاش میرا بھائی بھی اتنا صاحب حیثیت ہوجائے کہ مجھے برانڈڈ جوڑے گفٹ کیا کرے۔مگر سارہ کے پلٹی کھانے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے لیے اسے جو بات پسند ہے وہ عاصمہ کے لیے بالکل بھی پسند نہیں۔

"بھئی سچ پوچھو تو ہماری بہو نے آج تک اپنے بھائی کی تنخواہ کا ذکر بڑھا چڑھا کر نہیں کیا۔اگر وہ ایسا کرتی تو سسرال والوں کی امیدیں بھائی سے بندھ جاتیں اور یہ نہیں اپنے بھائی پر بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی ۔اپنے شوہر کی کمائی میں خوش اور شکر گزار ہے۔نہ اسے ظاہری نمود ونمائش پسند ہے۔سادگی میں ہی خوش ہے۔وہ تو ہر وقت بس بچوں کی تربیت اور خاندان کی بہبود کے بارے میں سوچتی ہے۔بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ عورت کا نصیب وہی ہوتا ہے۔جو اس کے شوہر کی کمائی ہوتی ہے۔بھائی کا کمایا ہوا روپیہ اس کی بیوی کا نصیب ہوتا ہے۔

سارہ سوچ رہی تھی کہ اپنی کم مائیگی کا احساس چھپاتے چھپاتے کبھی کبھار ہم احساس برتری کا گناہ کر بیٹھتے ہیں حالانکہ میرے بھائی نے مکان بنایا یا گاڑی لی مگر بھابھی نے ہمیشہ حالات کا رونا ہی رویا۔میرے نصیب میں تو وہی تھا جو میرا شوہر کماتا ہے اور مجھ پر خرچ کرتا ہے۔اس نے دل ہی دل میں شرمندگی سی محسوس کی۔اور......سوچ اس کے ذہن کے دریچے پر اس طرح ابھری جیسے افق سے خورشید۔

"خواہ مخواہ کی شیخی بگھار کر رشتوں کو خراب نہیں کرنا چاہیے۔"

ادھر عاصمہ آپا نے فخریہ نظروں سے اپنی ساس کو دیکھا جبکہ منیب اور عاصمہ کے والدین کی نگاہوں میں آپا کی ساس کی عزت بڑھ گئی تھی۔

☆☆

www.pklibrary.com

میمونہ صدف

سپاس گزار

پچھلی قسط کا خلاصہ:۔

سموئیل اپنی ممی سے کہتا ہے کہ آئینور کا نکاح اسی وقت ہو گیا تھا اور وہ اسے اس لیے ڈھونڈ رہا ہے کہ اس سے اپنی ایک غلطی کی معافی مانگ سکے۔

رطابہ ذکی سے کہتی ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ تم اخبا کی طرح مجھ سے دوستی کرلو۔

ذکی کہتا ہے کہ یہ جب ہی ممکن ہے جب وہ اس کے ساتھ ایسے رہیں جیسے باقی بچوں کی ماما رہتی ہیں، وہ کچھ شرائط رکھتا ہے۔ جس میں سے ایک یہ کہ زیور بابا سے معافی مانگ کر انہیں واپس رکھ لیں۔

رطابہ غصے میں وہاں سے چلی جاتی ہے۔

شمشاد آئینور کو لینے اس کے کالج پہنچتا ہے تو وہ ناراض ہوتی ہے۔

آئینور کو یاد آتا ہے کہ کیسے اس کا نکاح شمشاد سے ہوا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار کالج ٹرپ پر جا رہی تھی۔ راستے میں شمشاد کے بڑے بھائی دیکھ لیتے ہیں۔ انہیں اس کا اکیلے ٹرپ پر جانا برا لگتا ہے۔ اور اس کے ٹرپ سے واپس آنے کے بعد شمشاد کی ماں نکاح کرنے پر ضد کرتی ہیں۔ اس بار شمشاد بھی آئینور کی نہیں سنتا اور ان دونوں کا نکاح ہو جاتا ہے۔

شمشاد آئینور سے کہتا ہے کہ وہ دبئی بزنس سیٹ کرنے جا رہا ہے اس کا وہاں سیٹل ہونے کا ارادہ ہے۔

آئینور پیپر دے کر نکلی تو ریچل اس سے کہتی ہے کہ تمہارا بوائے فرینڈ گیٹ پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔ گھوم پھر رہی ہو اس کے ساتھ اور عباد کو بھی امیدیں دلا رہی ہو۔ عباد ہی نے اپنے اور تمہارے تعلق کے بارے میں ہمیں بتایا ہے۔

آئینور غصہ میں بول دیتی ہے کہ وہ میرا شوہر ہے۔ بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ اور پھر جا کر عباد کو بھی بہت کچھ سنا دیتی ہے۔

عباد جھٹلا دیتا ہے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کہا ہے۔ آپ میرے لیے صرف عام سی کلاس فیلو ہیں میں اپنے معیار سے نیچے سے نہیں گرتا۔

آئینور کی آنکھ سے قطرہ ٹپکتا ہے اور گھاس میں جذب ہو جاتا ہے۔

اس دن کے بعد سے آئینور کسی کو دکھائی نہیں دیتی ہے۔

دسویں قسط

ٹھیک اس واقعے کے پانچ سال بعد وہ ہسپتال میں تھا جب اس کے موبائل پہ کال آ رہی تھی۔

www.pklibrary.com

مصروف ہونے کی وجہ سے اس نے وہ کال کاٹ دی اور ایسا متعدد بار ہوا۔ ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد جب اس نے موبائل دیکھا تو اس پہ میسج آیا ہوا تھا۔

''عباد آئی وانٹ ٹو ٹاک ٹو یو۔'' نیچے نام لکھا تھا۔ سمیرا حیات۔

کچھ تعجب سے اس نے دوبارہ میسج دیکھا اور متذبذب سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

سمیرا کو اتنے سالوں بعد اس سے کیا بات کرنا تھی۔ میڈیکل کے پانچ سال وہ ہمیشہ اس سے اکھڑی اکھڑی ہی رہی۔ ان دونوں کے درمیان گفتگو کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ وہ اس کے گروپ سے مخاطب بھی ہوتا تھا تو بھی سمیرا یوں بن جاتی جیسے وہ اسے نہ دیکھ رہی ہے نہ سن رہی ہے۔ وہ اس کے لیے جیسے کلاس کا حصہ نہیں تھا۔ اس کی اپنے لیے نفرت وہ سمجھتا تھا، پانچ سال تک دیکھتا آیا تھا۔ پھر اتنے سالوں بعد اس نے خود اس سے کیسے رابطہ کرلیا۔

اس نے کچھ سوچ کر خود ہی کال ملادی۔

''کیسے ہو عباد؟''

''ٹھیک ہوں۔ آپ بتائیں؟'' وہ بھلے اس کی



www.pklibrary.com

ہم جماعت رہی تھی لیکن وہ اسے تم کہنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔

"ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہوں پچھلے دو ہفتوں سے۔ ٹیسٹ پہ ٹیسٹ ہو رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔

"خیریت۔ کیا ہوا آپ کو؟"

"شاید آئینور کی بددعا لگی ہے۔ یا پھر تمہاری۔"

اس نے ناسمجھی سے ناک سکوڑی۔ ان دونوں کا وہاں کیا ذکر تھا بھلا۔

"میں نے کبھی بھی آپ کو بددعا نہیں دی۔ ان فیکٹ ......" وہ رکا اور پھر کچھ توقف سے بولا۔ "آئی ایم سوری سمیرا۔ کالج کی ویلکم میں جو کچھ ہوا اس سب کے لیے آئی ایم رئیلی سوری۔ مجھے یہ معذرت اسی وقت کر لینی چاہیے تھی لیکن شاید معذرت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔ اسی لیے میں بھی یہ مشکل کام نہیں کر پایا۔ مگر یقین کریں پانچ سالوں میں جب جب آپ کو دیکھا میں نادم ہی رہا۔ اپنی ندامت کو میں دکھا تو نہیں سکتا لیکن میں از حد شرمندہ تھا اور رہا ہوں۔"

"تمہیں نادم ہونے کی ضرورت نہیں ہے عباد۔ تمہاری کی گئی بے عزتی کا میں نے اسی وقت بدلا پورا کر دیا تھا لیکن بدلا لے لینے کے بعد بھی مجھے سکون نہیں آیا۔ شاید میں سخت کینہ پرور ہوں۔ آسانی سے معاف کرنا میری فطرت میں نہیں ہے۔ جو ایک بار برا لگ جائے وہ ہمیشہ ہی مجھے برا لگتا ہے چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو۔"

سموئیل خاموش رہا۔ پھر جیسے وہ طنزیہ ہنس دی

"کینسر ڈائیگناز ہوا ہے مجھے۔"

سموئیل کو کرنٹ لگا۔ "کینسر؟"

"بریسٹ کینسر۔ اسٹیج ٹو۔ ڈاکٹرز کہہ تو رہے ہیں کہ خطرے کی زیادہ بات نہیں ہے لیکن کینسر کا نام ہی خطرہ ہے اور میں خود ڈاکٹر ہوں تو جانتی ہوں کہ ڈاکٹرز کو تسلیاں دینے کی عادت ہے۔"

"سو سیڈ ٹو ہیئر دس۔" اسے سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کہتا۔ اسے سچ میں افسوس ہوا تھا۔ اتنی چھوٹی عمر میں وہ اتنی بڑی بیماری کا شکار ہو گئی تھی۔

"دو ہفتوں سے سوچ رہی ہوں کہ بیٹھے بیٹھے یہ سب کیا ہو گیا۔ چھ مہینے پہلے ہی تو میری شادی ہوئی ہے۔ ابھی تو زندگی شروع ہوئی تھی اور یک دم ختم ہو گئی۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"زندگی ختم نہیں ہوئی سمیرا ۔۔۔ وقت سے پتا چل گیا بیماری کا اور ٹریٹمنٹ شروع ہو گیا ہے تو یقیناً اللہ شفا بھی عطا کرے گا۔ یقیناً اس آزمائش میں کوئی بہتری ہو گی۔"

وہ طنزیہ ہنسی۔

"بہتری یہی ہے کہ مجھے شدت سے پچھتاوا ہونے لگا ہے کہ میں نے تمہاری اور آئینور کی زندگی تباہ کر دی۔ اسی لیے تو شاید اپنی زندگی کی تباہی دیکھ رہی ہوں۔" سموئیل پھر سے چونکا۔

"ایسے کیوں کہہ رہی ہیں آپ؟"

"کیونکہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے اور آئینور کے درمیان تمام فساد میری وجہ سے پیدا ہوا تھا عباد۔"

سموئیل دم سادھ کر رہ گیا۔ وہ کیا کہنے جا رہی تھی۔

"یہ میں تھی جس نے ریچل سے وہ سب کروایا۔ یہ میں تھی جس سے تمہاری اور آئینور کی خوشی برداشت نہیں ہو سکی کیونکہ میں تمہیں سکون میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ میں تمہارے اور آئینور کے درمیان اتنی بدگمانی پیدا کرنا چاہتی تھی کہ تم دونوں کبھی ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھو۔"

اور اس دن کے بعد سے ان دونوں نے کہاں ایک دوسرے کی شکل دیکھی تھی۔

"ریچل تو یوں بھی تمہارے لیے پاگل تھی تو میرا اسے یہ کہہ دینا کہ عباد آئینور سے محبت کرتا ہے اسے مزید پاگل کر گیا تھا۔ اور اس نے آئینور کو تمہاری

www.pklibrary.com

نظروں میں گرانے کے لیے ہی کبھی تم سے اس کے بارے میں غلط بیانی کی اور کبھی آئینور سے تمہارے بارے میں الٹی سیدھی باتیں کیں تا کہ وہ تم سے بدگمان ہو جائے۔۔لیکن سچ یہ ہے کہ اس سارے فساد کے پیچھے کا ماسٹر مائنڈ میں تھی۔ساری چال میری تھی، ریچل تو بس مہرہ تھی۔" سموئیل کو لگا اسے سانس آنا بند ہو گئی تھی۔

"آخری دفعہ جب وہ تم سے الجھی تھی تو اس وقت بھی ہم دونوں نے اس کا دماغ تمہارے خلاف بھرا تھا۔ہم نے اس کے کردار پہ انگلی اٹھاتے تمہیں بھی گھسیٹ لیا تھا۔اسی لیے وہ تم پر جا کر پھٹ پڑی۔" سموئیل نے تکلیف سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"یہ کیا کر دیا تم دونوں نے؟" وہ مدھم سا بولا۔

"یہ سب میں نے کیا عباد۔میں یہ بھول گئی کہ وہ میری دوست تھی۔بس یاد اتنا رہا کہ وہ تمہاری پسند تھی۔حسد اور کینے نے مجھے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیا۔"

"عداوت مجھ سے تھی، اس بھلی لڑکی کے ساتھ کیوں یہ ظلم کیا سمیرا؟ ایک مضبوط کردار کے انسان کے لیے اس کا کردار ہی سب سے قیمتی متاع ہوتا ہے اور ہم نے مل کر اس کی وہ قیمتی متاع اس سے چھین لی۔"

"اسی لیے سزا کاٹ رہی ہوں۔یونہی اس حال میں نہیں پہنچی۔ہاتھوں کی کمائی ہے جو سامنے آ رہی ہے۔" وہ یہ تک نہیں کہہ سکتا تھا کہ ٹھیک ہو رہا ہے جو سزا کاٹ رہی ہو۔کسی کی تکلیف پہ ایسا سوچنا بھی اس کے لیے گناہ کے مترادف تھا۔

"وہ لڑکا جو آئینور کو لینے آتا تھا جسے ریچل اس کا بوائے فرینڈ کہتی تھی وہ دراصل اس کا شوہر تھا۔" سموئیل کو پہلے سے بھی زیادہ شدید دھچکا لگا۔

"شوہر؟"

"ہمیں بھی اسی دن پتا چلا جب ہمارا لاسٹ وائیوا تھا۔اس کا نکاح ہو چکا تھا اس لڑکے سے۔اسی لیے وہ اسے پک کرتا تھا۔آئینور ایسی نہیں تھی کہ کسی بھی لڑکے کے ساتھ چلی جاتی یہ بات میں جانتی تھی لیکن اس کا ادراک نہیں تھا کہ وہ اس کا شوہر ہو گا۔" سموئیل سے مزید نہیں سنا گیا اور اس نے کال کاٹ دی۔

فون اس کی گود میں گرا تھا اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپائے اپنے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ تو جانتا تھا کہ آئینور ایسی نہیں ہے پھر وہ کیوں ریچل کی الٹی سیدھی کسی بھی بات پہ یقین کر بیٹھا تھا۔کیا وہ ریچل کو جانتا نہیں تھا۔شاید سمیرا اگر فون پہ اس بات کی تصدیق نہ کرتی کہ آئینور کا کوئی بوائے فرینڈ ہے تو وہ بھی اتنا بدگمان نہ ہوتا۔اسے لگا تھا کہ سمیرا آئینور کی دوست ہے اور پانچ سالہ دوستی میں مخلصی خود بخود آ جاتی ہے لیکن وہ غلط تھا۔

"اور میں نے اسے کیا کیا کہہ دیا۔میں نے بڑے مہذب انداز میں اسے بدکردار کہا۔گری ہوئی۔معیار سے کم تر لڑکی۔اوہ اللہ۔" اس نے غصے سے اپنے بال نوچے۔

"سموئیل عباد صاحب۔تب ہی تو آپ کی سزا ہے کہ آپ پانچ سال بعد بھی اسے نہیں بھولے جس کا پانچ سال پہلے نکاح ہو چکا تھا۔اب تک تو وہ کسی کی بیوی، کسی کی ماں بن چکی ہو گی۔۔اپنے گھر میں اپنے رشتوں سمیت سکون سے جی رہی ہو گی۔اور آپ۔یہی آپ کی سزا ہے کہ آپ اس کی یاد لے کر جئیں۔" اندر سے کوئی اس پہ ہنس رہا تھا۔

ایک دو تھپڑ اس نے اپنے ہی منہ پہ جڑے اور چہرہ ہاتھوں میں گرا کر رو دیا۔

"ڈھونڈو اس لڑکی کو چاہے وہ پاتال میں ہی کیوں نہ چلی گئی ہو۔اسے ڈھونڈو اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگو ورنہ یہ بوجھ لے کر ہی ساری زندگی پھرنا پڑے گا۔"

یہ اس کا ضمیر تھا جو اسے سزا سنا رہا تھا اور تب سے اب تک آٹھ مہینے ہونے کو آئے تھے وہ سزا

www.pklibrary.com

کاٹ رہا تھا۔

☆☆☆

فاطمہ نے ہاؤس جاب کے لیے اپنے کالج سے ملحقہ کسی ٹیچنگ ہسپتال کو نہیں چنا تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس دن پورے کالج کے سامنے وہ بے لباس ہو گئی تھی۔ اب وہ کسی کا سامنا کبھی بھی نہیں کر سکتی۔ اس دن گھر لوٹ کر وہ دو دن کمرے میں بند بس روتی رہی تھی۔ عباد کی نظروں میں اس کے لیے ہمیشہ اتنا احترام رہا تھا جتنا وہ دیکھنا چاہتی تھی۔ مرد کم ہی کسی لڑکی کا احترام کرتا ہے اور جس کا کرتا ہے وہ واقعی اس کی حق دار ہوتی ہے۔ اسے لگتا تھا کہ وہ عزت اور احترام اس کا حق ہے جو اسے مل رہا ہے۔ اس نے ساری زندگی اپنے نسوانی پندار کو کسی آبگینے کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ بہت محتاط ہو کر رہی تھی۔ فالتو بھی کسی سے کوئی بات نہیں کی۔ اپنی ذات کے گرد ایک احاطہ قائم کر رکھا تھا جسے کوئی پار نہیں کر سکتا تھا لیکن اب ایک جھٹکے میں سب تباہ ہو گیا وہ بھی اسی مرد کے ہاتھوں جس نے اسے خود اپنی نظروں میں محترم بنایا تھا۔ ابا اس سے کئی بار پوچھ چکے تھے کہ کیا ہوا ہے، اس کی متورم آنکھیں اور ناک یہ بتانے کے لیے کافی تھے کہ کچھ ہوا ہے لیکن کیا ہوا تھا وہ کبھی مر کر بھی ابا کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اس نے لب سی لیے تھے۔ اب ان لبوں سے کبھی سموئیل عباد کا نام نہیں نکلنا تھا یہ طے تھا۔

"میں خالہ کے پاس جا رہی ہوں۔ وہیں رہ کر ہاؤس جاب کروں گی۔" نجانے کب اس نے بالا ہی بالا سب طے بھی کر لیا۔ خالہ سے بھی بات کر لی اور اب ابا کو بتا رہی تھی۔ ابا کو بتا دینا کافی ہوتا تھا کہ امی کو تو ابا ہی منا لیتے تھے۔

"یہاں رہ کر ہاؤس جاب کرنے میں کیا مسئلہ ہے بیٹا۔۔۔؟ تم اپنی کلاس کی ٹاپرز میں سے ہو۔ تمہیں تو بیڈ ہاؤس جاب بڑے آرام سے مل جائے گی اور وہ بھی تمہارے مرضی کے کسی بھی ڈیپارٹمنٹ میں۔" ابا کو اس کے فیصلے کی وجہ سمجھ نہ آسکی۔

"میں یہاں کے کسی ہسپتال میں ہاؤس جاب نہیں کرنا چاہتی۔"

"مگر کیوں؟ ایسا کیا ہوا ہے فاطمہ۔ مجھے بتاؤ۔ میری پریشانی مت بڑھاؤ۔" انہیں اب سچ مچ تشویش ہونے لگی تھی۔

"بس کسی دوست سے جھگڑا ہوا ہے۔ مجھے اب اس کی شکل نہیں دیکھنا۔" وہ اتنا ہی بتا سکتی تھی جو کافی حد تک سچ بھی تھا۔

"تو تم اس ہسپتال میں مت جاؤ جہاں وہ ہے۔ یہاں اور بھی بہت سے ہسپتال ہیں۔" یہ بھلا اتنا آسان کہاں تھا۔

"اس لڑائی کو ایک دنیا نے دیکھا ہے ابا۔ میں ان میں سے کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی۔" یہ کہنا بھی تکلیف دہ تھا۔

"سوچ لو اچھی طرح سے۔ دوسرے شہر میں رہنا بہت سے مسائل پیدا کر دے گا۔"

"میں سب طے کر چکی ہوں۔ اگلے ہفتے میں جا رہی ہوں خالہ کے پاس۔" ابا بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔

"تمہیں ایک بار شمشاد سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ اب ہم سے زیادہ وہ تمہارا گارجین ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس حوالے سے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ اب وہ اپنے ہر عمل کے لیے اس کے سامنے جواب دہ ہے۔

"اسے بتا دوں گی۔"

اس نے شمشاد کو فون پہ بتا دیا تھا۔ وہ بھی اگلے ہفتے دبئی جا رہا تھا۔ اس کی بات سن کر کچھ الجھ گیا۔

"دوسرے شہر جا کر رہنے کی کیا تک ہے یار۔ یہاں بھی تو ہوتی ہو گی نا جو تم نے کرنی ہے۔ جب کالج یہاں ہے، ہسپتال یہاں ہیں تو دوسرے شہر جانے کی کیا سوجھی ہے تمہیں؟"

فاطمہ کے لیے جھوٹ بولنا مشکل امر تھا مگر وہ

www.pklibrary.com

اسے سچ بتا کر اپنی شامت نہیں بلوا سکتی تھی۔ وہ اسے یہ بتا دیتی کہ وہ کسی سے فرار چاہتی ہے اسی لیے جا رہی ہے تو وہ اس بندے کی نسلیں کھنگال ڈالتا جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

"ہوتی ہے یہاں بھی ہاؤس جاب مگر مجھے جس شعبے میں کرنی ہے وہ یہاں نہیں ہے۔" جھوٹ بولنا مشکل تھا لیکن اس نے بول ہی لیا۔ شمشاد کا منہ بن گیا۔

"یہاں اتنے بڑے ہسپتالوں میں شعبہ نہیں ہے اور وہاں جہلم کے چھوٹے سے ہسپتالوں میں شعبہ ہوگا۔"

کچھ متامل سے اسے کہنا پڑا۔

"شعبہ تو یہاں ہے مگر جگہ نہیں ہے۔" شمشاد کو ان باتوں کا زیادہ علم نہیں تھا۔ اس کے خاندان اور واقف کاروں میں دور دور تک کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔

"تو جو ڈھیر شعبے ہیں یہاں، ان میں سے کسی ایک میں کرلو۔ جاب ہی ہے کوئی زندگی موت کا مسئلہ تھوڑا ہی ہے۔" مطلب کہنا تھا ہی پورا کرنا ہے تو کسی میں بھی کروا لو۔ جان چھڑاؤ۔

"میں اپنی مرضی سے جگہ کا انتخاب چاہتی ہوں جہاں میں سکون سے کام کرسکوں۔"

"مجھے تو یہ بالکل بھی ٹھیک نہیں لگ رہا۔"

"لیکن میں مطمئن ہوں اسی لیے جا رہی ہوں۔"

"جب فیصلہ کر ہی لیا ہے تو مجھے کیوں بتا رہی ہو۔ جاؤ۔ یوں بھی تم مجھے سمجھتی ہی کیا ہو؟ میری اہمیت تمہاری نظر میں دو کوڑی کی بھی نہیں ہے۔" شمشاد نے غصے سے کال بند کردی۔

فاطمہ کو اپنا رشتہ کہیں سے بھی رطابہ اور دانش سے مختلف نہیں لگا تھا۔ وہ دونوں بھی ایسے ہی تھے۔ رطابہ فیصلے کر کے دانش پہ مسلط کرنے کی کوشش کرتی جس پہ وہ چڑتا تھا۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔ کیا واقعی انسان کی تعلیم اس میں احساس برتری انڈیل دیتی ہے۔ اسے خود پہ افسوس ہوا۔

"ابھی مجھے مت روکیں۔ اگلی دفعہ جو کہیں گے بنا چوں چرا اس کے مان لوں گی۔" اس نے بس اسے پیغام بھیجا تھا۔

"سوچ لو۔ اگلی بار جو کہوں گا پھر وہ ماننا ہی پڑے گا۔ تم زبان دے رہی ہو۔" کچھ دیر بعد اس کا میسج آیا تھا۔

"سوچ لیا۔" اس نے جلدی سے جواب بھیجا لیکن اس وقت وہ بالکل بھی یہ تصور نہیں کرسکتی تھی کہ اگلی بار جو وہ کہنے والا ہے وہ ایک طوفان لانے والا ہے۔

وہ خالہ کے پاس جہلم چلی گئی تھی اور شمشاد دبئی لیکن اپنی فیملی کی جانب سے اسے بہت کچھ سننے کو ملا تھا کہ اس کو بیوی کو حد میں رکھنا نہیں آتا، لگام ڈالنا نہیں آتا۔ جیسے تیسے اس نے فاطمہ کی وجہ سے وہ سب باتیں برداشت کرلیں۔ یہ کون سا پہلی مرتبہ تھا۔

ہاؤس جاب میں وہ بے حد مصروف ہوگئی۔ گھر بات بھی کم ہی ہوتی اور شمشاد سے تو بالکل ہی کم۔ لیکن جب بھی وقت ہوتا وہ اسے کال کرلیتی۔ جب تہیہ کر ہی لیا تھا کہ اس رشتے کو وفا سے نبھانا ہے تو وہ اپنی پوری کوشش کرنا چاہتی تھی۔ تب ہی تو وہ جو اندر ایک نسوانی انا تھی اسے ایک طرف رکھ ڈالا اور بیوی کا چولا پہن کر شوہر کو کال کرنے میں ہمیشہ پہل کرنے لگی۔ بیویوں کو شوہروں کے لیے اپنی انا اور حیا کو ایک طرف رکھ دینے میں کوئی ایسی قباحت نہیں ہے۔ اس نے بھی یہی کیا۔

اس نے دبئی جاتے ہی اسے وہاں سے موبائل بھیجا تھا۔ فاطمہ نے شکریہ کہنے کے لیے اسے کال کی تھی۔

"تم گھر جاتی ہو تو کم از کم میرے گھر والوں سے مل ہی لیا کرو۔ وہ اب تمہارے بھی گھر والے ہیں۔"

وہ ویک اینڈ پہ گھر گئی تھی اور اس کے گھر والوں سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ اس پہ شمشاد کی ماما نے کافی

www.pklibrary.com

شور وغل مچایا تھا۔ شمشاد بھی اس بات پہ اس سے خفا تھا۔

''رخصتی سے پہلے ہی منہ اٹھا کر مجھے سسرال جانا بالکل بھی مناسب نہیں لگتا۔ انہیں ملنا تھا تو خود آ سکتے تھے۔'' اسے شمشاد کے گھر والوں کا شکوہ برا لگا تھا۔

''تم کون سا کسی کو بتا کر کہیں آتی جاتی ہو۔ اپنی مرضی کی مالک ہو۔''

وہ اسے طعنے دینے پہ آ گیا تھا۔ نیا رشتہ جو بننے جا رہا تھا اس میں بھی اسے ہمیشہ طعنے ہی سننا تھا۔ کیا کوئی ایسا رشتہ بھی بن پائے گا اس کا جو طعنوں تشنوں سے پاک ہو۔

''ٹھیک ہے۔ اگلی بار بتا کر جاؤں گی۔'' اس نے بات ہی ختم کر ڈالی۔

اگلی بار وہ بتا کر ہی گئی تھی لیکن شمشاد کی ماما نے پچھلی بار کا بدلا نکالا کہ نہ خود اس سے ملنے گئیں اور نہ کسی کو جانے دیا۔ ہمدان تھا جو چھپ کر دادی سے اس سے ملنے آ گیا تھا۔

''اتنا مس کرتا ہوں نا آپ کو۔ پتا نہیں کہاں جا کر بیٹھ گئی ہیں دنیا کے دوسرے کونے میں۔''

''تم تو یوں بھی اتنی بڑی کلاس میں آ گئے ہو کہ میں اب تمہیں نہیں پڑھا سکتی۔'' وہ اب بھی اس کے بچوں کی طرح روٹھنے پہ مسکرا دی۔

''پڑھائی لکھائی کے علاوہ بھی کوئی تعلق ہے ہمارا۔ کبھی تو اس پڑھائی لکھائی سے نکل کر بھی سوچا کریں۔ جب تک آپ سے بات نہ کر لوں۔ سکون نہیں آتا۔ میسج کرو تو جواب نہیں، کال کرو تو اٹھاتی نہیں۔''

''بہت زیادہ بزی ہو گئی ہوں۔'' وہ بیچ میں بعض اوقات چھتیس اور بعض اوقات اڑتالیس گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی تھی۔ اس کے بعد تو بس وہ لمبی تان کر سوتی کہ موبائل کا کسے ہوش ہوتا۔ بجتا رہتا کسی کونے میں پڑا اس کی بلا سے۔ کبھی سائلنٹ پہ ہی لگا ہوتا۔ اٹھ کر دیکھ بھی لیتی تو اتنی آواز آ رہی ہوتی کہ واپس کال کرنے کا دل ہی نہ چاہتا۔

''بڑی کا تو پتا نہیں بدل ضرور گئی ہیں۔ پہلے جیسی بات نہیں رہی اب۔''

وہ ہمدان کو بس دیکھ کر رہ گئی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا اب پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی۔ اپنا غرور، وقار کھو کر پہلے سی بات کہاں رہتی ہے۔

''تمہارے لیے ہمیشہ پہلے جیسی ہی رہوں گی میرے توتے۔'' وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اب اس کے گال پہ چٹکی کاٹتے اسے عجیب سا لگتا تھا۔

''بس پرندے ہی ہیں ہمدان سے ملانے کو۔ چاچو کا کبوتر، چاچی کا توتا۔ دادی کا کوا، ماما کا عقاب۔۔۔ بس کسی کا گدھ نہ بن جاؤں۔'' برے برے منہ بناتا وہ فاطمہ کو ہنسانے لگ گیا۔

شروع کے چھ مہینے اس نے میڈیسن میں لگائے اور اگلے چھ مہینے پیڈز میں۔ اس کا ارادہ پیڈز میں ہی اسپیشلائزیشن کا تھا جس کا اظہار اس نے ایک بار شمشاد سے کر ڈالا۔

''اسپیشلسٹ؟'' وہ کچھ الجھا۔

''وہ بننے کے لیے تم مزید پڑھو گی؟''

''پڑھنا تو پڑتا ہی ہے۔ پڑھے بنا کیسے آگے بڑھے جا سکتا ہے۔''

''رہنے دو پھر۔'' اس نے بےزاری سے منع کر دیا۔

''جتنا پڑھ لیا ہے بہت ہے۔ پڑھ پڑھ کر تم میرے اور اپنے درمیان تعلیمی فرق کو بڑھاتی جا رہی ہو۔ کل کو یہ مت کہنا کہ اب ماسٹرز کے بعد پی ایچ ڈی بھی کرو کیونکہ میں بڑی ڈاکٹر بن چکی ہوں۔ میں ماسٹرز ہی کر لوں تو سمجھو پی ایچ ڈی ہو گئی۔ مزید نہیں پڑھنا میں نے۔''

''آپ کو نہیں کہوں گی پڑھنے کے لیے لیکن مجھے پڑھنے سے مت روکیں۔''

''تم نے ڈاکٹر بننا تھا وہ تم بن گئی۔ اب بس کرو یہ پڑھائیاں وڑائیاں اور شادی کی تیاریاں کرو۔ ہاؤس جاب تمہاری بس ختم ہے۔ اگلے مہینے میں بھی

www.pklibrary.com

پاکستان آرہا ہوں۔ میرا بزنس یہاں پاؤں جما چکا ہے۔ اچھا بھی چل جائے گا۔ اس بار میں اکیلے آنے کے بجائے تمہارے ساتھ واپس دبئی آنا چاہتا ہوں ۔" فاطمہ بالکل گنگ رہ گئی۔ اب ان دونوں میں مزید بحث ہونا تھی۔ وہ کیا کرتی کہ ان دونوں کی ذہنیت اتنی مختلف تھی کہ بنا بحث کے کوئی معاملہ حل ہوتا ہی نہیں تھا۔

"ہم اس بارے میں پھر بات کریں گے۔"

اسے لگا تھا کہ اس بات کو فی الحال یہیں تمام کر دیا جائے اور بعد میں چھیڑا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ بعد میں وہ اسے منا لے گی لیکن شمشاد اس موڈ میں نہیں تھا۔

"پھر کوئی بات نہیں۔۔۔ جو بات ہو رہی ہے وہ ابھی ہو رہی ہے اور میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے ڈاکٹر بننا تھا تمہاری وہ خواہش پوری ہو چکی ہے۔ اب تم نہ کوئی نوکری کرو گی نہ مزید پڑھو گی۔" فاطمہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"کیا مطلب نوکری نہیں کروں گی؟ یہ نوکری کا یہاں کیا ذکر؟"

"جو بھی اسے بولتے ہیں پریکٹس۔ وہ تم نہیں کرو گی۔ کسی کلینک یا ہسپتال نہیں جاؤ گی۔ نہ کوئی اپنا سیٹ اپ بناؤ گی۔ مجھے اپنے گھر میں گھر کا سکون اور ماحول چاہیے، ہسپتال کا نہیں۔"

"شمشاد۔" اس کی بات پہ وہ بالکل ششدر رہ گئی تھی۔ اب جبکہ پرواز کا وقت تھا وہ اس کے پر کاٹنے کی بات کر رہا تھا۔

"تمہیں کہا تھا نا کہ جتنی شرائط لگانی ہے لگا لو۔ میں ایک ہی بار منواؤں گا اپنی شرط۔ تو میری شرط یہی تھی کہ تم نوکری نہیں کرو گی آئندہ فاطمہ، کیونکہ مجھے کوئی ورکنگ لیڈی نہیں چاہیے۔" فاطمہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ اس شخص نے اسے کہاں لا کر پہنچا تھا۔

"میں ڈاکٹر بن رہی تھی تو آپ جانتے تھے نا کہ میں ورکنگ لیڈی ہی ہوں گی۔"

"ضروری تو نہیں ہے کہ ہر ڈاکٹر نوکری بھی کرے۔ لاکھوں لڑکیاں ہیں جو ڈاکٹر ہو کر بھی گھر سنبھال رہی ہیں۔"

"ایک لڑکی کو ڈاکٹر بنا کر گھر بٹھا دینا۔ اس میں ملک وقوم کا بھی نقصان ہے اور اس لڑکی کا بھی حق مارنا ہے۔" وہ اسے نرمی سے سمجھانے لگی۔ قائل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"بات سنو۔ ملک وقوم کی مجھے رتی بھر پروا نہیں ہے۔ میں نے نہ اس ملک میں رہنا ہے نہ قوم میری سگی ہے جس کی فکر میں گھلا جاؤں۔ مجھے کیا ملک وقوم سے۔ جہاں تک تمہاری بات ہے تمہیں ہمیشہ تمہارا حق دیا ہے۔ اب تم مجھے میرا حق دو اور اس سب کو ختم کرو۔ ڈگری تمہیں ملنا تھی، مل گئی۔ بات ختم۔ اب مزید مشکلات مت کھڑی کرو۔"

اف۔ وہ کیسے اس شخص کو قائل کرتی جس کی سوچ محدود تھی۔

"شمشاد بات کو سمجھیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

"تم نے کہا تھا کہ تمہیں جہلم جانے دوں۔ اگلی بار تم میری ہر بات بنا چوں چرا اس کے مان لو گی۔ زبان دے کر پھر رہی ہو۔" اس نے یاد دلایا۔

"پھر نہیں رہی میں لیکن......"

"یار تم بحث بہت کرتی ہو۔ ٹھیک کہتی تھیں ماما کہ پڑھی لکھی لڑکیاں بس اپنی ہی کہنا جانتی ہیں۔" وہ چپ ہو گئی اور کال کاٹ دی۔

دو دن بعد پھر سے اس نے کال کی تھی لیکن وہ اس موضوع پہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی ہلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس کی ہاؤس جاب ختم ہو گئی تو وہ واپس گھر آ گئی۔ گھر لوٹ کر اس نے دو ہفتے کا وقفہ لیا اور قریبی ایک ہسپتال میں نوکری شروع کر دی۔ دو دن بعد ہی شمشاد کی کال آ گئی۔

"تم نوکری کر رہی ہو؟"

اف کبوتر اف۔ اس نے ہمدان پہ دانت پیسے

www.pklibrary.com

"گھر نہیں بیٹھ سکتی میں کیونکہ مجھے پریکٹس کرنا ہے۔"

"میں نے منع جو کیا ہے۔" اس بار وہ چلایا تھا۔ یہ پہلی بار تھا کہ وہ اس پہ چلایا تھا اور فاطمہ بالکل برف کی بن گئی تھی۔ بالکل فریز۔

"تم پہ کون سی بات کا اثر ہوتا ہے آئینور فاطمہ؟ تم جیسی خود سر اور ہٹ دھرم لڑکی میں نے نہیں دیکھی۔" فاطمہ کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔ یہ اس کی ذات پہ حملہ تھا۔

"مطلب تم نے سوچ رکھا ہے کہ میں جو بکواس کروں گا وہ تم کبھی نہیں سنو گی۔" وہ ساکت و صامت سی کھڑی سن رہی تھی جو اس پہ چلا رہا تھا۔ یہ پہلی بار تھا۔

"تم نے شروع سے ہی تہیہ کر لیا تھا کہ تم مجھے دبا کر رکھو گی۔ ہمیشہ اپنی انا کو اوپر رکھو گی۔"

اس کو جیسے ہوش آیا۔ اسے اپنے لیے کچھ بولنا تھا۔ خاموشی سے اسے چلاتے ہوئے نہیں سننا تھا۔

"میں اپنا رائٹ مانگ رہی ہوں جس کو آپ دبا رہے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔ تم نے ڈاکٹری پڑھنا تھی، پڑھ لی۔ اب بس۔ اور نہیں۔ اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" فاطمہ نے آنسو صاف کیے۔

"کیا یہ سچ تھا کہ آپ نے میرا انتخاب صرف اس لیے کیا کہ آپ کو ایک ڈاکٹر بیوی چاہیے تھی؟" اس کے سوال پہ شمشاد بالکل چپ ہو گیا اور فاطمہ کو اپنا جواب مل گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی ماں سالوں پہلے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ ہی تھی جو بے وقوف بنتی رہی۔

"اور چونکہ اب میں ڈاکٹر بن گئی ہوں تو آپ کی خواہش پوری ہو گئی۔ آپ کی سب میں واہ واہ ہو گئی کہ اس کی بیگم ڈاکٹر ہے۔ یہ ڈاکٹر بیگم کا تمغہ آپ کو سینے پہ سجانا تھا جس کے لیے آپ نے مجھے استعمال کیا۔ اس سے زیادہ آپ کچھ چاہتے نہیں تھے اس لیے اب میں کیا چاہتی ہوں اس سے آپ کو سروکار نہیں رہا۔" وہ ہنوز خاموش تھا۔

"بہت شکریہ۔۔۔ جس پسند کو محبت اور نجانے کیا کیا بتایا گیا تھا وہ بالآخر ایک خواہش تھی۔ آج آپ نے یہ ثابت کر دیا۔" کال اس نے بنا کسی جواب کے کاٹ دی تھی۔ شمشاد پھر کال ملاتا رہا لیکن اس نے اٹینڈ نہیں کی۔ اس نے میسج بھیجا۔

"ڈرو اس وقت سے جب تم کال کرتے کرتے پاگل ہو جاؤ اور میں بھی ایسے اٹینڈ نہ کروں۔" وہ واقعی ڈر گئی۔ اگلی بار اس کے کال کرنے پہ اس نے کال اٹھا لی۔

"میں اگلے ہفتے کی فلائٹ سے پاکستان آ رہا ہوں۔ ماما آئیں گی ڈیٹ فکس کرنے۔ میں چاہتا ہوں تم ذہنی طور پہ تیار رہو۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"مجھے رخصتی پہ اعتراض نہیں ہے۔"

"شکر ہے کسی بات پہ تمہیں بھی اعتراض نہیں ہے۔" وہ طنزیہ ہنسا لیکن فاطمہ کو اس کا طنز چبھا تھا۔ وہ پہلے ایسے بات نہیں کرتا تھا۔

"پلیز مجھے جاب اور اسپیشلائزیشن سے مت روکیں۔" اگر وہ اس کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی۔

"اس بار میں تمہاری بات نہیں مان سکتا فاطمہ۔ کیوں کہ ہر بات ماننے والی نہیں ہوتی۔"

اس نے لب بھینچ لیے۔

"میں ہفتے کی رات کو پہنچوں گا۔ تب تک تم یہ نوکری والا معاملہ ختم کرو۔ بھابھیاں تمہیں ڈیٹ فکس ہوتے ہی مائیوں بٹھا دیں گی۔۔۔ وہ ابٹن وغیرہ جو بھی ہوتا ہے، وہ لگانے کا ہمارے خاندان میں بڑا رواج ہے دلہن کو۔ ہماری دادی کہتی تھیں کہ دلہن پہ روپ اچھا آتا ہے۔" وہ بات کے اختتام پہ ہنس دیا اور فاطمہ رو دی۔

پھر وہ اسے اپنی کی گئی شاپنگ کے متعلق بتانے لگا جو فاطمہ نے سنی ان سنی کر دیں۔ اسے مردوں کی

www.pklibrary.com

خریداری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"شمشاد۔" اس سے پہلے کہ وہ کال کاٹ دیتا اسے اپنا موقف پیش کرنا تھا۔" میں جاب نہیں چھوڑوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"
وہ یک دم خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر پہلے کا جوش مفقود ہو چکا تھا۔
"چاہے مجھے ہی چھوڑنا پڑے؟" فاطمہ کا دل لرزا تھا۔ اسے چھوڑنے کا مطلب وہ جانتی تھی۔ چھوڑنا اتنا آسان نہیں رہا تھا اب۔
"تم جیسی لڑکی شوہر تو چھوڑ سکتی ہے لیکن ضد نہیں۔" کال کٹ گئی اور ساتھ فاطمہ کا دل بھی۔
"مجھ جیسی لڑکی۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔ ہتک سے گال تمتمانے لگے۔
موبائل ایک طرف ڈال دیا۔ آنکھیں بھل بھل آنسو بہانے لگیں۔
"میں کیسی لڑکی ہوں؟" اسے بری طرح عباد یاد آیا۔ اس نے بھی ایسے ہی اسے 'تم جیسی لڑکی' کہا تھا۔" میں کیسی لڑکی ہوں اللہ کہ ہر مرد مجھے یہ طعنہ مارتا ہے۔ کیا میں سچ میں ایک بری لڑکی ہوں۔ بدکردار ہوں۔ گھر توڑنے والی ہوں۔؟؟ کیا اتنی محنتوں اور سنبھل سنبھل کر زندگی گزارنے کے بعد مجھے دوسروں سے حقارت سے یہی سننا تھا۔"
اس نے آنکھوں سے آنسو بار بار صاف کیے لیکن وہ پھر سے بہنے لگ جاتے۔
ابھی کتنے امتحان اور تھے۔ وہ تھک گئی تھی اتنے سالوں کے مسلسل امتحانات سے۔ محنت نے اسے نہیں تھکایا تھا۔ تھکایا تو اسے اردگرد کے رویوں نے تھا۔ ہمارے گرد اتنی منفی کردار ہیں، اتنے منفی رشتے ہیں جو ہماری مثبت سوچ، مثبت توانائی کو تباہ کرنے میں ہی لگے رہتے ہیں۔
شمشاد نے کہا کہ وہ ضد لگا کر بیٹھی ہے؟ کیا یہ ضد تھی۔ اس نے طعنہ دیا کہ اس جیسی لڑکی شوہر چھوڑ سکتی ہے۔ کیا وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس کے لیے شوہر چھوڑ دینا بہت آسان تھا۔ وہ تو کہتا تھا کہ اس کی مخلصی سے متاثر ہوا تھا، اسی مخلصی سے متاثر ہو کر اس نے رشتہ جوڑا تھا پھر کیسے اتنی آسانی سے اس نے اسے گھر توڑنے والی لڑکیوں میں شامل کر ڈالا تھا۔ کہاں گئی وہ مخلصی، رشتوں کے لیے سچائی جیسے خیالات جو وہ اس کے بارے میں رکھتا تھا۔
اس نے روتے ہوئے آستین سے آنسو پونچھے۔
"میں نے کبھی کسی کی باتوں پہ، زندگی کے حالات پہ ہار نہیں مانی۔ اب بھی میں لڑوں گی جب تک لڑ سکی۔ میں نے ہارنا نہیں سیکھا شمشاد۔" منفیت انسان کو کمزور کر دیتی ہے اور ایسے ہر منفی خیال کو رد کر کے اس نے مثبت سوچتے ہوئے زندگی کا یہ محاذ لڑنے کا بھی فیصلہ کر لیا۔
ہفتے کی رات گزر گئی اور وہ پاکستان نہیں آیا۔ یہ بات اسے ہمدان سے پتا چلی تھی کہ وہ پاکستان نہیں آیا۔ گھر والے اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھا۔ نہ کسی کی کال اٹھاتا تھا نہ ہی میسج کا جواب دیتا تھا۔ گھر والے الگ پریشان تھے اور وہ الگ پریشان تھی۔ اس کی ساس اسے کوسنے دیتی تھیں کہ ان کا بیٹا اس کی وجہ سے پاکستان نہیں آیا۔ یہ اسے گھر کے بھیدی نے بتایا تھا۔ انہیں لگتا تھا کہ اس سب کے پیچھے فاطمہ ہی وجہ ہے۔
کچھ دن بعد ابا اس کے کمرے میں آئے تھے۔ ابا جب کبھی بھی اس کے کمرے میں آتے کوئی خاص بات ہی کرنا ہوتی تھی۔ وہ اسی وقت ہسپتال سے لوٹی تھی۔ تھکی ہوئی تھی اور سونے کی تیاری کر رہی تھی۔
"ابا۔۔۔ آئیں بیٹھیں۔" ابا کو دروازے میں کھڑا دیکھ کر وہ چونکی۔ وہ بستر پہ لیٹی ہوئی تھی، اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جلدی سے پاس پڑا دوپٹا اوڑھ لیا۔
"سو رہی ہو تو میں بعد میں آتا ہوں۔" وہ واپس پلٹنے لگے۔
"نہیں ابا۔ پلیز آ جائیں۔ میں بس یونہی

www.pklibrary.com

آرام کرنے کے لیے لیٹی تھی کہ ذرا کمر سیدھی کر لوں۔"

ابا سامنے صوفے پہ بیٹھ گئے۔

"لمبی ڈیوٹی تھی۔ کل کی گئی ہوئی آج لوٹی ہو۔" وہ مسکرادی۔

"سب ڈاکٹرز کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے شروع میں۔"

ابا بغور اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔

"جو کہنا چاہتے ہیں پلیز کہیں۔" اسے ابا کی نظروں سے الجھن ہونے لگی۔

"شمشاد کا فون آیا ہے تمہیں؟" وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔ فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

"کب سے نہیں آیا؟"

اس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ کب سے فون نہیں آیا۔ ابا پوچھ رہے تھے تو وہ سوچ رہی تھی کہ دو ہفتے پہلے اس کا آخری بار فون آیا تھا۔ اب وہ کسی سے رابطے میں نہیں تھا جو تشویش کی بات تھی۔

"کیوں پوچھ رہے ہیں۔ خیریت؟"

"کوئی بات ہوئی ہے تم دونوں کے درمیان؟" فاطمہ نے اس ضد کا ذکر نہیں کیا جو شمشاد کے نزدیک فاطمہ لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔

"مجھے اس کا فون آیا تھا فاطمہ۔" وہ چونکی۔

"آپ کو؟" وہ کسی سے بھی رابطے میں نہیں تھا اور اس نے ابا کو کال کی۔

"تم جانتی ہو نا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟" تو گویا وہ ابا کو بتا چکا تھا۔

"جو وہ چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا آپ جانتے ہیں۔ میں کبھی اس کی یہ بات نہیں مان سکتی۔ پچھلے دس سال کی جدوجہد اس لیے نہیں کی کہ آخر میں بس گھر بیٹھ جاؤں اور کھانے بنا بنا کر میاں کا پیٹ بھروں۔ وہ مجھ سے جیسی بیوی بننے کا کہے گا میں بن جاؤں گی، اس کے سانچے میں ڈھل جاؤں گی لیکن اپنا پروفیشن نہیں چھوڑوں گی۔ اور اس بار آپ اس کی طرف داری نہیں کریں گے کیونکہ اس کا مطالبہ غلط ہے۔" ابا بس اسے دیکھ کر رہ گئے۔ وہ جانتے تھے کہ شمشاد نے ایک غلط مطالبہ کیا ہے۔ کسی عام بی اے پاس لڑکی کو گھر بٹھا دینا اور ایک پروفیشنل ڈگری ہولڈر وہ بھی ڈاکٹر کو گھر بٹھا دینا الگ بات تھی۔ لیکن وہ اسے اس مدعا پہ نہیں سمجھا سکتے تھے کیونکہ وہ اس خاندان سے تعلق رکھتا تھا جسے پڑھائی لکھائی میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی نہ ان کے نزدیک اعلا تعلیم کی کوئی اہمیت تھی۔ ان کا دماغ بس حساب کتاب کرنا جانتا تھا کیونکہ وہ سب کاروباری لوگ تھے۔ انہیں اس وقت بس افسوس ہو رہا تھا۔ کہ اپنی ہونہار بیٹی کا رشتہ کرتے ہوئے انہوں نے جلدی کر دی۔ وہ شخص اس سے ذہنی مطابقت نہیں رکھتا تھا اور جتنا بھی پڑھ لکھ جاتا، اس کی ڈگریاں اسے یہ سمجھ نہیں دے سکتی تھیں کہ وہ ایک لڑکی کا حق مار رہا ہے۔

"وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔"

"تو آپ مجھے یہاں سمجھانے آئے ہیں؟"

"نہیں۔ لیکن یوں اپنی اپنی ضد لگا کر اڑ جانے سے مسائل مزید بڑھ جائیں گے۔ ہمیں مسئلے کو حل کرنا ہے، مزید الجھانا نہیں ہے۔"

"وہ کہتا ہے تو اس کی انا کی تسکین کے لیے میں ہاتھ جوڑ لیتی ہوں، پاؤں پڑ جاتی ہوں مگر اس کی بات نہیں مان سکتی۔ اسے کہیں کہ ایسی شرط رکھے جو ماننا میرے لیے ممکن ہو۔ میری جان تو نہ مانگے۔ میں نے بھی اس سے اس کی جان نہیں مانگی تھی۔" اپنا وقار وہ ایک بار کھو چکی تھی۔ اب اسے کھونے سے ڈر نہیں لگتا تھا لیکن زندگی کا خواب وہ آخری منزل پہ پہنچ کر توڑ نہیں سکتی تھی۔

"افسوس تو یہی ہے کہ وہ یہ نہیں کہتا۔"

"ابا!" وہ بستر سے اتر کر ان کے سامنے آکر بیٹھ گئی۔

"مجھے وقت دیں۔ میں اسے منا لوں گی۔ مجھ پہ یقین رکھیں کہ میں اسے منا لوں گی۔ بس اماں کو کچھ مت بتائیے گا۔ وہ میری مشکلات کو کبھی نہیں سمجھ

www.pklibrary.com

سکتیں۔"

اس وقت یہ بات کہتے ہوئے اسے خود بھی یقین نہیں تھا کہ وہ شمشاد کی اس ضد کا کیا توڑ کرے گی۔ اسے کیسے سمجھائے گی، کیسے منائے گی۔ بس ابا نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔ اس کے سر پہ ہاتھ دھرا اور اٹھ کر چلے گئے۔ ابا کو تو اس نے کسی حد تک مطمئن کر دیا تھا لیکن خود بے آرام ہو گئی تھی۔

اس دن کے بعد سے وہ شمشاد کو کال ملاتی رہی لیکن اس نے نہیں اٹھائی۔ وہ جب جب موبائل ہاتھ میں تھامتی اسے کال ملانے لگتی، متواتر ملاتی لیکن وہ نہ ریجکٹ کرتا نہ ہی اٹھاتا۔

اس نے کہا تھا اس وقت سے ڈرو جب تم کال کرو گی اور میں نہیں اٹھاؤں گا۔ وہ سچ میں ڈر گئی تھی اور بہت ڈر گئی تھی۔

اس نے کئی پیغامات بھیجے۔

"پلیز شمشاد۔ میری کال اٹینڈ کریں۔ مجھ سے بات کریں۔ میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" لیکن وہ اس کے پیغامات تک نہیں دیکھ رہا تھا۔

اتنی محبت کے دعوے کرنے والا ایک دم کیسے اتنا بدل گیا تھا۔ کیا لوگ اتنی آسانی سے بدل جایا کرتے ہیں۔

وہ اسی وقت اسے پھر سے کال ملانے لگی۔ خلاف توقع اس نے کال اٹھالی۔

"شمشاد۔۔" اسے یقین نہیں آیا کہ دوسری طرف وہ لائن پہ تھا۔

"بولو۔" اکھڑا سا لہجہ۔

"شمشاد سب آپ کے لیے بہت پریشان ہیں۔"

"میں بالکل بھی دوسروں کی پریشانی کا سننے میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ وہ بات کرو جس کے لیے کال کی ہے۔" اتنا روکھا اور اجنبی انداز۔ وہ بالکل بھی پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

"شمشاد۔ آپ پاکستان آجائیں پلیز۔ میں آپ کے سامنے آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اس کی بات پہ کچھ دیر بالکل خاموشی ہو گئی اور پھر ایک قہقہہ گونجا۔ فاطمہ نے بے یقینی سے اسپیکر سے ابھرنے والے قہقہے کو سنا۔ اس میں کیا اتنا ہنسنے والی بات تھی اسے سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ تو بالکل سنجیدہ تھی۔

"آئینور۔ آئینور۔ آئینور۔ تم کبھی وہ نہیں بن سکتیں جو میں چاہتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، شاید تمہارے لیے ہی کہتے ہیں۔" فاطمہ نے لب بھینچ لیے۔ اس کا انداز اور لہجہ دونوں برے تھے۔

"تم ابھی بھی اپنی اسی بات پہ قائم ہو اور چاہتی ہو کہ میں پاکستان آؤں تاکہ تم منتیں ترلے کر کے مجھے منالو۔ ہے نا؟" لہجہ طنزیہ تھا لیکن وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا اسی لیے فاطمہ نے کچھ نہیں کہا۔

"اب بھی تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہاری بات ہی مانوں، تمہیں میری کوئی بات ماننا گوارا نہیں ہے۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ ایسا نہیں ہے لیکن اس سے نہیں کہا گیا۔

"مجھے لگا تھا کہ شاید تم ایک بہترین بیوی ثابت ہو گی لیکن میں غلط تھا......" اس نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔ "ماما ٹھیک کہتی تھیں پڑھی لکھی لڑکی اتنی بددماغ ہوتی ہے کہ وہ بھی گھرداری کر ہی نہیں سکتی۔ اسے بس نوکری کرنے کا خبط ہوتا ہے۔"

"میں گھر سنبھال سکتی ہوں مگر......"

"مگر تم نوکری بھی کرو گی۔" اس کی بات اس نے جھٹ اچک لی۔

"اور تمہیں لگتا ہے کہ ڈاکٹری جیسی مشکل نوکری کے ساتھ تم گھر سنبھال لو گی۔ مجھے وقت دے دو گی۔ تم اتنی ہی پرفیکٹ ہو۔ ہے نا؟" طنز پہ طنز۔

"مجھے محنت کی عادت ہے۔ میں کر لوں گی سب۔ بس آپ مان جائیں۔" مزید ایک بلند قہقہہ سنائی دیا تو اس نے موبائل کو کان سے تھوڑا دور کیا۔

"کبھی کبھار مجھے تم پہ ترس آتا ہے۔ جانتی ہو

www.pklibrary.com

کیوں؟"

وہ خاموش رہی۔

"جیسے گدھے کو بوجھ اٹھانے کی عادت ہوتی ہے نا۔اس کے بنا اس کی زندگی بے کار ہوتی ہے ویسے ہی تمہیں بھی بوجھ اٹھانے کا خبط ہے۔ایک شخص تمہیں آسودہ زندگی دینا چاہتا ہے لیکن تمہیں اپنی جان کو سختی میں ڈالنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔تم اس کے بنا بے کار ہو۔" فاطمہ کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر گرا۔محنت کرنے میں کیا برائی تھی۔وہ کبھی بھی دنیا کی اس قوم کی ذہنیت کو نہیں سمجھ سکی جو محنت کو گالی اور سختی کو گدھا سمجھتی تھی۔

"تم اب تک اسی فیصلے پہ بضد ہو تو سن لو آئینور فاطمہ، کہ میں بھی اپنے فیصلے پہ بضد ہوں اور تب تک پاکستان نہیں آؤں گا جب تک تم اپنی ضد نہیں چھوڑو گی۔بھلے میری طرف سے ساری زندگی بیٹھی رہو۔"

"اگر میں ضد نہ چھوڑوں تو؟" ڈرتے کانپتے دل سے اس نے ہمت کر ڈالی پوچھنے کی۔

"تو مجھے چھوڑ دینا۔" وہ اتنا سنجیدہ تھا کہ اس کی سانس رک گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے کال بند ہوگئی لیکن وہ اسی طرح بالکل گم صم سی موبائل کان سے لگائے کھڑی رہی۔

☆☆☆

زیور بابا اپنے کمرے کے باہر ہی دھوپ میں بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے جب ذکی ان کے پاس منہ بسورے پہنچا۔

"بابا! میرے ساتھ پارک چلیں گے؟"

اس کے ان دنوں امتحانات ہو رہے تھے اور رطابہ نے ہسپتال جانے سے پہلے اسے تاکید کی تھی کہ وہ بیٹھ کر اردو کی تیاری کرے۔واپس آ کر وہ اس کا ٹیسٹ لے گی۔ذکی کی اردو اس کے ہم عمر دیگر بچوں کی طرح کمزور ہی تھی اسی لیے رطابہ چاہتی تھی کہ وہ خاص طور پہ اردو پہ دھیان دے۔برے نمبروں کی وہ اپنی اولاد سے بالکل توقع نہیں کرتی تھی چاہے وہ کسی بھی مضمون میں ہوں۔پڑھ پڑھ کر وہ اکتا گیا تھا اسی لیے کہیں باہر جا کر کچھ سکون چاہتا تھا۔

"چلتے ہیں۔کیوں نہیں؟" گو پارک گھر سے بالکل سامنے ہی تھا لیکن اس وقت سنسان ہی ہوتا تھا۔سیکیورٹی کا یوں بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اذکار کم ہی اکیلا باہر نکلتا تھا۔

انہوں نے جلدی سے قرآن اندر جا کر رکھ دیا۔جب سے زیور بابا کو کاموں سے ایک طرف کیا تھا وہ سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے بس عبادت ہی کرتے رہتے تھے۔کبھی قرآن پڑھ رہے ہوتے تو کبھی تسبیحات یا نوافل۔

"آپ سارا دن کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر بور نہیں ہوتے؟" وہ ساتھ فٹ بال بھی لے آیا تھا کہ کھیل سکے۔اسے ہی اچھال رہا تھا۔

"بڑھاپے میں اب کیا کر سکتا ہے انسان سوائے رب کی یاد کو زیادہ کرنے کے؟" وہ مسکرا دیے۔وہ آہستہ چلنے لگے تھے۔جسم کی توانائی خود بخود کم ہوگئی تھی۔

"میں آپ کو موبائل دیتا ہوں آپ وہ دیکھا کریں۔"

بابا ہنس کر ٹھہر گئے۔

"مجھے استعمال نہیں آتا موبائل کا۔یوں بھی شوق نہیں ہے۔اس پہ بھلا میرا کیا کام کہ میں اسے استعمال کروں۔" ان کے پاس سادہ بٹنوں والا موبائل تک نہیں تھا۔کرنل صاحب نے خود خرید کر بھی دیا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔

"یوز کرنا میں سکھا دوں گا اور اس پہ آپ اچھے اچھے اسلامی لیکچر سن سکتے ہیں۔قرآت سن سکتے ہیں۔میں بھی سنتا ہوں۔بہت اچھا لگتا ہے۔" زیور بابا نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ اسلامی لیکچر سنتے ہیں بابا؟" ایک دس سال کے بچے کے منہ سے ایسی بات سننا بہت حیران

www.pklibrary.com

کن تھا۔

"جی۔۔اکثر سنتا ہوں۔"

"کیا سنتے ہو لیکچرز میں؟" انہوں نے اشتیاق سے پوچھا۔ بابا کا پر اشتیاق لہجہ اس کے لیے حوصلہ افزائی کا سبب بنا تو وہ بھی پر جوش سا ہو کر بتانے لگا۔

"جب دل پریشان ہو تو لیکچر سنتا ہوں تا کہ سکون ملے۔ بابا مجھے بہت سکون ملتا ہے ایسی باتیں سن کر۔ جس میں بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں سب لوگ امتحان کے لیے آئے ہیں۔ بس سب کا امتحان مختلف ہے۔ جس میں صبر کی باتیں کی جاتی ہیں۔ جس میں امید دلائی جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے میرا امتحان میرے والدین ہیں اور مجھے صبر سے اس امتحان کو حل کرنا ہے۔"

زیور بابا اسے دیکھتے رہ گئے۔ انہیں افسوس ہوا۔ وہ جانتے تھے کہ اس کے اندر بے سکونی ہے۔ اسی بے سکونی کو دور کرنے کے لیے وہ لیکچرز سنتا تھا۔ اس کی عمر کے بچوں کو موبائل پہ گیمز کھیلنے، کارٹون دیکھنے سے فرصت نہیں ملتی تھی اور وہ۔ یہ بھی شکر تھا کہ اس نے کوئی غلط راہ سکون کی تلاش میں نہیں اپنائی۔

"اللہ کی یاد سے سکون ملتا ہے بیٹا۔" انہوں نے دل میں اس کے لیے دکھ محسوس کیا۔ وہ اپنے تمام پیارے رشتوں کے درمیان رہ کر بھی ایسا بے سکون تھا۔

"لیکن اگلے دن پھر سے دل ویسا ہی بے سکون ہو جاتا ہے۔ کیا کیا کروں پھر؟"

"جب ہم بیمار ہوں اور کم دوائی سے آرام نہ آ رہا ہو تو کیا کرتے ہیں؟"

"دوائی زیادہ لیتے ہیں۔" بابا نے سر ہلایا۔

"تم بھی سکون کے لیے مقدار بڑھا دو۔ اگر سکون ملتا ہی ہے تو پھر زیادہ سن لیا کرو۔" اذکار نے سر ہلایا۔

"مجھے یہ سب سننے سے عجیب طرح کی طاقت ملتی ہے اور پھر مجھے احساس ہوتا ہے کہ میرا دل بہت کمزور ہو گیا ہے بابا۔ ذرا سی بات پہ پریشان ہو جاتا ہے۔ رونا آ جاتا ہے مجھے اور میرے دوست میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ لڑکے رویا نہیں کرتے۔ میں کیا کروں کہ مجھ سے اپنا رونا کنٹرول نہیں ہوتا۔" بابا نے اسے ساتھ لگا لیا۔

"رونا بری بات تو نہیں ہے۔ ہر بشر کو رونا آتا ہے چاہے وہ مرد ہو یا عورت۔ لیکن ذرا ذرا سی بات پہ رونا کمزوری کی علامت ہے اور ہمیں بہادر بننا ہے، کمزور نہیں۔ بہادری اسی میں ہے کہ دل کو سمجھایا جائے کہ ذرا ذرا سی بات پہ پریشان مت ہو۔ مشکل وقت میں مضبوط رہنا سیکھے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ روتے رہو گے تو کیسے بڑی باتوں کا مقابلہ کرو گے۔"

"بڑی باتیں کیا ہوتی ہیں؟ مجھے تو یہی باتیں بڑی لگتی ہیں جو مجھے رلاتی ہیں۔" بابا اسے کیا بتاتے کہ زندگی میں بہت بڑے دکھ بھی اٹھانے پڑتے ہیں۔

"کچھ باتیں اس سے بھی بڑی ہوتی ہیں جن پہ تم روتے ہو۔ جیسے دیکھو میں جب چھوٹا تھا تو میری اماں فوت ہو گئیں۔ یہ ایک بڑا دکھ تھا۔ میں رویا تھا لیکن پھر میں نے خود کو بہادر کر لیا۔ پھر ابا مجھے یہاں اکیلا چھوڑ گئے۔ میں پھر بھی رویا تھا لیکن پھر میں نے حالات کو قبول کر لیا۔ پھر ابا بھی مجھے دنیا میں لاوارث چھوڑ گئے۔ یہ دکھ بھی بڑا تھا اور میں رویا لیکن میں نے صبر کرنا سیکھ لیا۔ یہ بڑے دکھ تھے لیکن میں نے ان کا مقابلہ کیا۔ ایسے دکھ سب کی زندگی میں آتے ہیں اور ہمیں ان کا مقابلہ بہادر بن کر کرنا ہوتا ہے۔ ہر وقت روتے سے انسان کمزور ہو جاتا ہے اور اللہ کو مضبوط بہادر انسان پسند ہے۔ کیا تم ایسے نہیں بننا چاہتے کہ اللہ تمہیں پسند کریں؟" اذکار نے جھٹ سے سر اثبات میں ہلایا۔

"تو بات بات پہ مت رویا کرو۔ ٹھیک ہے؟"

"کوشش کروں گا۔ جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔" بابا مسکرا دیے اور اس کے ہاتھ پہ بوسہ دیا۔

www.pklibrary.com

"ذکی بابا! آپ دنیا میں اللہ کی طرف سے بھیجے ایک پیارے سے فرشتے ہیں۔ معصوم اور سادہ سے۔ آپ کے اندر ایک حساس اور پاکیزہ روح ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کی ہمیشہ مدد فرمائے اور آپ کو ایسا ہی رکھے۔" دوسرا بوسہ انہوں نے اس کی آنکھوں کا لیا۔

"میرا کوئی اپنا نہیں ہے لیکن آپ مجھے ایسے ہی پیارے ہیں جیسے سگی اولاد کی اولاد ہو۔" اس کے بالوں پہ ایک بوسہ دیا۔

"ہے بڈھے۔" رطابہ اس بری طرح چلائی کہ وہ دونوں کانپ اٹھے۔ مڑ کر دیکھا تو وہ دانت پیس کر، بھینچی مٹھیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔

اپنا بیگ اور سامان اس نے وہیں گھاس پہ گرا دیا اور بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئی۔ ذکی اور بابا بس حیران کھڑے تھے۔

"گھٹیا انسان میرے بچے کو کیوں چوم چاٹ رہا ہے؟" اس نے قریب آ کر ذکی کو پرے کیا اور بابا کو دھکا دیا۔

"چھوٹی بی بی! میں تو......" بابا کے لیے یہ سب کسی صدمے سے کم نہ تھا۔

"ہمت کیسے ہوئی میرے بچے کو ہاتھ لگانے کی، چومنے کی۔ میرا بیٹا معصوم ہے، نا سمجھ ہے تو اس کا مطلب ہے کہ تم اس کا ناجائز فائدہ اٹھاؤ۔"

بابا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اتنا گندا الزام۔ ان کی سات نسلیں ایسا سوچ نہیں سکتی تھیں جو وہ کہہ رہی تھی۔

رطابہ نے مڑ کر اذکار کو دیکھا جو ماں کے یوں چلانے سے سہما کھڑا تھا۔ متوحش ساماں کو دیکھ رہا تھا جو ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔ اذکار کو یوں سراسیمہ کھڑا دیکھ کر اسے مزید غصہ آیا۔

"تمہاری ہمت ہوئی بھی کیسے؟" وہ آگے بڑھی اور بابا کو پھر سے دھکا دیا تو وہ گر گئے۔

"ماما۔" اذکار کی چیخ بلند ہوئی جس کی رطابہ نے کوئی پروا نہیں کی۔

اندر سے عابدہ بھاگی ہوئی آئی۔

"کیا ہوا بی بی؟" سامنے کا منظر اسے پریشان کر گیا تھا۔

"غلطی ہوئی جو تمہیں بس کام سے نکلوایا۔ اسی دن تمہیں گھر سے نکلوا دیتی تو اچھا ہوتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ تم جیسا بڈھا ایسی گھٹیا حرکت بھی کر سکتا ہے میرے معصوم بچے کو اکیلا دیکھ کر۔"

بابا بالکل شاکڈ زمین پہ پڑے سن رہے تھے۔ ان کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں لیکن زمین نہیں پھٹی کہ وہ اس میں دھنس جاتے۔

عابدہ کا ہاتھ بے اختیار منہ پہ گیا۔

"اور اس گھر کے مکین تمہیں اپنا کہتے ہیں، اس گھر کا فرد مانتے ہیں۔ تم جیسے بڈھے کو جو ساری زندگی اکیلا رہا اور اپنی تنہائی میں نجانے کیسے گھناؤنے کام کرتا رہا ہوگا۔"

زیور بابا پھٹی نگاہوں سے رطابہ کے منہ سے نکلتے مغلظات کو سن رہے تھے۔

"ماما بس کریں۔" اذکار نے رطابہ کا بازو سختی سے تھام کر اسے جھنجھوڑنا چاہا تو اس نے اذکار کو پرے کیا جس پہ وہ لڑکھڑا گیا۔

عابدہ بے چاری حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔

"نکلو یہاں سے۔ تم جیسے دو ٹکے کا نوکر اپنی اصلیت پہ اتر ہی آیا ہے آخر۔"

سامنے پڑے بوڑھے سے اسے کچھ حساب کتاب چکتا کرنے تھے اور وہ یہ موقع جانے نہیں دے سکتی تھی۔ اس نے پر کا کوا بنایا تھا کیونکہ بالآخر اسے یہی کرنا تھا۔ وہ تو اسی موقع کی تاک میں تھی کہ جسے گھر کے کاموں سے بے دخل کیا اسے گھر سے بھی نکال دے تا کہ اذکار اس کے اثر سے باہر نکل سکے۔

"اٹھو نکلو یہاں سے میں کہہ رہی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا؟ یا دھکے مار کر نکالوں گی تو نکلو گے۔"

"ماما! اسٹاپ اٹ۔" ذکی ماں کے سامنے آیا اور پوری قوت سے چلایا تو رطابہ نے ایک تھپڑ اس

www.pklibrary.com

کے گال پہ جڑ دیا۔

"خبردار۔ خبردار جو اس بڈھے کے لیے میرے سامنے اپنی آواز بلند کی تم نے۔ میں زبان کھینچ لوں گی تمہاری۔" اذکار مار کھا کر بھی رکا نہیں تھا۔ اس نے زمین پہ پڑے بابا کو اٹھایا۔

"بابا۔ بابا اٹھیں بابا۔" زیور بابا یوں تھے جیسے موم پتلا ہوتا ہے۔ نہ جان ہوتی ہے نہ سانس لیتا ہے۔ بس جو جس طرف موڑ دے مڑ جاتا ہے۔ دس سال کے اذکار نے جب انہیں سہارا دے کر اٹھایا تو اسے ان کا وجود ایسے ہی لگا۔

"چھوڑ دو اسے ذکی۔" رطابہ نے اذکار کو پرے کیا۔

"اور تم اسی وقت یہاں سے نکلو۔ ورنہ میں سچ میں تمہیں ابھی کے ابھی دھکے دے دے کر نکال دوں گی۔" زیور بابا بالکل شاکڈ کھڑے تھے جیسے ان میں جان نہ باقی ہو۔ رطابہ نے ان کا بازو تھاما اور انہیں کھینچنے لگی۔

"ماما۔ اسٹاپ دس آل۔" اذکار نے رطابہ کو پرے کرنا چاہا جو زیور بابا کو بازو سے تھامے گھسیٹ رہی تھی۔ ان کی پتھرائی نظریں اور ڈھلکتا سر یہ بتانے کو کافی تھا کہ ان کا جسم تو شاید پھر بھی بے عزتی کا بار اٹھانے کے لیے زندہ ہو لیکن اندر سے ان کی موت ہو چکی تھی۔ رطابہ انہیں گھسیٹ رہی تھی اور وہ کوئی مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ بس اس کے ساتھ گھسٹتے چلے جا رہے تھے۔

"نکلو یہاں سے فوراً۔" ایک دھکا دے کر ان کا ہاتھ جھٹکا۔

"ماما۔" ذکی پوری قوت سے چلایا اور یک دم زمین پہ گرتا چلا گیا۔ رطابہ اس کی طرف مڑی تو وہ زمین پہ گر چکا تھا۔

"ذکی۔" وہ اس کی طرف بھاگی تھی۔

اسے سیدھا کرتے رطابہ نے اس کا گال تھپکا۔

"ذکی۔ کیا ہوا ہے تمہیں؟ ذکی؟" وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

مڑ کر دیکھا تو زیور بابا گیٹ سے نکل چکے تھے۔

رطابہ جلدی سے اپنے بیگ کی طرف بھاگی اور موبائل نکالا۔ وہ ایمبولینس کو کال ملانے لگی لیکن اس نے دانش کو کال ملا کر بس اتنا بتایا کہ ذکی بے ہوش ہو چکا ہے اور وہ اسے اپنے ہسپتال لے کر جا رہی ہے۔ ایمبولینس پہنچنے میں وقت لگ جاتا اور وہ یہاں بیٹھ کر وقت برباد نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے اذکار کو عابدہ کی مدد سے گاڑی میں ڈالا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"میں ذکی کو ہسپتال لے کر جا رہی ہوں۔ پاپا آئیں تو بتا دینا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے گھر کے کونے پہ فٹ پاتھ پہ بیٹھے زیور بابا کو دیکھا جن کا سر گھٹنوں پہ ٹکا تھا۔

"منحوس بڈھا۔" وہ نفرت سے بڑبڑائی اور گاڑی بھگا لے گئی۔

ہسپتال کی ایمرجنسی میں اذکار کو لے جایا گیا تھا اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے سینئرز ڈاکٹرز کو کالز ملا رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ اذکار کو کیا ہوا ہے۔ وہ کیوں یک دم بے ہوش ہو گیا تھا۔ دانش جلد ہی ہسپتال پہنچ گیا تھا۔ ڈاکٹرز اور عملے سے سب معلومات لینے کے بعد وہ رطابہ کے پاس آیا تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہا تھا کہ اذکار کو کیا ہوا ہے لیکن وہ لاعلمی سے سر ہلاتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ انہیں بہنے سے روک رہی تھی۔

اذکار کو بنیادی طبی علاج مہیا کر دیا گیا تھا۔ اب اس کے کچھ ضروری ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ رطابہ کی وجہ سے اسے خاص طور سے بڑی توجہ مل رہی تھی۔ دانش بے چینی سے بس ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔

دوپہر سے شام ہو چکی تھی اور جب شام رات میں ڈھلنے لگی تو ڈاکٹر منصور نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔ دانش بھی اس کے ساتھ تھا۔

ڈاکٹر منصور رطابہ سے کچھ علامات پوچھ رہے

www.pklibrary.com

تھے کہ اذکار کو کبھی سانس کا مسئلہ تو نہیں رہا، وہ تھکا ہوا تو نہیں رہتا، اسے بلڈ پریشر کا مسئلہ تو درپیش نہیں ہے۔ رطابہ کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

ڈاکٹر منصور نے گہری سانس لے کر کوئی جملہ بولا جو مکمل میڈیکل کی زبان میں تھا۔ دانش نے رطابہ کو ساکت ہوتے دیکھا اور پھر وہ سرنفی میں ہلاتے کہنے لگی۔

"ناٹ پاسیبل۔" دانش نے دونوں کو باری باری ناسمجھی سے دیکھا۔

"اگر ایسا کچھ ہوتا تو مجھے پتا نہ چل جاتا۔ میں اس کی ماں ہوں، ہارٹ سرجن ہوں۔ میں ایک پل میں جان لیتی اگر ایسا کچھ بھی ہوتا ڈاکٹر منصور۔"

"ہوتا ہے بھی۔ علامات نہیں بھی ظاہر ہوتیں ارلی ایج میں۔" رطابہ مسلسل سرنفی میں ہلاتے اس بات سے انکاری تھی۔

"اٹس ناٹ پاسیبل۔" وہ سرنفی میں ہلا رہی تھی۔ دانش بے بسی سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا جسے کچھ میں سمجھ نہیں آرہا کہ وہ کیا بات کررہے ہیں۔

"پلیز مجھے بھی کچھ بتائیں کہ اذکار کو کیا ہوا ہے؟"

"وہ ٹھیک ہے فی الحال لیکن ہمیں اس کے کچھ ٹیسٹ مزید کرنے ہیں تاکہ ہمیں کنفرم ہوسکے۔"

"آپ کو کیا لگتا ہے اسے کیا ہوا ہے۔۔؟" دانش کو ڈاکٹر منصور نے کچھ دیر بالکل خاموشی سے دیکھا۔

"I think he has "ventricular septal defect ...

دانش نے ہنوز ناسمجھی سے ان دونوں کو دیکھا کہ کیا وہ آسان زبان میں اسے سمجھا سکتے ہیں۔

"اذکار کے دل میں بائے برتھ سوراخ ہے۔" دانش ان کی بات پہ ساکت رہ گیا تھا۔

☆☆☆

اس دن وہ او پی ڈی میں تھا جب کوئی مانوس سی آواز سنائی دی۔

"ہیلو عباد۔" وہ جو تیزی سے کچھ ادویات کے نام لکھ رہا تھا، اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ ریچل تھی۔ اسے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ حیران ہوا لیکن جلد اس نے اپنی حیرت پہ قابو پالیا۔

"کیسے ہو؟" اپنے ناخوش گوار تاثرات پہ اس نے قابو پانے کی کوشش کی۔

"ویٹ کرو، میں بزی ہوں۔" اسے پتا تھا کہ وہ اب اس سے ملے بنا، بات کیے بنا نہیں ٹلے گی اسی لیے اسے کہنا پڑا۔ وہ سر ہلاتی باہر جا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آیا تھا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" بنا اس سے حال احوال پوچھے سیدھا اس نے کہا تھا۔

"پانچ سال بعد ملے ہو وہ بھی ایسے۔" گو وہ کسی کی بیوی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اب بھی عباد کو دیکھ کر جو رنگ اترا تھا وہ سموئیل عباد کو بوکھلا گیا تھا۔

"میں ملنا نہیں چاہتا تھا تم سے ریچل نہ بات کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات تمہیں سمجھ جانا چاہیے تھی جب میں کال اٹینڈ نہیں کررہا تھا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا البتہ اس کے لہجے میں سختی نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ میری آخری دفعہ کی حرکت کے بعد سے تم مجھ سے ملنا نہیں چاہتے تھے لیکن میں ملنا چاہتی تھی۔ کچھ امانت ہے تم تک پہنچانا تھی۔ اسی لیے رہبر سے تمہارے ہاسپٹل کا پوچھ کر یہاں آئی ہوں۔ پلیز سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لو۔"

پانچ سال پہلے جب ان کے فائنل پراف ختم ہوا تھا تو ریچل نے اسے پارکنگ میں پروپوز کیا تھا۔ عباد نے پہلے حیرت پھر غصے سے اسے دیکھا۔ وہ اس لڑکی سے اس بات کی امید رکھتا تھا جس قسم کے وہ اشارے دیتی تھی لیکن پھر بھی اسے ریچل کا یوں پروپوز کرنا برا لگا تھا۔۔ اس نے بڑی سختی سے "سوری ناٹ انٹرسٹڈ" کہا اور تیزی سے وہاں سے نکل گیا تھا۔ ریچل بعد میں اس کے پیچھے بھی گئی تھی

www.pklibrary.com

لیکن وہ بائیک بھگا کر لے گیا تھا۔ اس نے اپنا نمبر بھی بند کر دیا تھا۔ بعد میں وہ اسے کال کرتی رہتی لیکن وہ اس کی کال بھی نہیں اٹھاتا تھا۔ اس کے میسج کا جواب نہیں دیتا تھا اور بالآخر اس نے اس کا نمبر بلاک کر دیا تھا۔

"میں تم سے سوری کرنا چاہتی تھی۔"

"سوری کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت گزر چکا ہے۔ میں اس بات کو بھول چکا ہوں جو تم نے کہا تھا۔ امید کرتا ہوں تم اپنی نئی زندگی میں خوش ہو گی۔" وہ بالکل ٹھیک طرح سے بات کر رہا تھا۔ کینہ رکھنے کی اسے عادت نہیں تھی۔

"ہاں میں خوش ہوں لیکن اس بات نے مجھے پریشان کیا کہ تم نے اب تک شادی نہیں کی۔" اس نے ہاتھ یوں جھلایا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔

"آئینور کی وجہ سے؟" وہ امید نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایسے کھل کر آئینور کا نام لے گی اسی لیے کچھ چونکا پھر سر جھٹکا۔

"نہیں۔ بس مناسب وقت نہیں مل سکا۔ پڑھائی اور بزنس میں مصروف رہا۔ اب کرلوں گا۔" وہ اسے بغور دیکھتی رہی جیسے کچھ جاننا چاہتی ہو۔

"میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ سمیرا کی کال آگئی تھی مجھے۔ وہ مجھے سب بتا چکی ہے۔"

"کیا بتا چکی ہے؟" وہ یک دم چونکی۔ اس کی سمیرا سے کوئی بات نہیں ہوئی تھی جب سے سمیرا کی شادی ہوئی تھی اس لیے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ عباد کو کیا بتا چکی ہے۔ اسے تو سمیرا کے کینسر کا بھی نہیں پتا تھا۔

"جو بھی تم دونوں نے پانچ سال پہلے کیا وہ سب۔ سب کچھ۔" ریچل کے منہ سے اوہ نکلا۔ وہ شرمندہ دکھائی دینے لگی۔

"میں۔ میں۔" وہ نظریں جھکائے لب کچل رہی تھی۔ نادم تھی اور یہ بات اس کے چہرے کے تاثرات سے عیاں تھی۔ لیکن اس کے شرمندہ ہونے سے اب نہ وقت لوٹنا تھا نہ ہی سب پہلے جیسا ہو سکتا تھا۔

"تم دونوں یہ نہ بھی کرتیں تو بھی ہماری تقدیر نہیں ملتی تھی کیونکہ اس کا نکاح ہو چکا تھا۔"

یہ بات کہتے اسے تکلیف ہوئی تھی۔ لیکن یہی بات سب سے بڑی حقیقت تھی۔ اس نے قبول کر لی تھی۔

"ہاں اس کا نکاح ہو چکا تھا لیکن رخصتی نہیں۔" ریچل نے جھٹ سے کہا۔ ایک تمسخرانہ مسکراہٹ نے سموئیل کے لبوں کو چھوا۔

"یہ پانچ سال پرانی بات ہے ریچل۔ شاید تم بھول رہی ہو۔ اب تک تو۔" اس سے آگے اس سے کہا نہ گیا۔ اس نے لب بھینچ لیے۔

"اس کی اب تک رخصتی نہیں ہوئی عباد۔" اس کی بات پہ سموئیل کو جھٹکا لگا۔

"اب تک۔ مطلب تم جانتی ہو وہ کہاں ہے؟ تم اس سے رابطے میں ہو؟" وہ بے چینی سے اس کی طرف دیکھتے پوچھ رہا تھا۔

ریچل نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جو نقصان اس نے عباد اور آئینور کا کیا تھا وہ اس کا ازالہ کرے گی تب ہی وہ وہاں آئی تھی۔

"اس کا بھانجا ہمارے ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا۔ اس کی بڑی بہن ہمارے ہی ہاسپٹل میں سرجن ہے۔ وہ مجھے وہیں ملی تھی پچھلے دنوں۔" سموئیل نے بے چینی سے ریچل کو دیکھا۔

"اس کی رخصتی نہیں ہوئی عباد۔ بلکہ......" ریچل نے ایک پل کو توقف کیا۔ ایک گہری سانس خارج کی۔

"اس کی رخصتی اب کبھی نہیں ہوگی۔" سموئیل نے ناسمجھی سے ریچل کو دیکھا اور پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

www.pklibrary.com

نازنین فردوس

گوگل اسسٹنٹ

"او کے! گوگل پلیز ٹیل می دا اسپیلنگز آف۔"

وہ اپنے فون پر گوگل اسسٹنٹ لگائے بات کر رہی تھی

"ہیلو ہیلو او کے! گوگل۔"

"اے شبو!" تو یہاں بیٹھی کس سے بات کر رہی ہے۔" اماں نجانے کب سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

گاؤں کے اس پسماندہ سے علاقے کے ایک گھر میں وہ اپنا اسمارٹ فون کھولے بیٹھی تھی۔ اور اب ٹائپنگ سے بچنے کے لیے اس نے گوگل اسسٹنٹ لگا لیا تھا۔

یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اماں کے سامنے لگا لیا تھا۔ اور ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد اسے اپنی غلطی کا احساس ہونے والا تھا۔

"ارے اماں! میں تو گوگل سے بات کر رہی تھی۔"

"وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ یہ موا" گوگل" کون ہے۔ جس سے پٹر پٹر باتیں کر رہی ہو"۔ وہ روٹی پکاتے پکاتے اس کے سر پر پہنچ گئی تھیں۔

"ارے اماں ہمیں اگر کچھ بھی معلوم کرنا ہو تو گوگل مدد کرتا ہے۔" اس نے آسان لفظوں میں سمجھانا چاہا۔

"مطلب 'اس کو کام دھندہ نہیں ہے اور...... تم کو بھی نہیں۔ یہ تو پتا لگ رہا ہے۔"

"افوہ اماں! اگر ہم اس سے کچھ بھی پوچھیں تو وہ بتا دے گا۔"

"کیوں؟ وہ تمہارا نوکر لگا ہوا کہ تم کہیں کی امیرزادی ہو کہ وہ تمہارے سوالات کے جوابات دینے کے لیے بیٹھا ہے۔" ان کا غصہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔

"اماں! اسے گوگل اسسٹنٹ کہتے ہیں۔" وہ جھلائی۔

"اسسٹنٹ تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے خود کہیں کی ڈپٹی لگی ہو۔ اسسٹنٹ لگایا ہوا ہے اسسٹنٹ۔ ہونہہ۔"

"آنے دو' تیرے ابا کو۔"

"اماں اگر آپ کو کچھ بھی پوچھنا ہو تو آپ بھی پوچھ سکتی ہو اس سے۔"

"اے خدا نہ کرے' اس سے کیوں پوچھوں۔ جو بھی پوچھنا ہوا تیرے ابا سے پوچھوں گی۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ اٹھیں۔

"تو ابا کو کون سا معلوم ہوتی ہے ہر چیز۔ "سوال گندم تو جواب چنا" تو کرتے ہیں وہ"۔ وہ بے زاری سے بولی تو اماں کا دماغ غصہ کی ساتویں منزل پر پہنچا۔

جو تیرے ابا ہیں۔ پورے گاؤں میں ایک وہی تو تیسری جماعت تک پڑھے تھے۔ میرے ابا نے تو صرف پڑھائی دیکھی تھی کہ تیسری پاس ہے، افسر لگے گا افسر...... " اماں بولیں۔ "اور شادی کر دی۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں۔ اگر ابا صورت شکل بھی ذرا دیکھ لیتے تو کتنا اچھا ہوتا۔"

www.pklibrary.com

"اس سے کیا ہوتا اماں۔"
"اس سے کم سے کم تیری شکل تو اچھی ہو تی۔ پوری باپ پر گئی ہے......" ان کا گیا ہوا غصہ واپس لوٹ آیا۔ "چوہیا جیسی۔" وہ چڑ کر بولیں۔
"خاندان والے تو کہتے ہیں بالکل آپ پر گئی ہوں۔" وہ بھی سلگ کر بولی۔



www.pklibrary.com

"ایک گھنٹہ سے دیکھ رہی ہوں۔ اس سے گٹ پٹ کی جا رہی ہے۔ بھلا مردوں سے کون پٹر پٹر بات کرتا ہے۔" انہوں نے اچانک پٹری بدلی۔

"بالکل گھاگ سیاست دانوں کی طرح بات بدلی ہو۔" اس نے منہ بنایا۔

"ٹھیک ہے۔ اب سیری سے بات کرلوں گی۔ اب تو خوش۔" اس نے اپنی دانست میں انہیں خوش کرنا چاہا۔

"ہائیں۔ اب سری پائے بھی بات کرنے لگے۔" ان کا حیرانی سے منہ کھلا رہ گیا۔

"اف اماں" آپ بھی۔ وہ سیری ہے سیری۔ مطلب ایک لڑکی ہے وہ۔"

"بالکل تمہاری طرح بے ڈھنگی ہوگی۔ کام وام تو کچھ نہیں آتا ہوگا اسے۔ ہے ناں۔"

"اسے کام کرنے کی کیا ضرورت۔ وہ تو......"

وہ ابھی بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ اماں نے بات بیچ میں ہی کاٹی۔

"ہاں ہاں کہہ دو 'وہ کہیں کی شاہزادی ہے۔ دس خادم تو اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اسے کام کرنے کی کیا ضرورت۔ واہ بھئی واہ۔ کام نہیں کرتی ہوگی تو کیا مفت کے نوالے توڑتی ہوگی۔" انہوں نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"اف اب میں کیا کہوں۔"

"لو تمہارے ابا آگئے۔ وہی سنبھالیں گے اب تمہیں۔" وہ دروازہ کی جانب لپکیں۔

"کیا ہوا 'شور کیوں مچا رہی تھیں۔ باہر تک آواز آرہی تھی۔"

"شبو کے ابا۔ آپ نے اسے فون لا کر دیا۔ اب وہ کسی گوگل کے ساتھ گٹ پٹ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔" اماں نے دھیمی آواز میں دھماکے دار خبر دی۔

"کیا؟" وہ دو فٹ بیڈ سے اچھلے۔

"ہاں۔ کوئی چکر چل رہا ہے......" وہ پھر انہیں بیڈ پر دو فٹ دھنسا کر بولیں۔ "اور تو اور ایک سیری بھی ہے جو اسے بھٹکا رہی ہے۔" وہ بڑے رازدارانہ انداز میں بولیں۔

"اچھا ایسا کرو۔ دروازہ کھڑکیاں سب بند کردو۔ اسے باہر نہ جانے دو۔ اور اس فون کو بھی لے لو۔ کیا پتا فون کب کیا کردے۔"

"اچھا، شبو کے ابا۔"

"اور اس کا دھیان رکھو۔ کہیں اس کے ساتھ بھاگ ہی نہ جائے۔" ابا بولے۔

"کس کے ساتھ شبو کے ابا؟"

"وہی۔ آج کل کے آوارہ، لفنگے لڑکے، گوگل کے ساتھ۔ بہت سن رہا ہوں اس کے بارے میں۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

اندر کمرے میں قید شبو، گوگل اسسٹنٹ سے بات کرنے کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔

☆☆☆

آخر دو گھنٹے کی سزا کالا پانی کے بعد شبو اپنی اماں کو سمجھا سکی کہ گوگل اسسٹنٹ اور گوگل انسان نہیں ہیں۔ گوگل محلہ کا لچا لفنگا لڑکا نہیں بس ساری دنیا کا انکل ہے۔ یہ سب سن کر اماں کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"تو یہ سب کا چاچا بنا کیوں پھرتا ہے۔" وہ شبو کے کمرے میں بیٹھ گئیں۔

"اماں! بس یوں سمجھو اگر آپ کو کوئی بھی مسئلہ پوچھنا ہو تو آپ گوگل اسسٹنٹ سے پوچھ سکتی ہو۔"

"اچھا"۔ وہ سوچنے لگیں۔

"کچھ بھی پوچھ سکتی ہوں...... اچھا! اس سے یہ تو پوچھ پڑوس کی رشیداں کی بکری کیسے مری۔" اماں کا سوال سن کر شبو کو تو جیسے ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔

"اماں! آپ بھی ناں۔ میں آپ کو سمجھا کچھ رہی ہوں اور آپ سمجھ کچھ رہی ہیں۔"

"ارے۔ تو نے ہی تو کہا کہ کچھ بھی پوچھ سکتی ہوں۔" اچھا تو پھر۔" وہ پھر سوچنے لگیں۔

"آپ بیماری وغیرہ کا پوچھ سکتی ہو۔" اس نے اپنی طرف سے مدد دی۔

"اچھا! تو یہ پوچھ کہ میرے کمر کا درد کب جائے گا۔ ہائے سالوں اس درد سے پریشان ہوں۔" "ہائے! میری کمر ہائے۔"

www.pklibrary.com

"افوہ! یہ سب نہیں بتائے گا وہ۔ اس نے یہ سب بتانا شروع کیا تو لوگ عامل گوگل بابا پکارنا شروع کردیں گے۔ حد ہے آپ سے بھی۔"

"آپ گانا سن لو۔" اس نے مائک لگایا۔

"اوکے گوگل...... کین یو سنگ آ سانگ۔"

گوگل اسسٹنٹ گانے لگی۔ "آئی ایم.. یوور گوگل اسسٹنٹ...... پم پم پا۔"

"یہ کیسا بے سرا گا رہی ہے۔ نہ باجا نہ راگ۔" اماں ناگواری سے بولیں۔ "اس سے تو اچھا میں گا لیتی ہوں۔" اماں کہتے ہوئے گانا بھی گانے لگیں۔

"میں تیری دشمن تو میرا دشمن

"میں ناگن تو سپیرا!!!!!!

میں ناگن تو سپیرا!!!!!!"

"ارے اماں! بس۔ آپ کے گانے سن کر تو گاؤں کے سارے سانپ اور سپیرے بھی آجائیں گے۔" اس نے اماں کو جلدی سے روکا۔

"اے شرم نہیں آتی اپنے ابا کو سپیرا بولتے۔" اماں نے اسے ڈانٹا۔

"میں انہیں سپیرا نہیں آپ کو ناگن کہہ رہی ہوں۔" وہ جل کر بولی۔ وہ اس رو میں اسپیکر پھر آن کر بیٹھی۔

"اس طرح کہے گی تو مجھے گالیاں آئیں گی گالیاں۔"

اسسٹنٹ نے گالیاں کو گلیاں سمجھا اور گلیاں گلیاں کرنے لگی۔

"ارے! اس کو تو چپ کروادے۔ بے غیرت گلیاں گلیاں کررہی۔ نجانے کس کی گلی میں جا گھسی۔"

"شٹ اپ۔" شبو نے اسے جھڑکا۔ اسسٹنٹ کو بھی۔

"اوکے۔" وہ بڑی تابعداری سے خاموش ہوگئی۔

"کتنی بے شرم ہے۔ گالیاں کھا کر اوکے کہتی ہے۔ لگتا ہے تیری صحبت کا اثر ہے۔"

"بس کر اماں"۔ شبو بیزاری سے بولی۔

"کیا گالیوں کی طرح کھانا بھی کھاتی ہے۔ یہ۔"

"اماں......" وہ بے بس ہوگئی۔

"اچھا! اکیلی ہی ہے۔ بہن بھائی نہیں ہیں اس کے!"

"وہ مشین ہے اماں۔ وہ ہم جیسے احساسات نہیں رکھتی۔ بے حس ہوتی ہے۔"

"بے حس تو ہم ہیں ارے شبو۔ اگر کوئی مرتا ہے تو ہمیں اس کے دکھ کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کوئی بھوکا ہے تو اس کی بھوک کا بھی احساس نہیں کرتے۔ کوئی روتا ہے تو ہم ہنستے ہیں۔ کوئی گرتا ہے تو ہم اسے اور گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسے اٹھتا ہوا دیکھ کر اور ہنستے ہیں۔ بے حس تو ہم ہوئے نا شبو۔ مشین وہ ہے کہ ہم۔" اماں کسی گہری سوچ میں بولے چلی گئیں۔

"شبو کی اماں۔ اب بس کر بس۔ ذرا فلمیں کم دیکھا کر۔ رات جو فلم دیکھی تھی اس کا اثر ہے۔ یہ تو اس فلم کے ڈائلاگ ہیں۔ جو تو مار رہی ہے۔"

اس سے پہلے کہ شبو اماں کے جذبات سے متاثر ہوتی۔ ابا نے دھما کا آمیز انٹری دی۔

اماں ابا کو دیکھتے ہی کھسیانی ہو گئیں۔ "اور تیرے ابا کے لیے چائے بناتی ہوں۔" کہتے ہوئے باورچی خانہ کی جانب بھاگیں۔

"ابا! آپ کو بھی کچھ پوچھنا ہے کیا؟" شبو نے ابا کو بھی گوگل اسسٹنٹ سے بات کرنے کی پیشکش کی۔

"مجھے تو ایک ہی بات پوچھنا ہے بس۔" ابا آرام سے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولے۔

"کیا ابا؟"

"یہی کہ تیری اماں سے چھٹکارا کب ملے گا۔ بتادے گا وہ۔"

"کیا! ابا آپ بھی ناں......!" شبو ہنسنے لگی۔ اس کا تو ایک ہی جواب ہوگا۔

"کیا۔"

"نووے۔"

ابا کو ابھی اس کا مطلب نہیں پتا تھا اس لیے وہ خاموش ہو گئے اور شبو ان کے پاس سے ہنستے ہوئے اٹھی تھی۔

☆☆

www.pklibrary.com

مہوش افتخار

دامنِ سحاب

بتیسویں قسط

"بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی منیرہ کی انگلیاں دھیرے دھیرے بیٹی کے بالوں کو ملائمیت سے سہلا رہی تھیں جو کسی خوف زدہ بچے کی طرح دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھامے سو رہی تھی۔ اس کے گالوں پر آنسوؤں کے بے حد واضح نشان تھے۔ شاہ صاحب اور دیگر گھر والوں سے ہونے والے سامنے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس پہ مستزاد وہاں چھڑنے والی بحث۔ اس کے کمزور اعصاب کے لیے ایک ساتھ اتنا دباؤ جھیلنا اور برداشت کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ ٹوٹ کر رو پڑی تھی یہاں تک کہ منیرہ اور سبحان نے آ کر اسے سنبھال نہ لیا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کر حیا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ محبت جیسا نرم اور میٹھا جذبہ کسی کو اتنے تلخ اور کڑوے انجام سے بھی دوچار کر سکتا ہے اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

منیرہ اور سبحان گردیزی کے لیے یہ گھڑیاں بے حد سخت اور آزمائش بھری تھیں۔ اپنی زندگی سے بھرپور ہنستی کھیلتی بیٹی کو ایک زندہ لاش میں تبدیل ہوتا دیکھ کر ان کے دل پھٹنے کو آ گئے تھے۔ وہ مسلسل ایک کرب، ایک بے سکونی کی کیفیت میں مبتلا تھی جو اسے نیند میں بھی چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس کے نیم والبوں سے رہ رہ کر



www.pklibrary.com



pklibrary.com

www.pklibrary.com

مدہم مدہم سی سسکیاں ٹوٹ رہی تھیں جو منیرہ کی سماعتوں سے ہوتے ہوئے ان کے روم روم میں حشر برپا کر رہی تھیں۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی لاڈلی کے وجود میں پیوست ہر وہ کانٹا نکال دیں جو اس کی اذیت، اس کے دکھ کا باعث بن رہا تھا۔ جو اسے اس درجہ تکلیف دے رہا تھا کہ اس کے پاس انہیں بتانے کو سوائے آنسوؤں اور آہوں کے اور کچھ نہ تھا۔

حاتم صاحب سے یہ جان کر کہ سلویٰ کا ایک بیٹا بھی تھا، جو ان ظالموں نے اس سے چھین لیا تھا، منیرہ اور سبحان اذیت کی ایک نئی سولی پر جا ٹنگے تھے۔ ابھی بھی اپنے نواسے کا سوچ کر منیرہ کی آنکھیں نئے سرے سے بھر آئی تھیں۔ وہ اپنے غم میں اتنی ڈوبی ہوئی تھیں کہ کب سبحان گردیزی دروازہ کھول کر اندر چلے آئے انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

اپنی شریکِ حیات کو آنکھیں بند کیے خاموشی سے آنسو بہاتا دیکھ کر سبحان صاحب کی رنجیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھے تھے اور بے حد نرمی سے انہیں خود سے لگا لیا تھا۔ اپنے شوہر کا لمس، ان کی خوشبو پاتے ہی منیرہ کا ضبط جواب دے گیا، وہ ان کے سینے میں منہ دیے گھٹ گھٹ کر رو پڑی تھیں۔

"یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا سبحان؟ کیا ہو گیا؟ ہم کیسے اپنی بچی سے اتنے بے خبر ہو گئے کہ وہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ ان۔ ان کے انتقام کا نشانہ بن گئی؟ یہ سب کیسے ہو گیا سبحان، ہم سے اتنی بڑی غلطی کیسے ہو گئی؟"

وہ سسکتے ہوئے سرگوشی میں بولیں تو پچھتاوؤں کے زہریلے ناگ ایک بار پھر سبحان گردیزی کے تن من سے لپٹنے لگے۔ انہیں اپنا دم بند ہوتا محسوس ہوا۔ یہ احساس کہ وہ اپنی حیات کی دو قیمتی اور اہم ترین ہستیوں کی حفاظت کرنے، ان کی امیدوں پر پورا اترنے میں ناکام رہے تھے، انہیں اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا۔ وہ خود کو اپنی بیوی اور بیٹی کا مجرم سمجھ رہے تھے جو انہیں زمانے کے سرد و گرم سے بچا نہ سکے تھے۔ ان کی درد میں ڈوبی نادم نگاہیں اپنی لاڈلی کے کملائے ہوئے زرد چہرے پر آٹھہریں جو حال سے بے حال خود سے بھی بیگانہ پڑی تھی۔ اس کی زندگی میں جو کردار دور رہ کر بھی حاتم گردیزی نے ادا کیا تھا وہ ایک باپ ہونے کے ناتے اصولاً انہیں ادا کرنا چاہیے تھا اور اس بات کا قلق انہیں ہمیشہ رہنے والا تھا۔

"فکر نہ کرو، میں اپنی بچی کے ایک ایک آنسو کا بدلہ ان کمینوں سے لوں گا۔ میں ملک دلاور اور اس کی نسل کا نام و نشان تک مٹا دوں گا۔" وہ اپنے اندر سر پٹختے پچھتاووں سے نبرد آزما ہوتے بھینچے ہوئے لہجے میں بولے تو منیرہ نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"نہیں، آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ مجھ میں مزید دکھ سہنے کی ہمت نہیں ہے سبحان۔ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں زندہ نہیں رہ پاؤں گی......" انہوں نے برستی آنکھوں سے شوہر کا چہرہ دیکھا۔ "وعدہ کریں۔ وعدہ کریں کہ آپ دوبارہ ایسا کبھی نہیں سوچیں گے۔"

"یہ ممکن نہیں۔" انہوں نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔ منیرہ نے پلٹ کر کچھ کہنا چاہا لیکن سلویٰ کا بے چینی سے اپنے تکیے پر سر پٹختا ان دونوں کی توجہ اس جانب مبذول کروا گیا۔

"میں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ م۔ میرا یقین کرو۔ میرا یقین کرو اسفی!"

"سلویٰ! سلویٰ میری جان۔" منیرہ نے گھبرا کر اس کا بازو تھاما۔ سبحان صاحب بھی تیزی سے گھوم کر بیڈ کے دوسری طرف چلے آئے۔ سلویٰ کے پورے جسم میں اک تناؤ سا در آیا۔

"چھوڑو۔ چھوڑو مجھے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرا بچہ۔ میرا بچہ۔ میرا بچہ!" جھٹکے سے اپنا بازو ماں کی گرفت سے چھڑاتی وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ اٹھ بیٹھی تو سبحان گردیزی نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ اس کی چیخ سن کر طیبہ بھی کمرے میں بھاگی چلی آئیں۔ سلویٰ نے ہسٹیریائی انداز میں باپ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

"لے لیا۔ لے لیا بابا۔ اس نے۔ اس نے مجھ۔ مجھ سے میرا بیٹا۔ میرا فخر لے لیا۔" آنکھوں میں وحشت

www.pklibrary.com

لیے وہ بھرائی آواز میں بولی تو سبحان صاحب کو اپنے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹکتا محسوس ہوا۔ انہوں نے نمناک نظروں سے بیٹی کا چہرہ دیکھا جو اس پل قطعی اپنے حواس میں نہ تھی۔

"سلویٰ بیٹا......" منیرہ نے روتے ہوئے اسے سنبھالنا چاہا لیکن وہ تیزی سے ان کا ہاتھ تھام گئی۔

"دیکھیں مما۔ م۔ میری خالی گود دیکھیں۔ میں۔ میں نے آپ لوگوں کا دل دکھایا تھا ناں۔ اللہ نے میرا دل دکھا دیا۔ حالانکہ میں نے اس سے بہت معافی مانگی تھی لیکن اس نے قبول نہیں کی۔ اسفند نے بھی میری ایک نہیں سنی۔ م۔ میرا کوئی قصور نہیں تھا پھر بھی اس نے مجھے طلاق دے دی۔ مجھے طلاق دے دی مما۔ ہائے طلاق دے دی۔" اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تو منیرہ جو اس دردناک انکشاف پر پتھرا سی گئی تھیں، تڑپ کر اسے خود سے لگا گئیں۔

"بس میرا بچہ۔ بس!"

انہیں اپنا زخم خوردہ دل شدتِ غم کے باعث لہولہان ہوتا محسوس ہوا تھا۔ کچھ ایسی ہی حالت سبحان گردیزی کی بھی تھی جو سرخ چہرے لیے نچلا لب دانتوں تلے دبائے اپنے ضبط کی کڑی منزل پر تھے۔ اگلے ہی پل انہوں نے کھینچ کر سسکتی ہوئی سلویٰ کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ ان کی شفیق بانہوں کا سہارا پاتے ہی اس کی آہیں، اس کا درد آسمان کو چھونے لگا۔ سبحان گردیزی کی آنکھوں میں چمکتے آنسو ان کے چہرے پر بہہ نکلے۔

"وعدہ کرتا ہوں بیٹا، جب تک تمہارے ایک ایک مجرم کو اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل نہیں کروں گا، چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ میں تمہیں ملنے والی ہر تکلیف، ہر درد ان حرام زادوں کو سود سمیت لوٹاؤں گا پھر چاہے میری جان کیوں نہ چلی جائے۔" ان کے لہجے میں چٹانوں کی سی مضبوطی اور عزم تھا۔

سلویٰ کچھ اور شدت سے باپ سے لپٹ گئی۔ یوں جیسے وہ اس کی پہلی اور آخری پناہ گاہ ہوں۔ سبحان صاحب نے بے اختیار چہرہ جھکا کر بیٹی کا سر چوم لیا اور تب تک اسے اپنی آغوش میں سمیٹ کر بیٹھے رہے جب تک اس کے آنسوؤں میں کمی نہ آ گئی۔

☆☆☆

انگلینڈ کے شہر مانچسٹر میں آج بڑا ہی روشن اور سنہرا دن طلوع ہوا تھا جو یہاں کے عمومی موسم کے خاصا برعکس تھا۔ یہاں زیادہ تر آسمان بادلوں سے گھرا رہتا تھا جو کبھی بھی برسنا شروع کر دیتے تھے۔ سو ایسے روشن اور چمکدار دن وہاں قسمت سے میسر آتے تھے جن سے لوگ لطف اندوز ہونے کی بھرپور کوشش کرتے تھے۔

اس خوب صورت موسم کی مرہونِ منت آج نصر گردیزی کے ریسٹورنٹ پہ بھی لنچ آورز میں معمول سے زیادہ رش تھا۔ پاکستان سے انگلینڈ شفٹ ہونے پر انہوں نے یہ ہوٹل اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر کھولا تھا۔ جو دھیرے دھیرے اپنا ایک نام اور پہچان بنا گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ چند سالوں میں اس قابل ہو گئے تھے کہ اسے کلی طور پر خرید سکتے اور انہوں ایسا ہی کیا تھا۔ اب یہ ان کی اور ان کے دونوں بیٹوں کی ملکیت تھا جو سمجھ دار ہونے پر اپنے باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے تھے۔

اس وقت بھی نصر اپنے آفس میں بیٹھے اکاؤنٹ کے دیے گئے کھاتے دیکھ رہے تھے جب موبائل کی بیل نے ان کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ رجسٹر پر سے نگاہیں ہٹاتے ہوئے انہوں نے ایک نظر پاس پڑے فون پر ڈالی تھی جس کی اسکرین پر پاکستان سے کوئی انجانا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں الجھن اتر آئی۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر فون اٹھا لیا۔

"ہیلو۔"

"منیرہ بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف سے ایک سرد وسپاٹ آواز ابھری تو نصر گردیزی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

"ک۔ کون چھوٹی؟" وہ سرعت سے سیدھے ہوئے۔ انہیں اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔

www.pklibrary.com

ان کے طرزِ تخاطب نے منیرہ کو اندر تک ادھیڑ کر رکھ دیا۔ وہ ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

"مت کہو مجھے چھوٹی!" وہ اس نفرت سے چلائیں کہ نصر گردیزی کی سانس رک گئی۔ "کوئی حق نہیں تمہیں مجھے اس نام سے پکارنے کا۔ اس نام سے میرا وہ بھائی پکارتا تھا جو مجھے اپنے شانوں پر بٹھائے پورے گاؤں کی سیر کرواتا تھا۔ جو میرے لیے اپنے پیسوں سے ٹافیاں اور کھلونے لاتا تھا۔ جو ہم بہنوں کی امیدوں کا مرکز اور ہمارے ماں باپ کے آنے والے وقت کا سہارا تھا۔ جبکہ تم...... تم تو ایک گدھ ہو۔ ایک ایسے بے رحم اور ظالم گدھ جو اپنوں کا ہی ماس ان کی ہڈیوں سے نوچنے پر اتر آیا ہے۔ جس میں نہ غیرت بچی ہے اور نہ شرم۔ جس کا وجود ایک زمانے سے ہمارے لیے سوائے اذیت اور مایوسی کے اور کچھ بھی نہیں رہا۔ سنا تم نے۔ تم میرے مرحوم باپ کے نام پر صرف ایک بدنما داغ ہو نصر عباس گردیزی۔ اور میں تم جیسے کمینے اور گرے ہوئے شخص کو بالکل نہیں جانتی۔ میرا تم سے کوئی تعلق، کوئی رشتہ نہیں۔ سمجھے تم!"

الفاظ تھے یا زہر میں بجھے تیر۔ لہجہ تھا یا دو دھاری تلوار۔ نصر گردیزی کو اپنا تن من چھلنی ہوتا محسوس ہوا تھا۔

"لیکن مجھے میرا قصور تو بتا چھوٹی۔ آخر میں نے کیا کیا ہے؟" ان کے لبوں سے درد میں ڈوبی اک استدعا نکلی تھی۔ منیرہ کے جلتے ہوئے وجود کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔

"قصور......!" وہ غرائیں۔ "میری معصوم بچی کو برباد کر کے، اسے اپنے سالے اور اس کے بیٹے کے انتقام کی بھینٹ چڑھا کر پوچھتے ہو کہ تمہارا قصور کیا ہے؟"

ان کے الزام پر نصر تڑپ اٹھے۔

"خدا۔ خدا کی قسم ہے کہ مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ مجھے تو......"

"بکواس بند کرو......" وہ دھاڑیں۔ "تم اگر جلتے انگاروں پر بھی کھڑے ہو جاؤ گے ناں نصر عباس، تو میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں اپنے سگوں کے ارادوں کا علم نہ تھا۔ لیکن یاد رکھنا، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ تم نے ایک ماں کے کلیجے پر ہاتھ ڈالا ہے۔ تم نے اپنے خون کو رسوا کیا ہے۔ میری بددعا ہے قیامت تک تمہارا پیچھا کریں گی۔ جس طرح میری اکلوتی بچی، میری پھول سی بیٹی کو ان ظالموں نے توڑ کر، بکھیر کر میرے حوالے کیا ہے ان شاء اللہ میرا رب بالکل اسی طرح تمہاری پوری نسل کو برباد کر کے تمہاری جھولی میں ڈالے گا۔ وہ تمہیں وہاں چوٹ پہنچائے گا نصر، جس کے بعد تم اٹھنے کے قابل نہ رہو گے۔"

"ایسا مت بول چھوٹی...... ایسا مت بول۔ میرا یقین کر۔ میرا اس سارے معاملے سے کوئی......"

اچانک لائن پہ سناٹا چھا گیا تو نصر گردیزی کی ہر وضاحت ان کی نوکِ زبان پر رہ گئی۔ انہوں نے تڑپ کر فون نظروں کے سامنے کرتے ہوئے بہن کا نمبر ملایا لیکن چند گھنٹیوں کے بعد ہی ان کی کال کاٹ کر ان کا نمبر بلاک کر دیا گیا۔ وہ کرب سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟

منیرہ کی ہائے، ان کی بددعا میں ایک بار پھر ان کے اندر گونجنے لگیں تو انہوں نے مارے اذیت کے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔

یہ سب کیا ہو گیا تھا؟ ابھی چند ماہ پہلے ہی تو انہیں بہادر کے ہاں بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی تھی۔ جس پہ وہ بے تحاشا خوش تھے۔ پھر اچانک ایسا کیا ہوا تھا جو سلوی حویلی سے نکل کر اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گئی تھی؟ وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس کا اپنے گھر والوں سے کوئی رابطہ، کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

یقیناً۔ یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہوئی تھی اور اس گڑبڑ میں انہیں واضح طور پہ ملک دلاور کا ہاتھ لگ رہا تھا۔ کیونکہ پورے خاندان میں وہ واحد شخص تھے جو سلوی کے گھرانے کے بارے میں جانتے تھے۔ رہا بہادر تو وہ سلوی سے بے تحاشا محبت کرتا تھا اور اسے تکلیف پہنچانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی دیوانگی کے نصر خود گواہ تھے۔ اس کے علاوہ حویلی میں باقی سب کا رویہ بھی سلوی کے ساتھ بہت اچھا اور نارمل تھا۔ ایسے

www.pklibrary.com

میں اگر کسی کو اس سے کوئی بغض، کوئی بیر تھا تو وہ سوائے ملک دلاور کے اور کوئی نہ تھا۔ جن کی فطرت سے نصر گردیزی باخوبی واقف تھے۔

وہ اپنے دشمنوں کو کبھی بھی معاف کرنے کے قائل نہ تھے۔ پھر بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ سلوئی کی صورت ملنے والے اس سنہری موقعے کو ہاتھ سے جانے دینے والے تھے۔ وہ بھی تب جب انہوں نے بھری پنچائیت میں شاہ مخدوم اور ان کے بیٹوں سے اپنا حساب برابر کرنے کا عہد کیا تھا۔ انہیں نا قابلِ تلافی نقصان سے دوچار کرنے کی ٹھانی تھی۔ اور کسی بھی عزت دار گھرانے کے لیے اس سے بڑھ کر نقصان اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان کی اپنی ہی اولاد کو خاص کر بیٹی ذات کو ان کے لیے عمر بھر کا روگ بنا دیا جاتا۔ اس کے وجود کو ان کے صبر اور حوصلوں کا امتحان بنا دیا جاتا۔ یوں کہ وہ جب تک زندہ رہتے پل پل تڑپتے اور سلگتے رہتے۔

اپنی بہن کو ملنے والی اذیت، انہیں پہنچنے والے ذہنی صدمے کی شدت کا سوچ کر نصر گردیزی کے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے۔ نجانے سلوئی کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا جو ان کی سدا کی نرم خو اور فرشتہ صفت بہن غم و غصے سے پھٹ پڑی تھیں۔ اپنے بڑھتے ہوئے اشتعال پر قابو پاتے ہوئے انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی اور ہاتھ میں پکڑے موبائل سے ملک دلاور کا نمبر ملاتے ہوئے فون کان سے لگا لیا تھا۔

"ہیلو۔" تیسری بیل پہ ہی انہیں دوسری جانب سے ملک دلاور کی بھاری آواز سنائی دی تو ان کے تنے ہوئے اعصاب مزید کھنچ گئے۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں بھاجی۔" بنا کسی رسمی علیک سلیک کے وہ سپاٹ سے لہجے میں بولے تو ملک دلاور بری طرح ٹھٹک گئے۔

"کیا؟" ان کا ذہن پوری طرح حاضر ہو گیا۔

"سلوئی، گردیزی ہاؤس پہنچ گئی ہے؟"

ان کے سوال پر ملک دلاور کے لبوں پہ ایک جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔ تو آخر کار جہاں کی خاک تھی وہاں پہنچ ہی گئی تھی۔ انہیں اپنے سینے میں ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوئی تھی۔ آج بیس سال پرانا کھیل تمام ہوا تھا۔ ان کے دشمنوں کو مات ہوئی تھی اور وقت نے انہیں فاتح قرار دیا تھا۔ سلوئی اپنے گھر تک کیسے پہنچی تھی؟ کس حال میں پہنچی تھی انہیں رتی برابر پروا نہ تھی۔ انہیں سروکار تھا تو صرف اپنی جیت سے، اپنی سربلندی سے۔ ان کا انتقام بالآخر خود مجسم ہو کر گردیزیوں کے قدموں سے آلپٹا تھا اور ایسا لپٹا تھا کہ وہ اب عمر بھر بھی اپنے پیروں پہ کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تھے۔ انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کروفر سے صوفے کی پشت پہ بازو پھیلایا۔

"تجھے کس نے کہا؟"

"جس نے بھی کہا ہو...... "نصر کی پیشانی پہ بل آٹھہرے۔ "آپ یہ بتائیں کہ آپ نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے؟" وہ تنے ہوئے لہجے میں بولے تو ملک دلاور کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے اس کے ساتھ کچھ کیا ہے؟"

"کیونکہ ہم دونوں جانتے ہیں بھاجی، کہ آپ نے شاہ مخدوم اور ان کے بیٹوں کو کبھی معاف نئیں کیا۔" وہ بنا کسی پس و پیش کے بولے۔ ملک دلاور محظوظ سے انداز میں ہنس پڑے۔

"واہ بھئی واہ۔ تُو تو میرا بڑا امجاز (مزاج) شناس نکلا۔" ان کی آواز میں اک تمسخر تھا۔ نصر کی فون پر گرفت سخت ہو گئی۔

"تب ہی تو پوچھ رہا ہوں بھاجی، کہ ایسا کیا کیا ہے جو آپ کی ہنسی بند نئیں (نہیں) ہو رہی؟" ان کا لفظ لفظ بھینچا ہوا تھا۔ ملک دلاور کی مسکراہٹ میں عجیب سی سرد مہری اتر آئی۔

"میں نے کچھ نئیں کیا۔ جو کیا ہے تیری اپنی بڑیوں (بھابھی) نے کیا ہے۔"

www.pklibrary.com

"کیا، کیا ہے سلویٰ نے؟"

"منہ۔ کالا!" آنکھوں میں خبیث سی چمک لیے انہوں نے جان بوجھ کر لفظوں کو توڑ کر ادا کیا۔

"کیا؟ کیا بکواس ہے یہ۔" نصر گردیزی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ وہ ہر بات کی توقع کیے ہوئے تھے لیکن ایسی شرم ناک اور گری ہوئی بات کا تو انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ان کا چہرہ انگارے کی مانند دہک اٹھا اور آنکھوں سے لپٹیں سی نکلنے لگیں۔

ملک دلاور نے مزے سے ٹانگ پر ٹانگ جمائی۔

"یہ بکواس نئیں حقیقت ہے۔ تیری پڑیوں کی حقیقت۔ اس کے گندے کرتوت۔ میرے پتر کی غیر موجودگی میں اپنے کمرے میں ایک پرائے مرد کو لے کر گھسی ہوئی تھی، بے غیرت کہیں کی!" وہ نفرت سے پھنکارے۔ اتنی بڑی تہمت باندھتے ہوئے انہیں ایک پل کے لیے بھی اپنے اللہ کا خوف نہیں آیا تھا۔

نصر گردیزی نے وحشت بھری بے یقینی سے نفی میں سر ہلایا۔

"نئیں میں نئیں مان سکتا۔ سلویٰ ایسا کبھی نئیں کر سکتی۔" لاکھ لاتعلقی سہی، لاکھ ناراضی سہی لیکن وہ اپنے گھرانے، اپنے خون اور اپنے بہن بہنوئی کی تربیت کو اتنا تو جانتے ہی تھے کہ ایسی بے ہودہ بکواس کو رد کر سکتے۔

"ہونہہ! وہ کیا کر سکتی ہے کیا نئیں...... اس کا اندازہ تو اسی بات سے ہوتا ہے جس دیدہ دلیری سے اس نے شہر میں میرے پتر کو پھنسایا تھا، اس کے ساتھ ویا (شادی) رچایا تھا، اپنے گھر سے بھاگی تھی۔" انہوں نے تنفر سے سر جھٹکا۔ نصر گردیزی کا ضبط جواب دے گیا۔

"آپ کا پتر بھی کوئی دودھ کا دھلا نئیں تھا۔ یقیناً سلویٰ کو یہ جرأت اسی نے دی ہوگی ورنہ اس کی اتنی مجال نہ تھی کہ تایا جی کے آگے سر اٹھا سکتی۔" ان کا اپنوں کے لیے یوں بھڑک اٹھنا ملک دلاور کو سرتا پا سلگا گیا۔

"کیا بات ہے، آج بڑا درد اٹھ رہا ہے اپنے پچھلوں کا۔" وہ اچانک کاٹ دار لہجے میں بولے۔ ان کی چوٹ نصر گردیزی کا خون کھولا گئی۔

"ہاں اٹھ رہا ہے۔ کیونکہ آج آپ نے وہ حد پار کی ہے بھاجی، جس کی اجازت کوئی بھی انسان کسی دوسرے کو نئیں دے سکتا۔ آج آپ نے میرے خاندان کی شرافت اور میرے گھر کی بچی کی پاکیزگی پر تہمت لگائی ہے۔ آج آپ نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ اور میں یہ جرأت کسی صورت برداشت نئیں کر سکتا۔ میں لاکھ برا سہی لیکن اتنا بے حس اور ظالم نئیں کہ آنکھیں بند کر کے آپ کے اس گھٹیا الزام پر یقین کر لوں۔ مجھے اپنے خون پر پورا بھروسا ہے اور اسی لیے میں اس بات کی جڑ تک جاؤں گا۔ میں حقیقت کا کھوج لگاؤں گا۔ اور یقین کریں کہ اگر مجھے اس سارے معاملے میں آپ کے شامل ہونے کی بھنک بھی پڑی تو میں بھول جاؤں گا کہ میرا آپ سے کیا رشتہ ہے۔"

ان کا لہجہ ہر لحاظ سے عاری اور دوٹوک تھا۔ ملک دلاور کا تن من جل اٹھا۔ وہ ایک جھٹکے سے سیدھے ہوئے۔

"او جا اوئے! وڈا آیا جڑ تک جانے والا۔ میں بھی دیکھتا ہوں کہ تو میرا کیا بگاڑ لے گا۔"

ان کی بدمعاشی نصر کو مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کر گئی۔ ان کے لب اس سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہوئے کہ کنپٹی کی رگ ابھر آئی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر اس گھٹیا آدمی کے روبرو جا کھڑے ہوں اور اسے گریبان سے پکڑ کر ساری حقیقت اگلوا لیں۔

"کون کس کا کیا بگاڑتا ہے یہ تو آپ کو وقت بتائے گا بھاجی۔ لیکن ایک بات آپ بھی یاد رکھنا، انسان اپنا جرم سارے زمانے سے چھپا سکتا ہے لیکن اوپر والے سے نئیں۔ اور میری دعا ہے کہ اگر اس معصوم بچی کے ساتھ آپ کی حویلی میں کوئی زیادتی، کوئی ظلم ہوا ہے تو وہ اس کا حساب آپ سے اس دنیا میں ہی لے۔"

سلگتے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے رابطہ منقطع کر ڈالا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ان کا دماغ پھٹ جائے گا۔ وہ خود

کو سنبھالتے کھڑکی میں آ کھڑے ہوئے۔ ان کے اعصاب اتنے منتشر ہو چکے تھے کہ ذہن کسی ایک نکتے پر مرکوز ہی نہ ہو پا رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ان کے لیے، اتنی دور سے بیٹھ کر، حقیقت تک پہنچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ ملک دلاور ایک گھاگ شکاری تھے اور ان کے جرم کو ثابت کرنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ ان کے پاس کوئی گواہ بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ ملک دلاور کی اپنی اولاد بھی باپ کے اس روپ سے انجان تھی۔ پتا نہیں اپنے بچوں کی اس بے خبری کا انہوں نے کس حد تک فائدہ اٹھایا تھا اور بہادر اور سلوٰی کی زندگی کو کس حد تک نقصان پہنچایا تھا؟ پتا نہیں بہادر کا اس سارے معاملے میں کیا کردار رہا تھا؟ وہ جتنا سوچ رہے تھے اتنا ہی الجھتے اور پریشان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اور اس پریشانی کو کم کرنے کا ایک ہی راستہ تھا۔

اگلے ہی لمحے انہوں نے اپنے فون کی کانٹیکٹ لسٹ میں موجود ایک نمبر کو کلک کرتے ہوئے موبائل کان سے لگایا تھا۔ بیل جاتی سن کر ان کی بے چینی دو چند ہو گئی تھی۔ وہ بے صبری سے اپنی کال کے ریسیو کیے جانے کا انتظار کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

"سرکار۔"

سلطان کی پکار پہ اسفند نے اپنی بند آنکھیں کھولیں۔ وہ اس وقت اپنے علاقے سے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی دوری پر نہر کنارے ایک خاموش گوشے میں درخت سے تنہا سر ٹکائے بیٹھا تھا۔ اسے یہاں آئے کتنی دیر ہو چکی تھی کچھ اندازہ نہ تھا یاد تھا تو صرف اتنا کہ بخت چوہدری کے ڈیرے سے نکلنے پر اس کی ہدایت پہ سلطان نے گاڑی گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر ڈال دی تھی۔ جس کے بعد وہ اس سیدھی سڑک پر آگے بڑھتے چلے گئے تھے یہاں تک کہ اسفند کا دم الجھنے لگا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اگر اسے اس قید سے رہائی نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔

اس کے حکم پر سلطان نے فوری طور پہ گاڑی سڑک کے ایک جانب لگا دی تھی۔ اسفند لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکلا تھا۔ اس کی رنگت زرد اور ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے۔ وہ گہرے گہرے سانس لیتا اپنے اندر اٹھتی وحشت کے اس طوفان سے نجات پانے کی کوشش کرنے لگا تھا جو اسے عجیب سے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس کی روح کو سہمائے دے رہے تھے۔ لیکن آگاہی کے جو در وا ہو چکے تھے انہیں بند کرنا اب اتنا آسان نہ تھا۔

وہ مضطرب اور بے کل سا سیدھا چل پڑا تھا۔ اسے یوں اردگرد سے بے نیاز آگے بڑھتا دیکھ کر سلطان تیزی سے گاڑی سے باہر نکلا تھا اور جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا تو وہ چند گارڈز کو لے کر اس کے پیچھے لپکا تھا۔

اسفند بے جان قدموں سے چلتا ایک درخت تلے آ گر سا گیا تھا۔ اس کے اندر نہ مزید چلنے کی سکت رہی تھی اور نہ ہی کچھ سوچنے سمجھنے کی طاقت۔ وہ نڈھال سا درخت کی پشت سے سر ٹکا گیا تھا اور تب سے اب تک وہ یونہی شکستہ اور بے حال سا اسی جگہ پر بیٹھا تھا۔ یہاں تک کہ سلطان کی آواز اسے ہوش و خرد کی دنیا میں واپس لے آئی تھی۔

اپنے مالک کی خالی نگاہیں خود پہ مرکوز پا کر سلطان نے جھجکتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا اسفند کا موبائل اس کی جانب بڑھایا تھا جس پہ نصر پھوپھا کا نام جگمگا رہا تھا۔ اسفند نے بے زاری سے ایک نظر اسکرین کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر کال کاٹ دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ فون نیچے رکھتا بیل ایک بار پھر بجنے لگی تھی۔ اسفند کی پیشانی پہ بل آ ٹھہرے۔ اس نے اک گہری سانس لیتے ہوئے اپنے چٹختے اعصاب پر قابو پایا تھا اور کال ریسیو کرتے ہوئے فون کان سے لگا لیا تھا۔

"ہیلو۔ ہیلو بہادر۔" اس کی خاموشی پہ دوسری طرف سے اسے بے قراری سے پکارا گیا تو اسفند نے دھیرے سے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

"پھوپھا جی، میں۔ میں آپ سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

"نہیں، مجھے تجھ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ تو۔ تو اس وقت کہاں ہے؟" وہ بے چینی سے

www.pklibrary.com

بولے۔ ان کا اصرار اسفند کو مٹھیاں بھینچنے پر مجبور کر گیا۔

"میں اس وقت گاؤں سے باہر ہوں۔" اس نے بامشکل تمام اپنے لہجے کو روکھا ہونے سے روکا۔

نصر گردیزی نے اک گہری سانس لی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں بات شروع کریں۔

"میں نے سنا ہے کہ......" وہ اٹکے۔ "کہ تیری بیوی۔ میرا مطلب ہے کہ سلویٰ حویلی سے جا چکی ہے۔"

سلویٰ کے نام پہ اسفند کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کی پیشانی پہ بل آٹھہرے۔

"آپ نے مجھ سے یہ بات کرنے کے لیے فون کیا ہے؟" اس کا روم روم سلگ اٹھا۔ بس نہ چل رہا تھا کہ ہر چیز تحس نحس کر ڈالے۔

"نئی (نہیں) کہنا تو مجھے کچھ اور ہے لیکن پہلے میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تو کس حد تک اپنا نقصان کر بیٹھا ہے۔" وہ ملول سے بولے تو اسفند کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تیرے اور سلویٰ کے درمیان معاملہ کس حد تک بگڑا ہے بہادر؟"

"کیوں؟ آپ کو کیا پریشانی ہے؟" اس کا غصہ عود کر آیا۔ نصر گردیزی کو اپنا ضبط جواب دیتا محسوس ہوا۔

"خدا کے واسطے بہادر، جو پوچھا ہے اس کا جواب دے۔" وہ اب کے جھنجلا کر زور سے بولے تو اسفند ایک پل کو خاموش ہو گیا۔ اس نے آج پہلی بار اپنے پھوپھا کو اس لہجے میں خود سے بات کرتے سنا تھا۔ وہ بے اختیار الجھ گیا۔

"ہمارے۔ ہمارے درمیان کوئی رشتہ نہیں رہا۔" وہ بدقت تمام بولا۔

"کیا مطلب؟"

نصر کو لگا جیسے ان سے سننے میں کوئی غلطی ہو گئی ہو۔

اسفند نے مارے کرب کے اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"میں سلویٰ کو طلاق دے چکا ہوں۔"

"کیا؟" نصر نے بے اختیار لڑکھڑا کر کھڑکی کا سہارا لیا۔ "طلاق؟ لیکن کیوں؟ کس لیے؟" وہ چلا اٹھے تھے۔ ان کا ردِعمل اسفند کی ناگواری میں اضافہ کر گیا۔

"یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ بہتر ہوگا آپ اپنے کام سے کام رکھیں۔" وہ سارا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا تو نصر گردیزی کا خون کھول اٹھا۔

"ہونہہ، ذاتی معاملہ۔ کاش کہ تجھے احساس ہوتا کہ تیرا ذاتی معاملہ کبھی تیرا ذاتی تھا ہی نہیں۔ وہ اول روز سے تیرے پیو (باپ) کی بچھائی ہوئی ایک بساط تھا جس پر تیری حیثیت صرف اس پیادے کی سی تھی جسے وہ اپنی انگلیوں کے اشارے پہ چلا رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ ملک دلاور کے حوالے پر تیزی سے سیدھا ہوا۔ کم و بیش ایسا ہی طعنہ بخت چوہدری نے بھی اسے دیا تھا۔ اسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں ارتعاش سا برپا ہوتا محسوس ہوا۔

"مطلب جا کے اپنے باپ سے پوچھ۔ جو انسان نہیں بلکہ ایک سانپ ہے۔ کیونکہ ایک سانپ ہی اپنے بچوں کو کھاتا ہے۔ اس نے تجھی اپنے مفاد کی خاطر تیری خوشیوں، تیری زندگی کو کھا لیا ہے بہادر۔ اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس ظالم انسان نے یہ سب اتنی صفائی، اتنی مکاری سے کیا ہے کہ تجھے اس کی ذلالت کا احساس بھی نئی ہو سکا۔" ان کی آواز بات کرتے کرتے بے حد دل گرفتہ اور بوجھل ہو گئی تھی۔

اسفند نے اک گہری سانس لی۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟" اس کے انداز سے ساری خفگی، ساری تیزی مفقود ہو گئی تھی۔ نصر گردیزی

www.pklibrary.com

نے اک آہ سی بھری۔

"سلویٰ کا تعلق میرے گھرانے، میرے خاندان سے ہے۔ وہ میری بہن کی بیٹی اور میرے تایا شاہ مخدوم گردیزی کی پوتی ہے۔"

"کیا؟" اسفند یوں اپنی جگہ سے اچھلا جیسے اسے کسی کرنٹ نے چھولیا ہو۔ "ل۔لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ سلویٰ نے تو کبھی مجھ سے اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔"

"اس لیے کہ وہ خود بھی اس حقیقت سے لاعلم تھی بالکل اسی طرح جیسے میں نئی جانتا تھا کہ وہ میری پڑیویں (بھانجی)، میری سب سے چھوٹی بہن کی بیٹی ہے۔" وہ آرزدگی سے بولے۔

"لیکن آپ دونوں حقیقت سے لاعلم کیوں تھے؟" اسفند نے الجھ کر پوچھا۔

"کیونکہ میرا پچھلے بیس، اکیس سال سے اپنے خاندان والوں سے کوئی رابطہ، کوئی تعلق نئی۔"

"تو پھر آپ نے اسے کیسے پہچانا؟"

"میں نے نئی پہچانا......" وہ پھیکا سا مسکرائے۔ "مجھے اس کی پہچان کروائی گئی تھی۔"

"کروائی گئی تھی؟" اسفند نے الجھ کر دہرایا۔

"ہاں۔ مجھ پر یہ انکشاف تیرے پیو (باپ) نے کیا تھا۔ اور سختی سے منع کیا تھا کہ تجھے اس بارے میں کج نہ پتا چلے۔"

"کیا؟ ابا جی۔"

"تمہارے باپ نے خود سلویٰ کے دادا کو فون کر کے تمہاری اور اپنی چال کا اعتراف کیا تھا۔ انہیں اپنی جیت اور ان کی ہار کا پیغام دیا تھا۔" اچانک بخت چوہدری کی آواز بازگشت بن کر اس کی سماعتوں میں ابھری تو اسفند کی زبان تالو سے جا لگی۔ اس کی خاموشی نصر گردیزی کو مزید بولنے پر مجبور کر گئی۔

"تیرے پیو نے تجھ سے جھوٹ بولا ہے بہادر۔ وہ کبھی بھی سلویٰ کی حقیقت اور اس کے گھر، گھرانے سے انجان نہ تھا کیونکہ اس کے اور سلویٰ کے باپ دادا کے درمیان آج کی نئی بلکہ اکیس سال پرانی دشمنی ہے۔"

انکشاف تھا یا کوئی قیامت۔ اسفند کو اپنا وجود ایک دھماکے کے ساتھ ہوا میں بکھرتا محسوس ہوا تھا۔ اس کے حواس سلب ہو گئے تھے اور سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت مفلوج ہو گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف غم زدہ سے نصر، اس کی حالت سے بے خبر، اپنی دھن میں بولے چلے جا رہے تھے۔

"مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ تو اس کی دشمنی، اس کے انتقام کی بھینٹ چڑھ چکا ہے کیونکہ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ اس نے جو گھٹیا اور غلیظ الزام میری پڑیویں (بھانجی) پر لگایا ہے وہ صرف اس کی ایک گندی چال تھی تا کہ وہ شاہ مخدوم گردیزی کے خون اور ان کی نسل کو ذلیل و رسوا کر سکے۔ ان کی اولاد کو برباد کر کے، ان سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔"

"نہیں۔ آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے ابا جی ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ میرے ساتھ اتنا بڑا کھیل نہیں کھیل سکتے۔" اسفند نے صدمے کی سی کیفیت میں نفی میں سر ہلایا۔ نصر گردیزی نے اک بوجھل سی سانس لی۔

"وہ کیا کر سکتا ہے کیا نئی اس کا تجھے اندازہ بھی نئی پتر۔ لیکن اب اس سب کا کیا فائدہ؟ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا۔ وہ جیت گیا اور اس کی اس جیت کے بدلے میں اس کی اولاد نے کیا کھویا، کیا ہارا اس کی بلا سے۔"

اسفند نے مارے وحشت کے زور سے اپنا سر پیچھے درخت پہ مارا۔ اسے خود پہ جان کنی کا عالم طاری ہوتا محسوس ہوا تھا۔ سلویٰ سے دوری، اس سے جدائی اس کے لیے موت ہی تو تھی۔ اس کی آنکھیں تیزی سے جلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی یہ جلن، یہ تڑپ آنسو بن کر اس کے چہرے پہ بہہ نکلی۔

"اچھا پتر، رکھتا ہوں۔"

www.pklibrary.com

پل بھر کی خاموشی کے بعد نصر کی تھکی ہوئی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ سختی سے اپنے لرزتے لب دانتوں تلے دبا گیا۔ ان کے درمیان اب کہنے سننے کو اور رہا ہی کیا تھا؟

☆☆☆

بی بی نرگس آنگن میں رکھے اپنے تخت پر براجمان حقہ گڑگڑا رہی تھیں۔ سامنے ہی ملازمائیں تازہ اتری کیریاں چھیل کر اچار کے لیے ایک طرف ڈھیر لگا رہی تھیں۔ بظاہر ان کی نگاہیں سامنے موجود منظر پر جمی تھیں لیکن درحقیقت ان کا سارا دھیان بہادر کی جانب تھا جو آج صبح سے حویلی سے غائب تھا۔ بے اختیار اک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے رخ موڑ کر اپنی دائیں طرف دیکھا جہاں زمرد آنکھوں پر بازو رکھے دراز تھی۔ اس کا بایاں پاؤں مسلسل حرکت میں تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ وہ نا صرف جاگ رہی تھی بلکہ بے حد مضطرب بھی تھی۔

"تو نے بہادر سے بات کی؟"

"کس بارے میں؟" وہ آنکھوں سے بازو ہٹائے بنا بولی۔

"یہی شہر جا کے رہنے کے بارے میں۔"

"مجھے اپنے دانت نئی تڑوانے۔" وہ اپنا انداز بدلے بنا سپاٹ لہجے میں بولی تو بی بی نرگس نے ایک ناگوار سی نظر بھیجی پر ڈالی جو سلوئی کے جانے کے بعد ایک بار پھر اتنی ہی تلخ، اتنی ہی منہ پھٹ ہو گئی تھی جیسے کہ اس کے آنے سے پہلے تھی۔

"نجانے کیا جادو کیا ہے اس بچھل پیری نے۔ منڈا (لڑکا) تو اپنے حواسوں میں ہی نئی را (نہیں رہا)۔"

بی بی سر جھٹکتے اپنے دھیان میں بولیں تو زمرد کے لبوں پہ اک تلخ مسکراہٹ آ ٹھہری۔ کاش کہ وہ انہیں اس بچھل پیری کے جادو کا پتا بتا سکتی۔ انہیں سمجھا سکتی کہ اس کا جادو، اس کی طاقت اس کی بے لوث محبت اور خلوص تھا اور چونکہ ان کے "منڈے" نے یہ بیش بہا اور انمول خزانہ اپنے ہاتھوں گنوا دیا تھا اسی لیے اب وہ اپنے حواسوں میں نہیں رہا تھا اور زمرد کو گمان غالب تھا کہ یہ حواس اب تا عمر ہی گم رہنے والے تھے۔

"رجو! جا کے میرے کمرے سے میرا فون لے کر آ۔ میں ذرا اس صاحب بہادر کا پتا کروں......" جھنجھلائی آواز میں کہتے ہوئے وہ زمرد کی جانب پلٹیں۔ "اور تو بھی اٹھ کے بیٹھ۔ یہاں تیرا خصم دن رات اس رن (عورت) کے عشق میں پاگل ہوا جا رہا ہے اور تجھے اپنے آرام کی پڑی ہے۔" وہ جلی بھنی سی بولیں تو زمرد اک گہری سانس لیتی اٹھ بیٹھی۔

"اسے کہتے ہیں، لڑی کمیار نال تے کن مروڑے کھوتے دے (لڑائی کمہار کے ساتھ ہوئی اور مارا گدھے کو)۔" وہ پھوپھی کی جانب پلٹی تو انہوں نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ غصہ آپ کو اپنے پتر اور اس بگڑتی ہوئی صورت حال پر ہے اور پھنکار آپ مجھ بے چاری کو رہی ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی تو بی بی کا دل کیا کہ وہ آگے بڑھ کر خود ہی اس کے دانت توڑ دیں۔

وہ کچکچا کر اسے کوئی کرارا سا جواب دینے کو تھیں کہ بیرونی دروازے سے بہادر کو اندر آتا دیکھ کر ان کا سارا دھیان اس کی جانب مبذول ہو گیا۔ شوہر کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی زمرد نے بھی سکھ کا سانس لیا ورنہ اس کا دل مسلسل بے چین تھا۔ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی لیکن اس سے پہلے کہ آگے بڑھتی بہادر نے راہ میں آئے تھال کو ایک زوردار ٹھوکر کے ساتھ اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔

تھال آموں سمیت اوپر کو اچھلا اور ٹھنٹناتا ہوا زمین پہ آ پڑا۔ سب نے سہم کر اپنے دل تھام لیے لیکن وہ ہر طرف سے بے نیاز اندر کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

www.pklibrary.com

بی بی اور زمرد نے ایک ساتھ پلٹ کر ایک دوجے کو دیکھا۔ کسی گڑبڑ کا احساس بہت شدت سے ان دونوں کے اندر جاگا تھا، وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکیں۔

اسفند لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال میں داخل ہوا۔ اس کا ارادہ اپنے باپ کے کمرے کی طرف جانے کا تھا لیکن انہیں سامنے ہی اپنے دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر اس کے قدم ایک جھٹکے سے رک گئے۔

"او، لمبی عمر ہے میرے پتر کی۔ ہم ابھی تمہارے بارے میں ہی بات کر رہے تھے۔ صبح سے کہاں غائب ہو؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات ایک طرف رکھتے ہوئے بیٹے کو دیکھا۔

اسفند کی بے جان نگاہیں ان کے چہرے پر جم سی گئیں جو اپنی آنکھوں میں دنیا بھر کی نرمی سموئے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کے اندر دھواں سا بھرنے لگا۔ یہ چہرہ، یہ آنکھیں بھی اسے بھی دھوکا دے سکتی تھیں، اس نے کبھی گمان بھی نہیں کیا تھا۔

"کیا بات ہے، سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

اسے مسلسل خاموش کھڑا دیکھ کر ملک دلاور بری طرح چونکے تھے۔ اس کا چہرہ اور اس کی آنکھیں عجیب ناقابلِ فہم سے تاثرات سے سجی ہوئی تھیں۔ بے اختیار انہیں اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ انہیں پہلا خیال نصر گردیزی کا آیا تھا جس سے ابھی چند گھنٹے پہلے ہی ان کی بحث ہوئی تھی۔

"بہادر، تو کج بول کیوں نئی رہا پتر۔" بی بی نرگس گھبرا کر اس کی جانب بڑھیں۔ اسفند کی ساکت نظریں باپ سے ہوتے ہوئے ماں پر آٹھہریں۔

"کیا آپ بھی مجھے برباد کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہیں؟" وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتا اچانک سے بولا تو جہاں ملک دلاور کا دل دھک سے رہ گیا وہیں بی بی کے چہرے پر الجھن اتر آئی۔

"کیا مطلب؟"

انہوں نے تعجب سے بیٹے کو دیکھا لیکن اسفند انہیں جواب دینے کے بجائے باپ کی جانب پلٹا۔

"یاد ہے ابا جی، جب سلوئی کو حویلی لانے سے پہلے میری اور آپ کی نذر چاچا کے مہمان خانے میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"ہاں۔" وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق بولے۔

"تب میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا آپ سلوئی کی فیملی کو جانتے ہیں؟ اور آپ نے کہا تھا کہ نہیں۔ تو پھر اب آپ کی اچانک کیسے ان لوگوں سے اکیس سال پرانی دشمنی نکل آئی ہے؟" ان کی طرف دیکھتا وہ استہزائیہ لہجے میں بولا تو ملک دلاور کو اپنا حلق خشک پڑتا محسوس ہوا۔

"میری ان سے ایسی کوئی دشمنی نئی...... " وہ سنبھل کر روکھے لہجے میں بولے یوں جیسے اس کی بات اور اس کا انداز دونوں ہی انہیں بے حد ناگوار گزرے ہوں۔ "ہاں ایک معمولی سا جھگڑا ضرور ہوا تھا لیکن وہ کوئی اتنی بڑی بات نئی تھی جو میں پہلے ہی دن اس کا ذکر تم سے کر دیتا۔"

"اوہ! تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ نے جو بھی کیا میری خاطر کیا۔" اسفند نے بھنویں اچکائیں۔

"ایسا ہی ہے۔" ملک دلاور ضبط سے بولے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ جا کر نصر گردیزی کی گردن اڑا دیں۔

"تو پھر آپ نے سلوئی کے دادا، شاہ مخدوم کو جو فون کیا تھا وہ بھی یقیناً میری خاطر ہی کیا ہو گا۔" وہ اپنے سابقہ طنزیہ لہجے میں بولا تو ملک دلاور اپنی گھبراہٹ چھپانے کو تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"جھوٹ...... بلکہ سراسر بکواس ہے یہ۔ میں نے کسی کو کوئی فون نئی کیا۔" وہ صریحاً مکر گئے۔ ان کے جھوٹ پہ اسفند کی پیشانی کے بل گہرے ہو گئے۔

www.pklibrary.com

"نہیں کیا؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

"نئی۔" وہ دوبدو بولے۔

اسفند کے پہلو میں اس کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔

"تو پھر آپ نے نصر پھوپھا کو یہ حقیقت مجھے بتانے سے کیوں منع کیا تھا کہ سلویٰ ان کی بھانجی ہے۔"

"کیا؟ سلویٰ نصر کی پڑپوتی ہے؟" بی بی نرگس نے چونک کر بیٹے کو دیکھا۔ اس انکشاف نے باقی سب کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اسفند نے اک گہری سانس لی۔

"جی۔ وہ نا صرف نصر پھوپھا کی بھانجی ہے بلکہ ان کے تایا شاہ مخدوم گردیزی کی پوتی اور ان کے بیٹے سجان گردیزی کی بیٹی بھی ہے۔"

"شاہ مخدوم...... وہ نصر کے شہر والے تایا؟" بی بی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"جی وہی۔"

"ہائے ربا!" انہوں نے دہل کر دل کر تھاما۔ "ان سے تو ہماری......" اچانک انہیں صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا تو وہ لب دبائے خاموش ہو گئیں۔ اسفند نے ایک استہزائیہ نظر باپ پر ڈالی جو بے اختیار پہلو بدل کر رہ گئے تھے۔

"جی ان سے آپ کے شوہر کی بہت لمبی چوڑی دشمنی ہے لیکن آج وہ ہم سب کے سامنے اسے ایک معمولی جھگڑا بتانے پر تلے ہوئے ہیں۔" وہ کاٹ دار لہجے میں بولا تو ملک دلاور بھڑک اٹھے۔

"ہاں تو ہے دشمنی۔ لیکن اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ بلکہ مجھے تو یہی سمجھ میں نئی آ رہا کہ آخر اس سارے تماشے کا مقصد کیا ہے؟ کیوں تم نے باپ کو مجرموں کی طرح کٹہرے میں کھڑا کر رکھا ہے؟"

"انصاف پانے کے لیے۔ سچ اور جھوٹ کو واضح کرنے کے لیے۔ کیونکہ آپ نے اپنی اسی دشمنی کو نبھانے کی خاطر مجھے برباد کر دیا۔ مجھ سے میری خوشیاں، میرا سکون، میری محبت حتیٰ کہ میرے معصوم بچے کی ماں تک چھین لی۔ اور اس کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔" وہ سرخ چہرہ لیے زور سے بولا تو ایک پل کے لیے سب کو سانپ سونگھ گیا۔

"نئی میرا پتر، ایسی بات نئی......" بی بی نرگس پریشان سی بولیں۔ "میں نے خود اس لڑکے کو وہاں اس کمرے میں۔"

"جھوٹ تھا وہ۔ فریب تھا سب۔" اس نے تیزی سے ماں کی بات کاٹی۔ "محض ان کی ایک چال تھی تاکہ وہ سلویٰ کے ذریعے اپنے دشمنوں کو دھول چٹا سکیں۔ اپنی اس نام نہاد دشمنی میں فتح حاصل کر سکیں۔"

"بکواس ہے یہ۔ میں نے ایسا کچھ نئی کیا۔ تمہیں جس کسی نے بھی میرے خلاف بھڑکایا ہے گول کھایا ہے۔" ملک دلاور گرج کر بولے۔ اسفند نے ایک تیز نظر باپ پر ڈالی۔

"ایسی بات ہے۔" اس نے لب بھینچے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اندر رکھی پستول نکال کر سرعت سے اپنی کنپٹی سے لگا دی۔ سب کی چیخیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔ لیکن اسفند کسی کی بھی پروا کیے بنا باپ کے روبرو جا کھڑا ہوا جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے تک رہے تھے۔

"اب بتائیں کہ سچ کیا ہے؟ کیونکہ اگر آپ نے جھوٹ بولنے کی غلطی کی تو میں خود کو شوٹ کرنے میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا۔" ان کی آنکھوں میں دیکھتا وہ سرد لہجے میں بولا تو ملک دلاور کو اپنے جسم سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے خوف زدہ نظروں سے اپنے سامنے کھڑے جوان بیٹے کو دیکھا جس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتا جنون وہ صاف دیکھ سکتے تھے۔ بے اختیار انہیں اپنے گرد گھیرا تنگ ہوتا محسوس ہوا تھا۔

کوئی شک نہ تھا کہ آج انصاف کی گھڑی تھی۔ ان کی مہلت کے دن تمام ہوئے تھے اور اوپر والے نے ان کی رسی کھینچ لینے کی ٹھان لی تھی۔

☆☆

آخری قسط ان شاء اللہ آئندہ ماہ

www.pklibrary.com

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔

ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کر سکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کر سکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کر سکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ، اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ افریقہ، یورپ -/22000 روپے، ایشیا، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے،

کسی بھی معلومات اور آڈر کے لیے اس واٹس اپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس اپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

www.pklibrary.com

قرۃ العین خرم ہاشمی

کسوف

غائب دماغی سے چلتے چلتے اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کس سمت میں ہے۔ مگر جب اسے احساس ہوا تو ایک دم ہی برسوں سے اس کے وجود میں چھپا ڈر دل سے نکل کر ایک خوف ناک عفریت کی شکل میں تبدیل ہو کر چاروں طرف پھیل گیا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جنگل کے پاس پہنچ گئی تھی۔ کوئی وہاں پر موجود ہے! اس کا دل کانپنے لگا مگر وہ بت بنی اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اس نے پھر سفید آنچل کو لہراتے دیکھا۔ اب کی بار اس لڑکی کا سائیڈ پوز نظر آیا۔ وہ بری طرح چونکی۔ وہ اس لڑکی سے واقف تھی۔ کہیں دیکھا ہوا تھا یہ چہرہ!

سفید لباس والی لڑکی دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سفید لباس والی لڑکی کے خوبصورت پاؤں میں چاندی کی پائل تھی۔ کیا وہ کسی طلسم کا شکار ہو رہی تھی یا اس کی ذہنی حالت ایسی تھی؟

سفید لبادے والی لڑکی سج سج کے قدم اٹھاتی درختوں کے درمیان سے نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے دور سے دیکھا سفید لباس والی لڑکی کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ اور چاند کی طرح روشن تھا۔ اس کا سفید لباس ستاروں کی طرح چمک رہا تھا۔ اس لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرے پر بچوں سی معصومیت! جیسے وہ جنت کی حور ہو! مگر وہ سفید لڑکی جیسے جیسے قدم اٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کی وضع میں واضح تبدیلی آتی جا رہی تھی۔ وہ خوف زدہ نظروں سے اسے سامنے سے آتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

کوریڈور میں کھڑے سب افراد حیرت اور خوف سے سامنے کے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ کسی میں بھی اتنی ہمت یا جرات نہیں تھی کہ وہ آگے بڑھتا اور زمین پر گرے، ہاتھ جوڑ کر روتے، معافیاں مانگتے لڑکے کو بچا لیتا۔ جس کو مارنے والا بے دردی سے سیکنڈ فلور پر موجود کلاس روم سے گھسیٹتے ہوئے گراؤنڈ فلور پر لایا تھا۔ وہ مرد غصے سے کف اڑاتا ہاتھوں، ٹھڈوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا۔ پندرہ سالہ لڑکے کے کپڑے پھٹ گئے۔ اس کے چہرے اور جسم پر جگہ جگہ زخم تھے۔ جن سے خون بہہ رہا تھا۔ اسی لڑکے نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑے اور سامنے کھڑے شخص کے قدموں میں گر گیا۔

"سر پلیز! غلطی ہو گئی...... معاف کر دیں!"

"تم معافی کے لائق نہیں بلکہ واجب القتل ہو!" سرخ آنکھوں کے ساتھ اس نے نفرت سے لڑکے کی طرف دیکھ کر تھوکا تھا۔

"سر پلیز!"

لڑکے نے شرمندگی اور ذلت کے شدید ترین احساس کے ساتھ اپنے آس پاس کھڑے دوستوں اور کلاس فیلوز کی طرف دیکھا تھا۔ سب کی نگاہوں میں اس کے لیے واضح نفرت تھی۔

"مسٹر ذیشان! خود پر کنٹرول رکھیں۔ پولیس کو اپنا کام کرنے دیں۔"

کالج کے کچھ سینئر اساتذہ تیزی سے آگے بڑھے اور بمشکل غصے سے بھرے ذیشان کو ایک کونے

www.pklibrary.com

مکمل ناول



pklibrary.com

www.pklibrary.com

میں لے گئے۔ وہ لڑکا جس کے پیچھے کئی نوکروں، کئی خادموں کی فوج ہوتی تھی آج وہ کسی حقیر کیڑے کی طرح زمین کی خاک چاٹ رہا تھا۔ صرف اس ایک شخص کی وجہ سے۔ اس لڑکے نے روتے ہوئے ہمت کی اور اپنے زخمی ہاتھوں کا سہارے کے لیے پھیلانے لگا مگر اس کے کلاس فیلوز یا دوستوں میں سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا بلکہ وہ لوگ چند قدم پیچھے ہٹ گئے کہ کہیں وہ لڑکا ان میں سے کسی کو اپنی مدد کے لیے آواز نہ دے دے۔ اس لڑکے نے آج زندگی کا سب سے تلخ سبق سیکھا تھا کہ

"آپ دنیا پر کبھی ترس نہیں کھائیں کیونکہ دنیا کبھی آپ پر ترس نہیں کھاتی ہے!"

اس لمحے لڑکے نے عہد کیا کہ وہ کبھی کسی پر ترس نہیں کھائے گا۔ کبھی کسی کے ساتھ اچھائی نہیں کرے گا! وہ لڑکا لڑکھڑاتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے مہنگے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ آج وہ ذلت کے پاتال میں اندر ہی اندر دھنس رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدم، ایک پاؤں میں جوتا اور پھٹے کپڑوں کے ساتھ ابھی چند قدم ہی چلا تھا، جب آٹھ دس، پولیس والوں نے اسے گھیر لیا۔ مگر وہ پولیس کو دیکھ کر نارمل ہی رہا کیونکہ وہ اس وردی کے لوگوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا! اس وردی کے لوگ تو اس کے دربار پر اکثر حاضری دیتے تھے۔ پولیس نے رسمی کارروائی کی اور سب کے سامنے لڑکے کو ہتھکڑیاں لگا کر اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ آس پاس حیرت زدہ کھڑے لوگوں کے درمیاں سے سر جھکائے گزرتے ہوئے اس لڑکے نے ایک تیکھی نظر کچھ دور کھڑے شخص پر ڈالی۔ اس لڑکے کی نگاہ میں نفرت اور انتقام کا اتنا زہر تھا کہ اگر کچھ دور کھڑے شخص کو اندازہ ہو جاتا تو وہ اس لڑکے کو آج سچ میں فنا ہی کر دیتا۔ جب تک وہ لڑکا وہاں سے چلا نہیں گیا ذیشان غصے سے پیچ و تاب کھاتا اسے دیکھتا رہا۔ پولیس کے جانے کے بعد واپس پرنسپل نے سب ذیشان کو پرنسپل کے آفس میں جانے کا کہا۔ ذیشان سر جھکا ہوا پرنسپل کے آفس کی طرف چل پڑا۔ پرنسپل صاحب اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ ذیشان کو سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مسٹر ذیشان! آپ کو اپنے غصے پر قابو رکھنا چاہیے۔ مت بھولیں کہ آپ ایک بڑے اور نامور ادارے میں ٹیچر ہیں۔" مغربی لہجے میں بولتے پرنسپل نے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے شخص کو دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں سرزنش کی۔

"آپ کو اس وقت بھی اپنے ادارے کے بڑے نام کی فکر ہے؟" ذیشان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"ہاں۔ میری پہلی ترجیح یہ ادارہ ہی ہے۔" پرنسپل افتخار رضوی کا انداز دو ٹوک تھا جو ذیشان کو بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔

"اور میری پہلی ترجیح انسانیت ہے۔" ذیشان نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔

"آپ اس ادارے کے ایک قابل ٹیچر ہیں مگر میں کسی کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ وہ ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچائے۔" پرنسپل افتخار رضوی نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بات ہی تو مجھے تکلیف دے رہی ہے کہ میں ایک ٹیچر ہوں جس کی ایک ہونہار طالبہ کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک کیا گیا۔ اور میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس بچی کی تکلیف دور کرنے کے لیے کچھ نہیں کرسکتا...... اگر میرا بس چلتا تو......"

ذیشان نے غصے سے اپنے ہاتھ پر مکا مارا جیسے تصور میں اس لڑکے کا سر کچل رہا ہو۔ ایک لمحے کے لیے پرنسپل افتخار رضوی کا دل بھی نرم پڑا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ذیشان کے پاس گئے اور اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"میں مانتا ہوں کہ یہ بہت گری ہوئی حرکت ہے مگر......"

"سر! شکر ہے کہ آپ اس حرکت کو گرا ہوا کہنے کی تو جرأت رکھتے ہیں۔" بات کاٹتے ہوئے طنزاً کہا۔

"آپ شاید اس حرکت کو برا کہہ کر اپنے ضمیر کی عدالت میں بری الزمان ہو سکتے ہیں۔ جبکہ میرا ضمیر

www.pklibrary.com

مجھے تب تک کچوکے لگاتا رہے گا جب تک کہ میں اس بچی کو انصاف نہ دلوا دوں۔ میں کس تکلیف اور کرب سے گزر رہا ہوں۔ آپ نہیں سمجھ سکتے۔ ایکسکیوزمی سر!" ذیشان کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور بڑے بڑے قدم اٹھاتا پرنسپل آفس سے باہر نکل گیا۔

افتخار رضوی نے گہری سانس لی۔ کل ہونے والی اس دل خراش واقعہ کی وجہ سے وہ بھی بہت دکھی اور پریشان تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے تعلیمی ادارے کو بھی دیکھنا تھا۔ جس کی ساکھ اب خطرے میں تھی۔ وہ بہت تیزی سے اس مسئلے کا حل سوچ رہے تھے۔ "کچھ بھی ہو یہ بات لیک آوٹ نہیں ہونی چاہیے!" افتخار رضوی نے دل میں تہیہ کیا اور پیون کو بلانے کے لیے بیل بجائی۔ افتخار رضوی اپنے کچھ قریبی اور ادارے کے سینئر اساتذہ سے مشاورت کر کے اس کا مسئلے کا حل سوچنا چاہتے تھے۔

☆☆☆

"بابا! میرے لیے نیلی آنکھوں والی گڑیا لانا، جس کے بال سنہری ہوں اور اس کے ڈھیر سارے خوب صورت ڈریس ہوں اور بابا میں نے اپنی سب فرینڈز کو بتایا ہے کہ میری سالگرہ پر میں باربی ڈول کی تھیم رکھ رہی ہوں اور بابا۔"

سات سالہ گل کی پٹر پٹر چلتی زبان رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ افشاں نے گل کو گھورتے ہوئے اس کے ہاتھ سے فون پکڑا۔

"تم نے پھر سے فرمائشیں شروع کر دیں۔" پھر گہری سانس لے کر فون کان سے لگایا۔

"اس کی تو باتیں بھی ختم ہی نہیں ہوں گی۔ آپ بتائیں واپسی کب ہے؟" افشاں نے نرمی سے پوچھا تو دوسری طرف سے ذیشان نے گہری سانس لے کر نفی میں سر ہلایا۔

"پتا نہیں۔ دراصل ایک مسئلہ آ گیا ہے۔ جیسے ہی وہ حل ہوتا ہے، میں واپس آ جاؤں گا۔" ذیشان نے کہا۔

"سب خیریت ہے......؟ کیسا مسئلہ؟"

افشاں نے فکرمندی سے پوچھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ واپس آ کر تفصیل سے بتاؤں گا۔ تم بس گل کا خاص خیال رکھنا، اسے اکیلے کہیں مت جانے دینا۔"

ہمیشہ کی طرح ذیشان نے ہدایت نامہ جاری کیا تو افشاں سر ہلا کر رہ گئی۔

"آپ بے فکر رہیں۔ میں گل کو اکیلے کہیں بھی نہیں جانے دیتی ہوں۔" افشاں نے تسلی دی تو ذیشان نے طمانیت بھری سانس لی۔

"گل کی سالگرہ میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میں تب تک واپس آ جاؤں گا۔" ذیشان نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ان شاء اللہ! یقین کریں، میں تو ہر وقت آپ کی خیر کی دعا کرتی رہتی ہوں۔ میرے پاس آپ کے اور گل کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا انمول خزانہ آپ دونوں ہیں۔"

افشاں نے محبت سے اعتراف کیا تو ذیشان کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی پھیل گئی۔

"افشاں! خوش نصیب تو میں ہوں جسے تمہارے جیسا ہم سفر ملا ہے۔ تم نے ہمیشہ ہر قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ میں چاہوں بھی تو تمہاری اس محبت اور احساس کا بدلہ نہیں چکا سکتا ہوں۔ تم ایک بہترین بیوی اور بہترین ماں ہو۔"

ذیشان کے نرم لہجے میں کہے سادہ مگر خوب صورت لفظوں نے افشاں کے چہرے اور دل کی دنیا کو رنگوں سے سجا دیا تھا۔

"آپ اب آرام کریں۔ کافی رات ہو گئی ہے!"

افشاں نے فکرمندی سے کہا تو ذیشان نے شب بخیر کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ افشاں گہری سانس لے کر گل کو آوازیں دیتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

ذیشان ملک جس مشہور یونیورسٹی میں لیکچرار کی جاب کر رہا تھا، کچھ عرصہ پہلے، اس ادارے کی طرف ذیشان کو اعزازی طور پر ایک کورس کے سلسلے میں

www.pklibrary.com

دوسرے شہر میں موجود مرکزی برانچ میں بھیجا گیا تھا۔ ذیشان ریاضی کا بہت ذہین اور قابل استاد تھا۔ وہ اپنے شاگردوں پر خصوصی نظر رکھتا تھا۔ اس کا دوستانہ رویہ اور شفقت بھرا انداز سب طالب علم کو اس کا گرویدہ بنا دیتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ ذیشان جس ادارے میں بھی گیا، وہ ایک مقبول اور دل عزیز استاد کے طور پر جانا جاتا تھا۔

یہ کورس تقریباً چھ مہینے کے مختصر عرصے پر محیط تھا۔ گل کے اسکول کی وجہ سے ذیشان اپنی فیملی کو ساتھ لے کر نہیں گیا مگر دوسرے شہر جانے کے باوجود اس کی ساری توجہ اپنی بیٹی کی طرف لگی رہتی تھی۔ گل میں ذیشان اور افشاں کی جان تھی۔ شاید اس لیے بھی کہ گل شادی کے آٹھ سال بعد بہت منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ گل بچ میں ان کے آنگن کا اکلوتا اور خوب صورت ترین پھول تھی۔

گل بھی ماں سے زیادہ باپ کے قریب تھی۔ وہ سارا دن بے چین رہتی۔ کبھی کال ملاتی۔ کبھی صرف میسج کر دیتی تھی۔

گل سب سے پہلے اپنی ماں کی شکایت لگاتی جو اسے کال کرنے سے منع کرتی تھی۔

ڈاکٹر ارم بیگ، زنانہ وارڈ کا فائنل راؤنڈ لے کر باہر نکلی، تو کوریڈور میں کھڑے شخص پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔ اس کے چہرے پر تیزی سے رنگ آئے اور گزرے۔

''ذیشان! تم کب آئے؟''

ڈاکٹر ارم نے پاس آ کر بظاہر بہت پرسکون انداز میں پوچھا مگر اس کے لہجے اور آنکھوں سے چھلکتی بے تابی بہت واضح تھی۔

''ابھی کچھ دیر پہلے۔''

ذیشان اپنی سوچوں میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اس نے ڈاکٹر ارم کے چہرے پر نگاہ ڈالی ہی نہیں۔ ڈاکٹر ارم اس کی ذہنی حالت اچھی طرح سمجھتی تھی مگر پھر بھی اس کے آس سے بھرے دل کو اس طرح دھچکا لگا جیسے وہ پانی سے بھرا پیالہ ہو جو ذرا سی حرکت سے چھلک جائے۔ ذیشان بے خیالی میں چلنے لگا تو ڈاکٹر ارم نے بھی اس کے قدم کے ساتھ قدم ملائے۔

''ذیشان! تم نے کیا سوچا ہے؟''

ذیشان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''سوچنا کیا ہے؟ میں اپنی بات پر قائم ہوں ارم!''

ذیشان کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح چٹان جیسی مضبوطی تھی۔ بھی ذیشان کی اسی عادت، اس کے عزم اور قوت ارادی نے ارم کے دل کو اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ وہ آج بھی ویسا ہی تھا۔ شاید وہ بھی ویسی ہی تھی۔ ان کے درمیان اگر کچھ بدلا تھا تو وہ وقت تھا۔ جو پہلے جیسا نہیں رہا تھا۔

''ارم! تم نے میری جوزف کی حالت دیکھی ہے ناں! میں جب سے اس سے مل کر آیا ہوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ وہ پھول جیسی لڑکی۔ اور اتنی درندگی!'' ذیشان نے کہتے کہتے ضبط سے لب بھینچ لیے تھے۔

''میں مانتی ہوں کہ میری جوزف کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔'' ڈاکٹر ارم نے افسردگی سے کہا۔

''مگر ذیشان، سامنے والی پارٹی کا بہت مضبوط سیاسی بیک گراؤنڈ ہے اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ لوگ مسلسل تمہیں دھمکیاں دے رہے ہیں؟'' ڈاکٹر ارم نے رکتے ہوئے فکرمندی سے کہا تو ذیشان تلخی سے ہنس پڑا۔

''کمزور لوگ دھمکی دینے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں؟'' ذیشان کے لہجے میں نفرت تھی۔

''مگر ذیشان! ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر ارم نے پریشانی سے کچھ کہنا چاہا۔

''تو کیا میں اس وجہ سے سچ کا ساتھ نہ دوں؟ پلیز ارم، کیا میں اب تمہیں بھی وضاحت دوں گا؟ پہلے ہی دنیا کی عدالت کافی ہے میرے لیے۔'' ذیشان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا تو ارم اس کے خود پہ یقین اور مان پر اندر تک سرشار ہوگئی۔

''ذیشان! کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ کھڑی رہوں گی۔''

www.pklibrary.com

ڈاکٹر ارم نے مضبوط لہجے میں کہا تو ذیشان نے اس عرصے میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا تو ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ وہ آج بھی اپنی محبت میں پہلے دن کی طرح تھی، خالص اور ایماندار۔ ذیشان کو بے ساختہ اس کی محبت، اس کا محبوب ہونے پر فخر محسوس ہوا تھا۔

وہ دونوں ہسپتال سے باہر نکل آئے تھے او راب ان کا رخ ہسپتال کے بڑے اور وسیع باغ کی طرف تھا۔ سردی کا آغاز تھا۔ اس لیے دوپہر سے ملتی شامیں دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ کبھی ایسی ہی دھند بھری دوپہروں، شاموں اور راتوں میں واک کرنا، ان دونوں کا من پسند مشغلہ ہوتا تھا۔ کچھ دیر دونوں کے درمیاں بھید بھری خاموشی رہی۔

"اس دن کیا ہوا تھا؟" ڈاکٹر ارم نے سنجیدگی سے سوال کیا تو ذیشان بھی چونک کر ماضی سے حال میں پہنچ گیا۔

"اس دن الوداعی پارٹی تھی۔ میں بہت خوش تھا کہ ایک دو دن میں واپس اپنے شہر، اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس چلا جاؤں گا۔ اسی خوشی کی اطلاع میں فون کر کے گھر دے رہا تھا۔ گل سے بات کرتے ہوئے مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ میں دوسری منزل کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ جب میں نے کمرے کی پچھلی کھڑکی سے ایک منظر دیکھا۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی کالج کے پچھلے حصے سے باہر جا رہے تھے۔ ان کا رخ پاس والے گھنے جنگل کی طرف تھا۔ میں ان سب کو آسانی سے پہچان گیا تھا۔ میری چھٹی حس نے کسی خطرے کا احساس دلایا اور میں نے جلدی سے فون بند کیا۔ جلدی جلدی فون بند کرتے ہوئے بھی مجھے دس منٹ لگ گئے۔ کیونکہ گل بہت اداس تھی اور وہ بار بار مجھ سے بات کرنے کی ضد کر رہی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ ان لڑکوں ساکھ بہت خراب ہے۔ او رمیری جوزف بہت سادہ اور معصوم لڑکی ہے جو آسانی سے ٹریپ ہو سکتی تھی۔ میرے باہر پہنچنے تک وہ لوگ وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ مگر میرا اندازہ تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ اس لیے میں کالج کے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر جب، کالج سے ملحق جنگل میں گیا تو تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے میری جوزف بے ہوش حالت میں گھنی جھاڑیوں کے پیچھے پڑی ہوئی مل گئی۔ بس پھر فوراً ایمبولینس کو کال کی۔ آگے جو ہوا وہ سب تمہیں پتا ہے۔ مجھے بار بار اپنی لاپروائی پر غصہ آتا ہے کہ اگر میں گل سے بات کرنے میں اتنا مگن نہیں ہوتا تو شاید ان لڑکوں کو میری جوزف کو پارٹی سے ورغلا کر لے جانا اتنا آسان نہیں تھا۔ کیونکہ میں اپنے سب طالب علموں پر گہری نظر رکھتا ہوں۔ مگر میں اپنی ایک لائق اور قابل طالبہ کی حفاظت نہیں کر سکا۔ مجھے ساری زندگی اس بات کا شدید دکھ رہے گا۔ میری جوزف کے بہت اونچے خواب ہیں، جو وہ اپنے غریب گھرانے کے حالات بدلنے کے لیے دیکھتی ہے۔"

ذیشان نے اداسی سے کہا۔ وہ دونوں چلتے چلتے لان میں موجود ایک بینچ کے پاس آ کر رک گئے۔

"اور اب ادارہ بھی اپنی ساکھ بچانے کے لیے اس کیس کو دبا رہا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایک طرف میری جوزف ہے، جس کے ساتھ میری لاپروائی کی وجہ سے یہ ظلم ہوا ہے اور دوسری طرف ادارے کی طرف سے بڑھتا ہوا دباؤ کہ میں اس کیس سے خاموشی سے پیچھے ہٹ جاؤں۔" ذیشان نے پریشانی سے کہا۔

"ذیشان! تم جانتے ہو کہ جب قسمت ہمارا ساتھ نہ دے، تو ہر صحیح کام بھی غلط طریقے سے ہونے لگتا ہے۔ پھر چاہے ہم کتنی ہی احتیاط یا فکر کر لیں۔ بعض اوقات ہم تقدیر کی ستم ظریفی کے آگے بے بس ہو جاتے ہیں۔ خود کو الزام دینا بند کرو۔" ڈاکٹر ارم نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں نہیں مانتا۔ ہم اپنی قسمت خود بناتے او ربگاڑتے ہیں ارم، اگر میں اس دن میری جوزف کو روک لیتا تو آج اس کا یہ حال نہیں ہوتا۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔" ذیشان نے غصے سے

www.pklibrary.com

اپنی ہتھیلی پر مکا مارتے ہوئے کہا۔

''اس کے دونوں ساتھیوں کا پتا چلا؟'' کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ڈاکٹر ارم نے سوال کیا۔

''پتا چل جائے گا۔ ایک خبیث تو پولیس کے شکنجے میں ہے۔ باقی دو بھی مل جائیں گے۔ بھاگ کر کہاں جائیں گے۔''

ذیشان نے نفرت سے کہا تو ارم سر ہلا کر رہ گئی وہ جانتی تھی کہ یہ سب اتنا آسان ہرگز نہیں ہے جتنا ذیشان کو لگ رہا ہے۔ یہاں پیسے اور طاقت کی دوڑ شروع ہو چکی تھی۔ ذیشان صرف سچائی اور ایمانداری کی بنیاد پر ایسی کسی دوڑ میں بھاگنا تو دور کی بات، چند قدم سے زیادہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔

☆☆☆

میری جوزف کے کیس کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کرتے، وہ مسلسل میری جوزف کے والدین سے بھی رابطے میں تھا۔ اس دن وہ پہلی فرصت میں میری جوزف کے والدین کے گھر چلا گیا۔ جہاں جا کر اسے صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہوا۔ میری جوزف کے والدین کی حالت بہت خراب تھی۔ ذیشان سے بات کرنے کے دوران بھی ان کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ ان کے بہت سے خدشے تھے، معاشرے میں ان کی عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بار بار میری جوزف کے چھوٹے بہن بھائیوں کا ذکر کرتے، جن کا مستقبل بھی اب داؤ پر لگ چکا تھا۔ ذیشان وہاں سے واپس آیا تو پہلے سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ ذیشان محسوس کر رہا تھا کہ میری جوزف کے کیس کے سلسلے میں پولیس بھی جانبداری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے ادارے اور پولیس کے درمیاں کوئی خفیہ معاہدہ ہوا ہے۔ پولیس والے تفشیش کرنے بہانے بار بار ذیشان کے پولیس اسٹیشن چکر لگوا رہی تھی۔۔

اس دن بھی صبح سے پولیس اسٹیشن میں بیٹھا ذیشان، جب تھکا ہارا دوپہر کے وقت گھر آیا تو افشاں کے فون نے اسے مزید حواس باختہ کر دیا۔ صبح اسکول جاتے ہوئے، گل سیڑھیوں سے سلپ ہوئی اور چوٹ لگنے کی وجہ سے اس کا بازو فریکچر ہو گیا۔ تکلیف اور درد سے تڑپتی گل نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس موقع پر افشاں کے لیے اسے اکیلے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ابھی بھی گل نے ضد کر کے باپ کو کال ملوائی۔ افشاں نے فون گل کے کان سے لگایا جو اپنے خوب صورت سے بیڈ پر بیٹھی، سوں سوں کر رہی تھی۔

''بابا جان! بہت ہائی (درد)!'' گل نے روتے ہوئے کہا تو ذیشان تڑپ کر گیا۔

''میری جان! آپ جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''بابا جان! جلدی آئیں!'' گل نے کہا تو ذیشان کا دل کیا کہ اڑ کر اپنی بیٹی کے پاس پہنچ جائے۔

فون بند کر کے وہ کچھ سوچنے لگا اور پھر پولیس اسٹیشن کال ملائی۔

''میری بیٹی بہت بیمار ہے۔ میں دو دن کے لیے واپس جا رہا ہوں۔ جانے سے پہلے آپ کو مطلع کرنا ضروری سمجھا۔''

ذیشان نے تفصیل سے بتایا اور ایک پیغام کالج انتظامیہ کو بھی بھیج کر اس نے پہلی دستیاب فلائٹ کا پتا کیا۔ صبح سات بجے کی بکنگ کروا کر اس نے ڈاکٹر ارم کو کال کی اور اپنے جانے کے بارے میں بتایا۔

''میں تم سے ملنے آ رہی ہوں!'' ڈاکٹر ارم نے ایئر پورٹ کے قریب کافی شاپ میں انتظار کرنے کو کہا۔ ذیشان فون بند کر کے اپنا سامان پیک کرنے لگا۔

☆☆☆

کافی کے بھاپ اڑاتے کپ سامنے رکھے ہوئے تھے۔

ارم نے گہری سانس لی اور ماضی کی ان خوبصورت یادوں کو کھنگالنے لگی، جو اسے اپنی زندگی کا سرمایہ لگتی تھیں۔

آج سے کئی سال پہلے ذیشان اور ارم کی ملاقات سنگاپور میں ایک تربیتی کانفرنس کے دوران ہوئی تھی

www.pklibrary.com

۔حالانکہ دونوں الگ الگ فیلڈ سے تعلق رکھتے تھے مگر اس کے باوجود وہ دونوں ایک مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کی طرف تیزی سے کھنچتے چلے گئے۔

ذیشان سے ملنے کے بعد اس کے خوابوں میں محبت کا رنگ گھل گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دل کی حالت سے واقف تھے۔ ذیشان کا ارادہ تھا کہ وہ پاکستان واپس جاتے ہی اپنے والدین سے ارم کے بارے میں بات کرے گا۔ وہ اسی وعدے کے ساتھ واپس گیا۔ ارم جانتی تھی کہ ذیشان اس کے ساتھ مخلص ہے۔ ارم کو مزید کچھ عرصہ وہاں رہنا تھا۔ اس لیے طے ہوا کہ ارم کی پاکستان واپسی تک ذیشان اپنے والدین سے بات کر لے گا تاکہ ارم کے واپس آتے ہی وہ نکاح جیسے خوبصورت بندھن میں بندھ جائیں۔

ذیشان نے ایک ہفتے کے بعد ارم کو کال کی مگر یہ بتانے کے لیے کہ اس کے والدین اس رشتے کے لیے نہیں مان رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی مرضی اور پسند سے کرنا چاہتے تھے۔ ذیشان ان دنوں بہت پریشان تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا۔ وہ نہ تو انھیں ناراض کر کے زندگی گزارنے کے بارے میں سوچ سکتا تھا اور نہ ہی انہیں چھوڑ کر اپنی نئی دنیا بسانا چاہتا تھا۔ ایک سعادت مند اور نیک اولاد کی طرح ذیشان کی پہلی ترجیح اس کے بوڑھے والدین تھے۔ جنہوں نے اپنی طرف سے بہتر سے بہتر چیز ذیشان کو مہیا کی تھی۔ ذیشان ان کی امیدوں، ان کی تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ جس کے گرد وہ دیوانہ وار گھومتے تھے۔ شاید اسی ڈر کی وجہ سے وہ ذیشان کی من پسند لڑکی سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے کہ کہیں وہ لڑکی ذیشان کو ان سے چھین کر ہی نہ لے جائے۔ کچھ عرصے کے بعد ارم پاکستان واپس آ گئی۔ ارم اور ذیشان مسلسل رابطے میں تھے۔

ذیشان صبر اور استقامت سے اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ جب ذیشان کی والدہ شدید بیمار ہو کر ہسپتال داخل ہو گئیں۔ ماں کو تکلیف میں دیکھ کر ذیشان کو سب بھول گیا۔ اپنی ضد، اپنی محبت بھی۔ ارم کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ذیشان اپنے والدین کے آگے ہار گیا ہے۔ وہ ذیشان کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس مشکل وقت میں ارم نے ذیشان کا ساتھ دیا اور اسے ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔

''ذیشان! تم اپنے والدین کو ناراض کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکو گے۔ اس طرح دو کشتیوں کا سوار بننے سے بہتر ہے کہ تم ان کی بات پورے دل کے اطمینان اور خوشی سے مان لو۔ بعض اوقات سر جھکانے سے، بہت بلند رتبے ملتے ہیں۔ اور میں تمہیں سب سے بلند رتبے پر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

ارم کی عجیب سی خواہش میں ہجر کے ماہ و سال قید تھے۔ ذیشان نے اپنی طرف سے ہر ممکن کوشش کرنے کے بعد بالآخر تھک ہار کر اپنے والدین کی بات مان لی۔

ذیشان شادی ہو گئی اور اس کے کچھ عرصے کے بعد ارم اسپیشلائزیشن کرنے کے لیے امریکا چلی گئی۔

اتنے سال گزر جانے کے باوجود ارم اپنے دل کو کسی اور مرد کے لیے راضی نہیں کر سکی۔ جبکہ ذیشان اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔

اور اب اتنے سالوں کے بعد ذیشان اور ارم کی ملاقات اس شہر میں ہوئی۔ جہاں کے پرائیویٹ ہاسپٹل میں ڈاکٹر ارم مشہور گائنا کالوجسٹ تھی۔

اتنے سالوں کے بعد وہ اچانک ملے، جہاں ارم کے انداز میں ذیشان کے لیے گرم جوشی تھی، وہاں ہی ارم سے ملتے وقت ذیشان کا رویہ ایسا تھا کہ جیسے وہ ماضی میں صرف دوست ہی رہے ہوں۔

ذیشان اپنی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن ہے۔ ارم نے افسردگی سے کئی بار سوچا تھا۔

''تو تم کیس ادھورا چھوڑ کر واپس جا رہے ہو؟'' ڈاکٹر ارم نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''میں جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔'' ذیشان نے جلدی سے کہا۔

''تمہارے واپس آنے تک صورت حال بدل بھی سکتی ہے!'' ارم نے لاشعوری طور پر اسے روکنے

www.pklibrary.com

کی کوشش کی تھی۔

''ہاں مجھے اندازہ ہے مگر مجبوری ہے۔ گل مجھ سے بہت اٹیچ ہے۔ جب تک مجھے دیکھے گی نہیں۔ اسی طرح ضد میں رو کر تنگ کرتی رہے گی۔''

ذیشان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ارم خاموش رہی۔ اگر کچھ کہتی تو شاید کئی سالوں کا بنایا ہوا اپنا بھرم آنسوؤں میں بہا دیتی۔

ہم زندگی میں چاہے کتنے ہی بہادر یا بڑے ہوں جائیں، محبت کے معاملے میں ہماری سوچ اور رویہ ہمیشہ کم سن اور نادان ہی رہتا ہے!

''کچھ دیر کے بعد میری فلائٹ ہے۔'' ذیشان نے ایک سرسری سی نظر ارم پر ڈالی۔

''دوبارہ کب ملو گے؟''

ارم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ذیشان نے میز پر رکھا موبائل اٹھایا۔ اس کی اسکرین روشن ہوئی اور گل کا ہنستا مسکراتا ہوا چہرہ نمودار ہوا۔ ذیشان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارم کی متلاشی نظریں، اس پر مرکوز تھیں۔ جو اس کی محبت کا واحد مرکز تھا۔

''شاید بہت جلد ...... یا شاید کبھی نہیں۔''

ذیشان نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ارم کو لگا کہ جیسے سفید برف جلنے لگی تھی۔

''مگر ارم، میری خواہش ہے کہ تم اپنی خود ساختہ قید تنہائی سے نجات حاصل کر کے آگے کی طرف ضرور دیکھو۔ اپنے لیے ایک ہمسفر چنو جیسے کہ میں نے چنا ہے اور میرا یقین کرو کہ زندگی ہمسفر کے بغیر ادھوری ہے۔ اور......'' ذیشان کی آواز مدھم ہوئی تھی۔ ارم کا سارا وجود کان بن چکا تھا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم ایک ادھوری زندگی جیو۔''

ذیشان نے ایک نگاہ ارم پر ڈالی۔ اس کی نگاہ میں کیا نہیں تھا۔ ارم کو لگا جیسے اسے اپنے سب سوالوں، تلاش کا جواب مل گیا ہے۔ ارم کی آنکھوں میں نمی ابھری تھی۔ اس نے فوراً سر جھکا لیا۔ ذیشان نے اس کے آنسو اپنے اندر کہیں گرتے ہوئے محسوس کیے۔ اس لیے جب بولا تو اس کا لہجہ محبت سے بھیگا مگر نم تھا۔

''تم جانتی ہو ارم، یہ بھی محبت کی معراج ہے کہ محبت کرنے والے اگر ایک فضا میں، ایک ساتھ، چاہے کچھ لمحوں کے لیے ایک ساتھ موجود ہوں، ایک ساتھ سانس لیتے ہیں، ایک دوسرے کو محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ہی نہیں میں تمہارے ساتھ کے کچھ لمحے جینے، رات کے اس پہر یہاں چلا آیا ہوں۔''

ذیشان کے اعتراف نے ارم کو ساکت کر دیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ارم نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ذیشان کی نگاہوں میں الوداعی پیغام بہت واضح تھا۔

ارم خاموش نگاہوں سے اسے وہاں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ احساس بہت خوب صورت اور حسین تھا کہ ایک شخص آج بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے محبت جیسا پاکیزہ جذبہ رکھتا تھا۔ شیشے کے پار، وہ بہت اپنا، اس سے بہت دور جا رہا تھا۔ وہ اپنا، جس کے اعتراف نے آج پھر اس کے محبت سے دھڑکتے دل کو ایک نئی سمت عطا کی تھی۔

درست راستے ہوں یا نئی سمتیں، وہ یا تو قسمت سے ملتی ہیں یا پھر صرف محبت سے۔

اور ارم کو زندگی کی نئی سمت محبت نے عطا کی تھی۔

☆☆☆

ذیشان جو دو دن کا سوچ کر واپس آیا تھا، اب اسے آئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ گل کی حالت پہلے سے بہت بہتر تھی۔ ذیشان کو گل کی حالت کی طرف سے تسلی ہوئی تو اس نے ایس ایچ او اطہر کو فون کر کے کیس میں ہوئی مزید پیش رفت کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی۔

ایس ایچ او اطہر کے مطابق تاحال فرار لڑکے پکڑے نہیں گئے تھے۔ ذیشان کی کئی بار میری جوزف اور اس کے والدین سے بھی فون پر بات ہوئی اور ان کے حالات جان کر ذیشان کو بہت تکلیف ہوئی۔

www.pklibrary.com

میری جوزف کے والدین جو غربت کی چکی میں پس رہے تھے۔انصاف تو انہیں مل نہیں رہا تھا مگر دوسری طرف میری جوزف پر زندگی کے سب دروازے بند ہو گئے۔میری کے والد جوزف کو کرسچن برادری کی طرف سے حمایت حاصل تھی مگر وہ سب مل کر بھی میری جوزف کو انصاف نہیں دلوا پا رہے تھے۔وجہ تھی انصاف کی راہ میں حائل سفارش اور رشوت کے بڑے بڑے پہاڑ جس کو ایک غریب شخص ساری زندگی عبور نہیں کر سکتا۔یہ میڈیا کی ترقی کا ابھی وہ وقت تھا، جب بریکنگ نیوز کی دوڑ شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی اس طرح کے کیسز کو اخبارات اور ٹی وی پر اچھالا جاتا تھا اور نہ ہی لوگ اپنے ساتھ ہوئے ایسے حادثوں پر آواز اٹھانا پسند کرتے تھے۔ان باتوں پر جہاں تک ممکن ہوتا پردہ ڈلا رہتا۔بھلے اس پردے کے پیچھے کئی لوگ مر جاتے۔

ایک رات ارم نے ذیشان کو قید لڑکے کی ضمانت کے بارے میں بتایا۔ساری بات سننے کے بعد ذیشان نے موبائل آف کیا اور سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"یہ سب میری لاپروائی کی وجہ سے ہوا ہے۔مجھے اس درندے کو انجام تک پہنچا کر واپس آنا چاہیے تھا!"

ذیشان نے نفرت سے سوچا۔باقی کی ساری رات اس نے جاگ کر گزاری۔صبح پہلی فلائٹ سے وہاں پہنچا اور سیدھا پولیس اسٹیشن چلا گیا۔

"مسٹر ذیشان حسن! یہ سب قانونی طریقے سے ہوا ہے۔اگر کورٹ کے آرڈر ہیں تو ہم کسی کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔" ایس ایچ او اطہر ملک نے سنجیدگی سے کہا۔

"اور اس کے باقی دونوں ساتھی؟" ذیشان نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو اس کے دونوں ساتھی روپوش ہیں۔ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ انہیں ڈھونڈ لیں مگر اس میں کتنا وقت لگے گا کچھ کہہ نہیں سکتے۔

ویسے ایک بات کہوں؟" اطہر ملک کا لہجہ دھیما تھا۔"آپ بلاوجہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں! اس لڑکے کی پشت پناہی کرنے والے بہت لوگ ہیں۔دولت اور طاقت کے بل بوتے پر وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔سب کچھ خرید سکتے ہیں۔اور خرید بھی رہے ہیں۔آپ اور ہم جیسے لوگ لکیر پیٹتے رہ جائیں گے اور کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔" اطہر ملک نے افسردگی سے کہا۔

"اگر لوگوں کی حفاظت پر مامور پولیس ہی ایسی بات کر رہی ہے تو پھر کوئی انصاف کی کیا توقع رکھے۔" ذیشان نے تلخی سے کہا۔

"آپ سمجھ نہیں رہے۔" اطہر ملک نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔"صرف پولیس کو برا کہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔پورا سسٹم اس میں شامل ہے۔کیا اس تعلیمی ادارے کے افراد اس مظلوم لڑکی کا ساتھ دے رہے ہیں؟ یا وہ اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سنبھالنے کے چکروں میں اس کیس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں؟ کیا اس لڑکی کے مسلم دوست یا اس کی کمیونٹی کے لوگ ساتھ دے رہے ہیں؟ کیا اس لڑکی کے غریب والدین کا منہ بند کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور نہیں لگایا جا رہا؟ چلیں آپ کی بات مان لیتے ہیں اگر اس لڑکی کے مجرم کو سزا مل بھی جائے تو کیا وہ لڑکی معاشرے میں باعزت طریقے سے زندگی گزار سکتی ہے؟ کیا آپ یا میں اسے سکون سے جینے دیں گے! کیا کوئی اس لڑکی کو اپنی عزت بنائے گا؟ کیا اس کی بہنوں کے لیے اچھے گھر کے رشتے آئیں گے۔نہیں ناں..." اطہر ملک نے گہری سانس لی۔"آپ جانتے ہیں یہ سب دیکھتے ہوئے اس لڑکی کے والدین کیا کریں گے؟"

"کیا کریں گے؟" ذیشان نے الجھ کر پوچھا۔

"ان حالات میں اس کے والدین سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے منہ مانگی رقم لیں گے اور چپ چاپ یہ شہر چھوڑ کر کسی نئے شہر میں پھر سے زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں گے۔" اطہر ملک نے حالات کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے کہا تو ذیشان نفی میں سر ہلاتا اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

www.pklibrary.com

"سب یاں جاؤ گے!" اطہر ملک نے سامنے رکھی فائل کھولی تھی۔

اگلے دن جب شام کی فلائٹ سے ذیشان واپس جا رہا تھا تو وہ بہت سے باتوں کو مان چکا تھا۔

معاشرے میں پنپتی بے حسی، غریب والدین کی مجبوری، امیر کی طاقت۔ اطہر ملک نے جو پیشن گوئیاں کیں، سب کچھ بالکل ویسا ہی ہوا تھا۔

ادارے نے اپنی ساکھ کو بچایا۔ میری جوزف اپنے گھر والوں کے ساتھ راتوں رات کہاں چلی گئی کوئی نہیں جانتا تھا۔ جو ضمانت پر رہا ہوا تھا وہ بہت آرام سے یورپ میں مزے کر رہا تھا۔

اگر پیچھے کچھ رہ گیا تو پولیس فائل میں لگا وہ کاغذ جس پر ایف آئی آر لکھی گئی تھی۔ اس دن ذیشان اپنے سسٹم سے بہت مایوس ہوا اور پہلی بار تھوڑا خوف زدہ بھی۔ ارم نے اسے تسلی دی مگر وہ سب مان کر بھی ایک بات نہیں مان رہا تھا کہ "سچ ہمیشہ کے لیے چھپ جائے!" ذیشان نے کال پر ارم سے بات کرتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو ارم! میں سچ کو سورج مانتا ہوں۔ سچ وہ سورج ہے۔ جس کو گرہن تو لگ سکتا ہے ایک مخصوص وقت کے لیے مگر وہ اس گرہن کے پیچھے چھپ نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ جب وقتِ کسوف گزرے گا تو یہ سورج پھر سے پوری آب و تاب کے ساتھ چمکے گا۔ لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے!"

"ان شاء اللہ!" ارم نے خلوص دل سے کہا۔

وقت کی مخصوص رفتار میں کئی سال آئے اور گزر گئے! جو رہ گیا وہ "آج" تھا۔

☆☆☆

"محبت کے مقدر میں
ازل سے تشنگی کیوں ہے؟
بہت ہی مضطرب، آرزدہ اور بے تاب رکھتی ہے!
وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں،
جنہیں سیراب رکھتی ہے
ہمارے واسطے۔
اس کے الگ
جذبات ہیں جاناں
ہماری راہ میں باقی
ابھی فرات ہیں جاناں۔

اس کے لہجے کے اتر چڑھاؤ اور آواز کے سوز نے پورے ہال پر سحر طاری کر دیا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ مسکراتے ہوئے داد سمیٹتے اسٹیج سے نیچے اتری۔

"بزم ادب" کا پروگرام منعقد تھا۔ اس پروگرام میں کالج کی فیکلٹی کے ساتھ ساتھ کالج کا مالک سکندر خان بھی موجود تھا۔

شہری زندگی کی گہما گہمی اور شور شرابے سے دور یہ سرسبز پہاڑی علاقہ روز بہ روز بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ صدیوں سے یہاں آباد تھا۔ سرکاری طور پر یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لیے ویسے تو بہت سے کام کیے گئے تھے۔ جس میں ایک سرکاری ہسپتال، لڑکیوں کے لیے ہائی اسکول اور لڑکوں کا پوسٹ گریجویٹ کالج بھی تھا مگر گورنمنٹ کے قائم تعلیمی اداروں کا معیار اچھا نہیں تھا۔ اس لیے اچھی تعلیم کے لیے طالبہ و طالبات کو دوسرے شہروں کا رخ کرنا پڑتا۔ لڑکوں کے لیے تو یہ پھر بھی آسان تھا مگر علاقے کی لڑکیوں کی لیے میٹرک کے بعد اچھی تعلیم حاصل کرنا ایک خواب تھا۔ اسی خواب کو تعبیر دینے کے لیے سکندر خان جو اس علاقے کی بارسوخ اور مشہور سیاسی شخصیت تھا اس نے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کا اجراء کیا۔

سکندر خان عمر تقریباً پینتس سال مگر سیاسی تجربہ اور ذہانت اپنی عمر سے کئی سال آگے تھا۔ سکندر خان نے اپنے علاقے کی فلاح و بہبود کے لیے بہت کام کیے تھے۔ جن میں سے سب سے بڑی کامیابی ایک عام سے کالج کو تعلیمی سطح پر سب سے آگے لانا تھا۔ ایک سال پہلے گرلز ڈگری کالج کو پوسٹ گریجویٹ کا درجہ ملا تھا۔ پوسٹ گریجویٹ کی کلاسز لڑکوں اور لڑکیوں کی مشترکہ تھیں۔ کالج کا رزلٹ ہر سال بہت

www.pklibrary.com

اچھا آرہا تھا۔

حمرہ کو یہ کالج جوائن کیے تقریباً ایک سال ہو گیا تھا اور اس دوران وہ سب لڑکیوں کی پسندیدہ استاد بن گئی تھی۔ حمرہ کی سادہ شخصیت میں ایک مخصوص ٹھہراؤ اور سنجیدگی تھی۔ وہ نرم مزاج مگر اس کے ارادے چٹانوں کی طرح تھے۔ وہ ایم۔اے انگلش کی ٹیچر تھی۔ تعلیم کے علاوہ اس کی زیادہ توجہ لڑکیوں کی گرومنگ پر تھی۔ وہ لڑکیوں کی شخصیت کو مضبوط بنانے کے طریقے بتاتی۔ انہیں ڈر اور خوف کے بجائے اعتماد سے بات کرنا سکھاتی۔ حمرہ کے نزدیک تعلیم کا تعلق صرف ڈگری لینے کی حد تک نہیں تھا بلکہ اپنی شخصیت کو سنوارنے اور مضبوط بنانے کا نام تھا۔

"بزم ادب" کے پروگرام میں سکندر خان نے حمرہ کو دیکھا تو پہلے کی طرح اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

پہلی بار وہ اس دن حمرہ سے متاثر ہوا تھا، جب حمرہ جاب کے لیے انٹرویو دینے آئی تھی۔ حمرہ کی تعلیم اور ذہانت نے جہاں اسے متاثر کیا تھا، وہاں وہ حیران بھی تھا کہ لاہور جیسے بڑے شہر کو چھوڑ کر دور دراز کے علاقے میں جاب کرنے کیوں آئی ہے؟

اس بات کا جواب انٹرویو میں حمرہ نے یہ دیا کہ اسے چیلنج پسند ہیں۔ اس لیے وہ ایک تجربے کے طور پر یہاں آئی ہے۔ سکندر خان کو حمرہ کی بات کچھ نامکمل سی لگی مگر اس نے نظر انداز کر دیا۔ اس ادارے کو ایک اچھا ٹیچر مل رہا تھا تو اور کیا چاہیے تھا۔

حمرہ کا انداز سب سے جدا تھا۔ اس کی شخصیت باوقار تھی۔ ڈریسنگ سینس کمال۔ مطالعہ کی بے حد شوقین۔ اکثر اپنے شاگردوں کو بھی مختلف کتابیں پڑھنے کو ریفر کرتی اور بعد میں ان پر ڈسکشن کرتی۔ صاف گوئی اس کی پہچان تھی۔ سچ بات کہتے ہوئے کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ یہ سب تو اس کی ذاتی خوبیاں تھیں مگر جس چیز نے سکندر خان کو اس کا نوٹس لینے پر مجبور کیا تھا وہ اس کی بے نیازی تھی۔ حمرہ سکندر خان کو ایسے ڈیل کرتی تھی جیسے کہ دوسرے عام لوگوں کو۔

یعنی کہ سکندر خان شان و شوکت، سیاسی رتبے کو دیکھ کر بھی کسی حوالے سے اس کے متاثرین میں شامل نہیں ہوئی تھی۔

اکثر "متاثر کرنے والوں" کو ایسی "نظر اندازی" بہت متاثر کر جاتی ہے۔ یہی سکندر خان کے ساتھ ہوا تھا۔

آج سکندر خان حمرہ کے لفظوں کے سحر میں مبتلا ہونے سے خود کو نہیں بچا سکا تھا۔ کچھ ایسا تھا حمرہ میں جو اسے عام سے خاص بناتا تھا۔ شاید اس کی ذات کے گرد تنی ہوئی پراسرار کی چادر یا اس کی آنکھوں سے جھانکتی عجیب سے کھوج۔ سکندر خان کو لگتا تھا کہ وہ جتنا اس لڑکی کے بارے میں سوچے گا، اتنا ہی اس کے سحر میں مبتلا ہوتا جائے گا۔ سکندر خان! جو اپنے نام کی طرح مقدر کا بھی سکندر تھا۔ جس کے آگے پیچھے ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی دیوانہ وار چکر لگاتی تھی۔ جو اتنی عمر گزر جانے کے باوجود شادی جیسے بندھن میں بندھنے کے بارے میں سوچتا ہی نہیں تھا۔ مگر وہ حمرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اس کی چھاپ اپنی روح پر محسوس کرتا تھا۔ کچھ ایسا تھا جو مقدر کے سکندر کو حمرہ کی طرف متوجہ کرتا تھا مگر کیا؟ اس سوال کا جواب وہ بہت سنجیدگی سے ڈھونڈ رہا تھا۔

"مجھے شاعری کی بھی سمجھ نہیں آئی۔" ریفرشمنٹ کے دوران جب حمرہ اور سکندر کا سامنا ہوا تو وہ بے ساختہ کہنے لگا۔ حمرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"جب کہ مجھے لگتا ہے کہ شاعری کو سمجھنے سے زیادہ، محسوس کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔" حمرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا میرے جیسے پتھر دل بھی لطیف و نازک شاعری کو محسوس کر سکتے ہیں؟" سکندر کا انداز لاپرواسا تھا۔

"جب تک سانس ہے اور سانس کے زور سے ہر پل دھڑکتا دل سینے میں موجود ہے، تب تک کوئی ذی نفس پتھر نہیں کہلا سکتا۔ ہاں خود کو سمجھ لے تو وہ ایک الگ بات ہے۔" حمرہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ

www.pklibrary.com

کہا۔ سکندر اس کی بات پر غور کرتا رہ گیا۔ اسے خاموش دیکھ کر حمرہ پلٹنے لگی۔

"میں محسوس کرنا چاہتا ہوں!" سکندر کا لہجہ مدھم تھا۔ حمرہ چونک کر پلٹی۔

"آپ کی شاعری، کیا مجھ سے شیئر کریں گی!" سکندر نے اس کے ہاتھ میں پکڑی ڈائری کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ضرور۔" حمرہ نے کہتے ہوئے ایک سادہ کاغذ پر کچھ دیر پہلے پڑھی ہوئی نظم لکھی اور وہ کاغذ تہہ کر کے سکندر کی طرف بڑھا دیا۔ جیسے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سکندر نے تھام لیا تھا۔

"شکریہ!" سکندر نے کہا تو حمرہ سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔ سکندر خان نے وہ کاغذ احتیاط سے تہہ کر کے اپنی قمیص کی اوپر والی جیب میں رکھ لیا۔ اس کاغذ کے عین نیچے، اس کا تیزی سے دھڑکتا دل ایک لمحے کے لیے جیسے تھما تھا۔ پھر پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔

☆☆☆

چوہدری یعقوب تیز تیز چلتا حویلی کے اندر داخل ہوا۔ وہ جہاں جہاں سے گزر رہا تھا، ملازم اسے دیکھ کر کونے کھدروں میں چھپ رہے تھے۔ چوہدری یعقوب اور اس کے بیٹے ولی احمد سے حویلی کے سب ملازم ڈرتے تھے کیونکہ دونوں سخت دل، بے رحم اور تیکھے مزاج کے مالک تھے۔ ملازموں کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کے ساتھ برتاؤ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ اس لیے چوہدری یعقوب کی حویلی میں کوئی بھی خوشی سے کام کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ یہاں کام کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی طرح چوہدری یعقوب کے قرض دار تھے۔ چودھری یعقوب لوگوں کی کمزوریوں سے کھیلنا بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یہ چیز ہی اس نے اپنے اکلوتے بیٹے ولی احمد کو سکھائی تھی۔

"ولی احمد کو بلاؤ۔" چوہدری یعقوب نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے کہا کچھ لمحوں کے بعد نیند سے سرخ آنکھیں رگڑتا ولی احمد اندر داخل ہوا اور باپ کے پاس آ کر سر جھکایا۔ ولی احمد کو دیکھتے ہی چودھری یعقوب کے پتھریلے چہرے پر نرمی کا تاثر ابھرا تھا۔ چوہدری یعقوب نے محبت سے ولی احمد کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"سدا جیو میرے شہزادے!" چودھری یعقوب نے ہمیشہ کی طرح کہا تو ولی احمد باپ کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے مجھے بلایا، کوئی خاص کام ہے؟" ولی احمد نے نروٹھے پن سے کہا۔

"ہاں۔ تمہاری حماقت کی وجہ سے مجھے تمہیں نیند سے اٹھا کر یہاں بلانا پڑا۔" چوہدری یعقوب نے سنجیدگی سے کہا تو ولی احمد نے چونک کر باپ کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"او اچھا۔ تو آپ تک خبر پہنچ گئی!"

ولی احمد نے آرام دہ انداز میں صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے دونوں پاؤں پھیلائے تھے۔

"ولی احمد! ہر بات اور ہر چیز مذاق نہیں ہوتی۔ میرے خیال سے تم نے بہت وقت بچپنے میں گزار لیا ہے۔ اب سنجیدگی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔" چوہدری یعقوب نے اسے سرزنش کی۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اب جوانی دیوانی میں ایسی غلطیاں تو سب ہی کرتے ہیں۔" ولی احمد نے ایک آنکھ دبا کر کہا تو چوہدری یعقوب بھی مسکرانے لگا۔

"دیکھو ولی احمد، پچھلے کئی سالوں سے دوسری سیاسی پارٹی کی پوزیشن، ہم سے بہت مضبوط ہو چکی ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اس علاقے اور سیاست کو پورا وقت دے رہے ہیں۔ جبکہ میں اور تم صرف عیاشی میں پیسہ اڑا رہے ہیں۔ تم اپنے فارم ہاؤس پر کتنی بھی ناچ گانے کی محفلیں سجاؤ میں نے کبھی اعتراض نہیں کیا مگر اب تم احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر علاقے کی لڑکیوں کو سر عام چھیڑ چھاڑ کرو گے تو مسئلہ ہم دونوں کے لیے ہوگا۔ میری بات سمجھ

www.pklibrary.com

رہے ہو ناں !" چوہدری یعقوب نے سختی سے اسے دیکھا۔ ولی احمد ایک دم ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"کیا اس کی کمین نے میری شکایت کی ہے؟" ولی احمد کی آنکھیں نفرت سے جلنے لگی تھیں۔

"ہاں۔ ابھی اس نے اپنے جس جاننے والے سے بات کی ہے، اس نے فوراً ہی خبر ہمارے مخبر کو پہنچائی ہے کہ اگر تم مسلسل اس کی بیٹی کو تنگ کرتے رہے تو وہ پولیس اسٹیشن چلا جائے گا۔" چوہدری یعقوب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

"اس کی اتنی جرأت۔" ولی احمد نے نفرت سے کہا۔

"اسے یہ جرات مخالف پارٹی سے مل رہی ہے۔ تم بات سمجھ کیوں نہیں رہے ہو!" چودھری یعقوب کا سختی سے کہا۔

"اور آپ یہ کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں کہ ولی احمد کا جس پر دل آجائے، وہ اسے حاصل کر کے رہتا ہے۔"

ولی احمد کا انداز دوٹوک تھا۔ چوہدری یعقوب کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے صوفے کی پشت پر اپنا ایک ہاتھ پھیلایا اور کچھ سوچنے لگا۔

"کیا لڑکی بہت سوہنی ہے؟" چودھری یعقوب نے دوستانہ انداز میں پوچھا تو ولی احمد نے سر جھٹکا تھا۔

"نہیں۔ مگر مجھے پسند ہے۔" ولی احمد نے ایسے کہا جیسے کسی چیز کے خریدنے یا نہ خریدنے کے بارے میں بات کر رہا ہو۔

"یعنی صرف دل بہلانا ہے۔" چودھری یعقوب نے بے پروائی سے کہا تو ولی احمد نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"جو کرنا ہے، دھیان سے اور سوچ سمجھ کر کرنا۔ مجھے الیکشن سے پہلے کوئی مسئلہ نہیں چاہیے۔ اور اگر کوئی مسئلہ بننے کی کوشش کرے تو۔" چودھری یعقوب کہتے ہوئے چپ کر گیا۔

"تو اسے راستے سے ہٹا دوں گا۔" ولی احمد نے اطمینان سے کہا تو چودھری یعقوب نے اثبات میں سر ہلا کر جیسے اسے اجازت دی تھی۔

"میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔"

چوہدری یعقوب نے کہا تو ولی احمد نے سر ہلایا تھا۔ اس کا باپ نہ بھی کہتا تو وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ایسا تو تا ہے، جس میں اس کے باپ کی جان بند ہے۔ اس لیے تو وہ باپ کی اندھی محبت کا ناجائز فائدہ بہت آرام سے اٹھالیتا تھا۔

☆☆☆

خوب صورت روایتی انداز میں سجے، حویلی کے بڑے سے ہال نما کمرے میں بیس سال کی حسین لڑکی صوفے پر بیٹھی برے برے منہ بنا رہی تھی

"مجھے نہیں پتا۔ میں نے اپنی سب کلاس فیلوز کو انوائٹ کرنا ہے۔" رمشا نے ضدی انداز میں کہا۔

"اف! رمشا ضد مت کرو! تم بچی نہیں ہو کہ جس کی سالگرہ دھوم دھام سے منائی جائے! میں تو تمہاری شادی کی تاریخ طے کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں اور تم ہو کہ فضول کی ضد لے کر بیٹھ گئی۔ کچھ عقل سے کام لو۔"

رمشا سے آٹھ سال بڑی صباحت نے چار سالہ موحد کو کارپٹ سے اٹھا کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا اور رمشا کو گھور کر دیکھا۔ موحد نے ایک معصوم نظر ماں اور پھر پاس بیٹھی خالہ پر ڈالی اور پھر رینگتا ہوا صوفے سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ صباحت آپی کا دھیان رمشا کی طرف تھا۔

"صبا آپی! آپ میری ہر بات پر اعتراض کرتی ہیں۔ کیا میں آپ کی سوتیلی بہن ہوں؟ رمشا نے ہمیشہ کی طرح دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ صباحت تڑپ اٹھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔ یہ خناس تمہارے دماغ میں کون بھرتا رہتا ہے؟"

صباحت نے نیچے اترتے موحد کو ایک ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے دوبارہ اوپر بٹھایا۔ رمشا موحد کی شکل دیکھ کر اپنی ہنسی نہیں روک سکی۔

"ہماری گڑیا کس بات پر ہنس رہی ہے؟" سکندر نے ہنستی ہوئی رمشا کو دیکھ کر پیار بھرے انداز

www.pklibrary.com

میں پوچھا۔
رمشا اپنی جگہ سے اٹھی اور جلدی سے بھائی کے بازو سے لگ کر اپنی فرمائش دہرانے لگی۔ صباحت نے سر تھام لیا۔ حسب توقع سکندر خان نے رمشا کی فرمائش سنتے ہی نے فوراً ہاں کہہ دیا۔
"ویسے سکندر بھائی! کاش یہ "فوری ہاں" آپ اپنی شادی کے لیے بھی کر دیں۔"
صباحت نے چڑ کر کہا اور نیچے اترتے موحد کو پھر سے تھپڑ لگانے لگی مگر سکندر نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے موحد کو گود میں اٹھا لیا۔
"صبا! تمہارے مظالم بڑھتے ہی جا رہے ہیں! بہت شکایتیں آ رہی ہیں تمہاری۔" سکندر نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ صباحت اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔
"کس نے لگائی میری شکایت۔" صباحت نے حیرت سے پوچھا۔
"پہلی تو تیمور بھائی (بہنوئی) نے، دوسری موحد اور تیسری میں نے!" رمشا نے فخریہ انداز میں کہا تو سکندر اثبات میں سر ہلانے لگا۔
"پھر تو سب جھوٹ ہے۔ بے فکر رہیں آپ سکندر بھائی" صباحت نے لاپروائی سے کہا۔
"وہ تو میں تب مانوں گا جب تم رمشا کی سالگرہ کی تیاری پورے دل سے کرو گی۔" سکندر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ویسے سکندر بھائی! میری شادی تو آپ نے جلدی کر دی تھی مگر اپنی اس لاڈلی کے لیے آپ کے اصول کہاں گئے؟ نہ تو آپ اپنی شادی کی طرف آتے ہیں اور نہ اس چڑیل کی۔ بچی نہیں ہے یہ، اس سال بی۔ اے کے پیپرز دے رہی ہیں محترمہ!" صباحت نے چڑ کر کہا تو سکندر ہنس پڑا۔
"بابا جان اور بے جی نے تمہاری شادی کی تاریخ طے کی تھی۔ وہ تو انہیں زندگی نے مہلت کم دی، نہیں تو وہ تمہیں اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھا کر رخصت کرتے۔"
سکندر کے لہجے میں اداسی گھل گئی۔ نو سال پہلے کا

وہ ٹریفک حادثہ آج بھی ان لوگوں کی روح کھینچ لیتا تھا! جس میں ان لوگوں نے اپنے شفیق والدین کو کھویا تھا۔
"اور آپ نے بغیر کسی کے کہے ہم دونوں کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ ہمارا خیال رکھتے رکھتے خود کو کہیں بھول گئے!" صباحت نے نم لہجے میں کہا۔ رمشا کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔
"پگلی، روتی کیوں ہو؟ یہ آنکھیں رونے کے لیے نہیں ہیں میری گڑیا۔" سکندر نے نرمی سے رمشا کی آنکھیں صاف کی اور صباحت کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ صباحت نے بھی بمشکل خود کو سنبھالا۔
"چلو بھئی، اب ڈن ہو گیا۔ اس ویک اینڈ پر رمشا کی سالگرہ، بہت دھوم دھام سے منائیں گے۔" سکندر نے ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے کہا۔
"میں کالج ٹیچرز کو بھی مدعو کروں گی، خاص کر مس حمرہ کو۔" رمشا نے کہا تو صباحت منہ بنا کر رہ گئی جبکہ سکندر خان کو اپنی جیب میں رکھے کاغذ کا لمس شدت سے طرح محسوس ہوا تھا۔
"مس حمرہ سے تو ملنا ہی پڑے گا۔ تعریفیں سن سن کر میرے تو کان پک گئے ہیں۔" صباحت نے کہا تو سکندر مسکرانے لگا۔
"اور مجھے یقین ہے کہ تمہیں حمرہ سے مل کر مایوسی نہیں ہو گی۔" سکندر نے بے خیالی میں کہا تو صباحت نے چونک کر دیکھا مگر سکندر موحد اور رمشا کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
"اچھا! دیکھتے ہیں۔ جس کی تعریف آپ کریں وہ عام تو ہرگز نہیں ہو گی۔" صباحت کا لہجہ کچھ جتاتا ہوا تھا۔ سکندر خان سمجھ کر ہنس پڑا۔
"بہت تیز ہو تم!" سکندر خان نے اسے سراہا۔
"بہن کس کی ہوں!" صباحت نے بھی فخریہ انداز میں کہا۔
"بہن تو میں بھی ہوں!" موحد کے ساتھ کھیلتی رمشا نے صرف آخری جملے پر غور کیا۔ اس لیے فوراً بولی۔
"ہاں مگر احمق اور ناسمجھ!"

www.pklibrary.com

صباحت نے کہا تو رمشا ناک چڑھا کر رہ گئی۔ سکندر خان جوان دونوں کی نوک جھوک سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اپنے موبائل پر آنے والی کال کی طرف متوجہ ہوا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔

☆☆☆

حمرہ کا قیام کالج سے ملحق ہوسٹل میں تھا جہاں اس کے علاوہ دو ٹیچرز اور کچھ دور دراز کے علاقے کی طالبات بھی مقیم تھیں۔ رمشا نے اپنی سالگرہ کا دعوت نامہ تین دن پہلے دے دیا۔ رمشا بہت پرجوش تھی۔ حمرہ کو بہت اصرار سے مدعو کیا۔ حمرہ جو اسے ٹالنے کے موڈ میں تھی۔ اس کا اصرار دیکھ کر چپ کر گئی اور آنے کی حامی بھرلی۔

سالگرہ والی شام عام دنوں کی طرح حمرہ نے آنکھوں میں کاجل اور ہلکا لپ گلوز لگایا مگر آج اس نے اپنے بال کیچر لگا کر کھلے چھوڑ دیے۔ نیلے رنگ کے خوب صورت سے سوٹ میں ملبوس، کانوں میں بالیاں جس کے درمیان میں سفید نگ لگا ہوا تھا اور گردن میں باریک چین، جس میں ایسا ہی سفید نگ موجود تھا۔ یہ لاکٹ سیٹ اسے بہت عزیز تھا کیونکہ اس کی ماں کی آخری نشانی تھی۔ اس لیے عام روٹین میں بھی وہ اسے پہنے رکھتی۔

حویلی کے وسیع لان میں سالگرہ کی تقریب منعقد تھی۔ صباحت اور رمشا سب کو خوش دلی سے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ جب رمشا نے پرجوش انداز میں حمرہ کا تعارف کروایا تو صباحت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ حمرہ دیکھنے میں خوش شکل لڑکی تھی مگر اس میں ایسی کوئی خاص بات بھی نہیں تھی کہ وہ یہ سوچتی کہ سکندر اس کے حسن کا شکار ہو گیا ہے۔

''شاید یہ میرا وہم ہو!'' صباحت کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہوئی اور وہ سر جھٹک کر مہمانوں کی تواضع میں لگ گئی۔

''آیئے آپ کو اپنا کمرا دکھاتی ہوں۔'' رمشا نے مسکراتے ہوئے حمرہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے دوسری منزل پر اپنے خوب صورت سجے ہوئے کمرے میں لے گئی۔

''واؤ! آرٹسٹک چوائس ہے تمہاری۔'' حمرہ نے کمرے کی سجاوٹ کو سراہا۔ پھر ریک میں لگی کتابوں کو دیکھ کر پوچھا۔

''تمہیں کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے؟''

''ہاں بہت زیادہ۔ اس میں سے زیادہ کتابیں سکندر بھائی نے تحفے میں دی ہیں اور باقی......'' رمشا کہتے ہوئے ایک دم سرخ پڑ گئی۔ حمرہ چونکی۔

''تمہارے منگیتر نے؟ کیا نام ہے اس کا؟'' حمرہ نے مسکرا کر پوچھا۔

''علی۔'' رمشا نے شرماتے ہوئے کہا۔ حمرہ نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

''بہت خوب صورت ہے اس کی محبت۔'' حمرہ نے بے ساختہ اعتراف کیا۔ رمشا ہنس پڑی۔

''چلیں۔ صباحت آپی ہمیں ڈھونڈ رہی ہوں گی۔'' رمشا نے کہا تو حمرہ بھی سر ہلاتے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''او میں اپنا موبائل کمرے میں بھول آئی۔ آپ چلیں مس حمرہ، میں آتی ہوں۔''

سیڑھیوں کے پاس آ کر کچھ یاد آنے پر رمشا واپس مڑی گئی۔

حمرہ سر ہلاتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ اچانک ہی چونک کر رک گئی اور بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ہی تھکا ہارا سکندر خان کھڑا تھا۔ وہ شاید کسی دور کے سفر سے واپس گھر لوٹا تھا۔ حمرہ کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے تھکے ہوئے چہرے پر ایک روشن مسکراہٹ ابھری۔ سیڑھیاں چڑھنے کے بجائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔ حمرہ منتظر کھڑی تھی کہ وہ یہاں سے گزر جائے۔ تو وہ آگے بڑھے۔

حمرہ نے پیچھے مڑ کر رمشا کو دیکھنا چاہا اور پھر سر گھما کر سامنے دیکھا۔ سکندر خان بہت اطمینان سے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر، ایک پیر دوسرے پیر کے پیچھے کر کے سیڑھی سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ حمرہ غائب دماغی کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سکندر خان اس کے دیکھنے کو دیکھنے لگا۔

www.pklibrary.com

"وہ مجھے دیکھتا رہے اور میں
دیکھنا ، دیکھتا رہوں اُس کا
سکندر خان کے دل نے پھر سے ایک تمنا کی مگر وقت کی قید میں صرف چند لمحے ہی اس کے حصے میں آئے تھے۔ کہیں آس پاس ہلچل ہوئی، کچھ بے پروا آوازوں کا شور اور چند کھلکھلاتی ہوئی ہنسی گونجی تو سکندر خان نے گہری سانس لی اور سامنے کھڑی حمرہ کو دیکھا۔ غائب دماغی سے دیکھتی حمرہ چونکی۔ سکندر خان نے ایک ہاتھ اٹھا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔

"جائیں پلیز! میں نے آپ کا راستہ تو نہیں روکا!" سکندر نے سنجیدگی سے کہا تو حمرہ شرمندہ ہو کر سر ہلاتی تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ہاں، راستہ تو نہیں روکا آپ نے۔" حمرہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے خود کلامی کی۔

"مگر روک بھی سکتا ہوں۔"

سکندر کی دھیمی آواز پر حمرہ کے قدم آہستہ ضرور ہوئے مگر رکے نہیں تھے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ سکندر خان نے ایک ہلکی سے خوشبو کو محسوس کیا تھا۔

"بھائی! آپ کب آئے؟" رمشا نے سیڑھیاں اترتے ہوئے سکندر کو دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے۔ تمہاری برتھ ڈے پارٹی ابھی تک چل رہی ہے؟" سکندر خان نے شرارت سے پوچھا۔

"سکندر بھائی! صباحت آپی کافی ہیں اس کام کے لیے۔ آپ تو اب اعتراض مت کریں۔"

رمشا نے منہ بنا کر کہا تو سکندر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

☆☆☆

سکندر خان اپنے کمرے میں اپنی مخصوص پسندیدہ جگہ راکنگ چیئر پر آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا۔ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ شیر دل نے کمرے میں داخل ہو کر سلام کیا۔ سکندر خان نے آنکھیں کھول کر شیر دل کی طرف دیکھا۔ سکندر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ شیر دل آگے بڑھا اور سعادت مندی سے سکندر کے کندھے دبانے لگا۔

"شیر دل! مخالف پارٹی کی سازشیں اپنے عروج پر ہیں۔ بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" سکندر خان کی آواز سنجیدہ تھی۔

"بے فکر رہیں مالک۔" شیر دل نے سعادت مندی سے کہا۔

"فکر تو ہے، چوہدری یعقوب احمد جو ہے سو ہے مگر اس کا بیٹا ولی احمد اپنے باپ سے بھی چند ہاتھ آگے ہے، ولی احمد کی شہرت ٹھیک نہیں ہے......" سکندر خان نے سنجیدگی سے کہا۔ "شیر دل۔ دشمن اخلاق اور کردار والا ہو تو اس سے دشمنی کرنے میں بھی مزا آتا ہے مگر اخلاق اور کردار سے گرے ہوئے لوگ میری برداشت سے باہر ہیں۔" سکندر خان اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں چکر کاٹنے لگا تھا۔

"مالک! آپ پریشان کیوں ہیں؟ چوہدری یعقوب احمد تو پچھلے کئی سالوں سے آپ کے مخالف ہیں۔ خاص کر الیکشن کے دنوں میں تو ان سازشیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔" شیر دل نے کہا تو سکندر خان رک گیا۔

"یہی بات ہے، الیکشن قریب ہیں اور اس بار چودھری یعقوب احمد کے بجائے اس کا بیٹا کھڑا ہو رہا ہے اور وہ شخص کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔ اس لیے اپنی طرف سے پوری طرح چوکنا رہنا۔" سکندر خان نے ہدایت نامہ جاری کیا تو شیر دل نے جلدی سے سر ہلایا۔ سکندر خان مطمئن ہو کر آگے کا لائحہ عمل طے کرنے لگا۔

☆☆☆

میٹنگ روم میں سکندر خان کے ساتھ کالج کا اسٹاف موجود تھا۔ پرنسپل خورشید بانو نے اجازت طلب نظروں سے سکندر خان کی طرف دیکھا۔ سکندر خان نے سر ہلایا تو خورشید بانو نے مسکرا کر سب کی طرف دیکھا اور گلا کھنکار کر بولیں۔

"آج ہمارے کالج کے لیے ایک اور اعزاز کا دن ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں پورے صوبے میں ہمارے کالج کے ذہین اور ہونہار طالب علم منصور اقبال نے ٹاپ کر کے نہ صرف اپنے والدین کا بلکہ اس کالج کا نام بھی روشن کیا ہے۔"

www.pklibrary.com

سب نے پرجوش انداز میں تالیاں بجائی۔

"یہ سب آپ لوگوں کی محنت اور خلوص نیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے کالج کا رزلٹ بہت شان دار رہا ہے۔ اس خوشی میں کالج کے اونر سر سکندر خان نے ایک اعلان کیا ہے کہ اس سال سے ٹاپ کرنے والے طالب علم کو اسکالرشپ پر پڑھنے کے لیے لندن بھیجیں گے۔"

میڈم رخشندہ بانو کے اعلان نے ہر طرف حیرت اور خوشی پھیلا دی۔ سب داد و تحسین کے ٹوکرے برسانے لگے۔ سکندر خان کی گردن مزید اکڑ گئی۔

"یہ تو بہت اچھا اقدام ہے۔ اس طرح طالب علموں کا حوصلہ بڑھے گا اور وہ زیادہ محنت کریں گے۔ مگر کیا یہ آفر لڑکیوں کے لیے بھی ہے؟" حمرہ نے بے ساختہ کہا تو سکندر خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"لازمی سی بات ہے۔ لڑکیاں بھی ہمارے ادارے کا اہم حصہ ہیں اور ویسے بھی ہم کامیاب ہونے والے طالب علم کی بات کر رہے ہیں۔ چاہے وہ لڑکی ہو یا لڑکا۔ ترقی کے مواقع دونوں کو حاصل ہوں گے۔"

سکندر خان نے روکھے لہجے میں وضاحت کی تو حمرہ سر ہلانے لگی۔ سکندر خان کو حمرہ کا یہ سوال بہت برا لگا۔

"خود کو کچھ زیادہ ہی قابل سمجھتی ہیں محترمہ!" سکندر خان نے حمرہ کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر سوچا۔

"چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" حمرہ نے آہستگی سے کہا۔

میٹنگ برخاست ہوئی تو سب ٹیچرز باتیں کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلنے لگیں

"آپ کو میرا سوال برا لگا؟" حمرہ نے باہر نکلتے سکندر خان سے براہ راست پوچھا تو وہ اس کے اعتماد پر حیران رہ گیا۔

"کیا نہیں لگنا چاہیے تھا؟" سکندر خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ کیونکہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو آگے بڑھنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔" حمرہ اپنی بات پر قائم تھی۔

"میں اپنی زبان کا پکا ہوں۔" سکندر خان نے سختی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

"میں یہ ہی دیکھنا چاہوں گی۔" حمرہ کی ٹھہری ہوئی آواز سکندر خان نے اپنی پشت پر سنی مگر مڑے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"مرد کو چیلنج کرتی ہوئی عورت کبھی اچھی نہیں لگتی ہے۔ ہاں مگر اس کی ضد ضرور بن جاتی ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تم میری ضد بنو مس حمرہ!" واپسی کے سفر میں سکندر خان نے چڑ کر سوچا تھا۔

☆☆☆

"دیکھو رمشا! تم اب لاڈ پیار کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہی ہو۔ بی۔ اے تک پڑھ تو لیا ہے۔ اب تمہارا رزلٹ جو بھی آئے۔ اس سے کسی کو فرق نہیں پڑتا۔ تم اچھی لڑکیوں کی طرح شادی کی تیاریاں کرو بس۔" صباحت نے سختی سے کہا۔

"مگر صبا آپی! مس حمرہ بہت پر امید ہیں کہ اس بار میں ٹاپ کروں گی اور میں آسانی سے اسکالر شپ پر پڑھنے باہر جا سکتی ہوں۔"

رمشا نے ضدی انداز میں کہا۔

"اسکالر شپ کے بغیر بھی میں تمہیں پڑھنے کے لیے دنیا کی کسی یونیورسٹی میں بھیج سکتا ہوں رمشا۔ مگر تمہاری منگنی بچپن سے علی سے طے ہے اور تائی جان اور تایا جان مسلسل شادی پر زور دے رہے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم دوسروں کو اپنا حمایتی بنانے کے بجائے بڑوں کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

سکندر کی بھاری اور سخت آواز نے رمشا کی ساری ضد کو ایک لمحے میں ختم کر دیا۔ اس نے ڈر کر فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ وہ جانتی تھی کہ سکندر خان اگر ایک بار فیصلہ کر لیتا تو پھر وہ بحث سننا پسند نہیں کرتا تھا۔

"جی۔" رمشا نے بے دلی سے کہا اور صوفے سے اٹھ گئی۔ وہ تینوں لاؤنج میں موجود تھے۔

"رمشا یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔" چہیتی اور لاڈلی بہن کے چہرے پر اداس دیکھ کر سکندر خان کے

www.pklibrary.com

دل کو کچھ ہوا۔ صباحت خاموشی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ رمشا سکندر خان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔

"رمشا گڑیا! تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تمہارا بھائی تنگ ذہن کا مالک نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں اپنے شہر میں کبھی بھی لڑکیوں کی اعلا تعلیم کے لیے کالج نہیں بنواتا۔ میں خود چاہتا ہوں کہ ہر عورت تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو۔ میں تمہاری تعلیم کے خلاف نہیں ہوں مگر ہمارے خاندان کی کچھ روایتیں ہیں۔ جن کی بھاری ذمہ داری اب میرے کندھوں پر ہے۔ صباحت اپنے گھر میں خوش ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ رخصت کر کے اپنے مرے ہوئے والدین کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔ میری نیت پر شک مت کرنا گڑیا۔" سکندر نے کہتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ اس کے سر پر رکھا تو رمشا نم آنکھوں کے ساتھ اس کے کندھے سے لگ گئی۔

"سکندر بھائی! مجھے آپ کی محبت پر ناز ہے۔" رمشا نے کہا تو صباحت نے بھی دوپٹے کے کونے سے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی۔

"میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔" رمشا نے اس کی تھکاوٹ کو پیش نظر دیکھ کر جلدی سے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔

"رمشا بہت معصوم ہے۔" صباحت نے محبت سے کہا۔

"ہاں مگر اس کے آس پاس کے لوگ بہت سمجھ دار ہیں۔" سکندر خان نے پرسوچ انداز میں کہا موحد کے پکارنے پر صباحت اٹھ کر چلی گئی۔

"تو اس دن تمہاری بحث کرنے کے پیچھے یہ مقصد تھا مس حمرہ۔" سکندر خان نے لب بھینچ لیے تھے۔ حمرہ کے لیے اس کے دل میں غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

بی۔اے کا رزلٹ اناؤنس ہوا تو حمرہ کی پیشن گوئی کے مطابق رمشا نے ٹاپ کیا تھا۔ رمشا اتنی بڑی کامیابی پر پھولے نہیں سما رہی تھی۔ سکندر خان کے لیے بھی یہ بہت فخر کا لمحہ تھا۔ پورے خاندان میں دھوم مچ گئی۔ حمرہ بہت خوش تھی۔ رمشا سے اس کا تعلق استاد اور شاگرد سے کچھ زیادہ بن گیا تھا۔ وہ رمشا کے لیے خاص طور پر گفٹس اور اس کی پسند کا کیک لے کر حویلی گئی۔ رمشا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ صباحت بھی پرتپاک انداز میں ملی۔ البتہ وہاں ہی موجود سکندر خان کا رویہ بہت سرد تھا۔ حمرہ کو محسوس ہوا کہ اسے دیکھتے ہی سکندر خان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ حمرہ نے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا مگر جب رمشا نے حمرہ کو اپنے کمرے میں لے جانا چاہا تو سکندر خان نے فوراً روک دیا۔

"رمشا! تمہارے اور بھی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ انہیں چھوڑ کر اس طرح الگ تھلگ بیٹھ جانا اچھی بات نہیں ہے۔"

سکندر خان نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نظریں جمائے ہوئے کہا تو حمرہ کو کچھ عجیب سے محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ سب سے مل کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی حویلی سے باہر نکل رہی تھی۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئی تھی جب کالی لینڈ کروزر اس کے پاس آکر رکی۔ حمرہ چونکی اور رک کر گردن موڑ کر دیکھا۔ شیشہ نیچے ہوا۔ سکندر خان کو دیکھ کر حمرہ چونکی۔ اس کے چہرے کے تاثرات پتھریلے تھے۔

"رمشا آپ کو ایک بات بتانا تو بھول ہی گئی مس حمرہ!" سکندر خان کی سرد آواز پر حمرہ کا چہرہ بھی تن گیا۔ "بہت جلد رمشا کی شادی ہو رہی ہے۔ ویسے تو آپ نے بہت کوشش کی کہ رمشا بھی عورتوں کے حقوق کے نام پر آپ جیسی آزاد زندگی گزارے مگر وہ کیا ہے کہ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ روایات سے جڑے ہوئے۔ ہم جتنا بھی پڑھ لکھ جائیں، اپنی زمین کو نہیں چھوڑتے ہیں۔ شادی میں خاص مہمان ہوں گی آپ۔ آنا ضرور۔" سکندر خان نے کہا اور شیشہ اوپر ہونے لگا۔ سکندر خان اور حمرہ کے درمیان کالے شیشے کی دیوار آ گئی تھی۔ گاڑی تیزی سے آگے

www.pklibrary.com

بڑھ گئی۔

حمرہ نے گہری سانس لے کر خود کو نارمل کیا۔ وہ جانتی تھی کہ زندگی کی راہ میں چلتے ہوئے ایسے ویسے بہت سے تلخ رویوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ زندگی ہمارے لیے ماں کی گود نہیں ہوتی، جو ہر لمحے راحت پہنچائے! زندگی باپ کے حوصلے کی طرح بلند اور سخت ہوتی ہے، جو جلاتی ہے، تڑپاتی ہے، آزماتی ہے مگر پھر تراش کر انمول بھی بنا دیتی ہے۔ کئی سال پہلے ملا یہ سبق حمرہ کو کبھی نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

کافی دنوں سے مصروف سکندر خان کو فرصت ملی تو وہ کچھ ضروری کام نمٹانے کالج چلا گیا۔ پرنسپل رخشندہ بانو نے کالج کو درپیش چند مسائل کی طرف نشان دہی کروائی تو سکندر خان نے جلد ہی ان کو حل کرنے کا وعدہ کیا۔

"ہاں ایک بات بتانا تو میں بھول ہی گئی......" رخشندہ بانو نے کچھ یاد آنے پر کہا۔ "مس حمرہ ریزائن دینا چاہ رہی ہیں۔"

"مگر کیوں؟ تعلیمی سیشن کے درمیان میں وہ کیسے چھوڑ کر جا سکتی ہیں؟" سکندر خان نے جلدی سے کہا۔

"وہ یہ سیشن مکمل کروا کر ہی جائیں گی۔ انہوں نے پہلے مطلع کر دیا ہے۔ ہمیں بہت جلد نئی لیکچرار کے لیے ایڈ دینا ہوگا۔"

"کیا میں مس حمرہ سے مل سکتا ہوں؟" سکندر خان نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ضرور۔ اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے؟ وہ لائبریری میں ہوں گی۔ میں انہیں بلاتی ہوں۔" رخشندہ بانو نے کہتے ہوئے ریسور اٹھایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ لائبریری راستے میں ہی ہے، میں جاتے ہوئے مل لوں گا۔" سکندر خان نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا اور باہر نکل گیا۔

سکندر خان لائبریری میں داخل ہوا تو ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اس کو دیکھ کر لائبریرین فوراً اپنی جگہ سے اٹھا۔ سکندر خان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے مس حمرہ کے بارے میں پوچھا۔ لائبریرین نے ایک طرف اشارہ کیا تو سکندر خان بڑے بڑے قدم اٹھاتا اس طرف بڑھ گیا۔ حمرہ میز پر کتاب کھولے، ایک ہاتھ چہرے کے نیچے رکھے، بہت مگن انداز میں پڑھ رہی تھی۔ اسے سکندر خان کی آمد کے بارے میں پتا نہیں چلا۔ سکندر خان چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا اور پھر اس سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سکندر خان کے کلون کی اجنبی خوشبو پر حمرہ چونکی اور سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی حیرت اور چہرے سے جھلکتی معصومیت سکندر خان کو بالکل بچوں جیسی لگی۔

"کاش!" سکندر خان نے دل نے دہائی دی۔

حمرہ فوراً سیدھی ہوئی اور کتاب بند کی۔ اور اپنا بیگ اٹھا کر کرسی سے اٹھنے لگی۔

"میں آپ سے بات کر سکتا ہوں!" سکندر خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جب بنا اجازت لیے، اتنی باتیں سنا سکتے ہیں تو اب پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" حمرہ نے ٹھنڈے لہجے میں چوٹ کی تو سکندر خان بے ساختہ مسکرانے لگا۔

"مجھے اندازہ ہے کہ اس دن میں کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گیا۔ مجھے لگا کہ......" سکندر خان کہنے لگا۔

"آپ جیسے خاندانی لوگوں کو لگتا تھا کہ میرے جیسے عام لوگ آپ کے گھر کی بہن بیٹیوں کو راہ سے بھٹکا کر اعلا مفاد حاصل کر لیں گے۔" حمرہ نے لفظ چبا چبا کر ادا کیے۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ سکندر خان نے دلچسپی سے اس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھا۔

"میں سن رہا ہوں۔" حمرہ کے چپ ہونے پر وہ بولا۔

"اور میں نے جو کہنا تھا، کہہ دیا ہے۔" حمرہ نے قطعی انداز میں کہا۔

"اچھی بات ہے۔ آپ جاب کیوں چھوڑ رہی ہیں۔" سکندر خان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

www.pklibrary.com

"میری مرضی۔" حمرہ نے سر جھٹک کر کہا۔

"دیکھیے محترمہ! مرضی مرضی کا کھیل مت کھیلیں۔ مشکل میں پڑ جائیں گی۔" سکندر خان نے اطمینان سے کہا۔ حمرہ نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کیا چاہتے ہیں آپ؟" حمرہ نے گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کرتے ہوئے سوال کیا۔

"چاہت پوچھ رہی ہیں؟" سکندر خان نے اپنی گہری کالی آنکھوں کو اس پر مرکوز کرتے ہوئے سوال پوچھا۔

"نہیں۔ آپ کی مرضی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" حمرہ نے جھنجلا کر کہا۔

"دونوں ایک ہی ہیں۔ میری چاہت اور میری مرضی۔" سکندر خان نے اطمینان سے کہا۔

"اور وہ کیا ہے؟" حمرہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"فی الحال تو یہ کہ آپ اس ادارے کو چھوڑ کر مت جائیں۔ یہاں کے بچوں کو آپ جیسے قابل استاد کی سخت ضرورت ہے!" سکندر خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں فیصلہ کر چکی ہوں۔ جہاں آپ کے خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے، وہاں کام کرنا مشکل ہوتا ہے۔" حمرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے سمجھنے میں غلطی ہوئی۔" سکندر خان نے آگے ہوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

"اور میرے خیال سے غلطی ہو جائے تو کچھ کہتے بھی ہیں۔"

حمرہ نے سادگی سے پوچھا۔ سکندر خان کچھ دیر تک اس کے سادہ سے چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر مسکرا اٹھا۔

"آئی ایم سوری ٹیچر صاحبہ، کیا معافی مل سکتی ہے؟" سکندر خان کا انداز شرارتی تھا۔ حمرہ زیر لب مسکرادی۔

"معاف کیا۔" حمرہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"سکندر خان نے آج تک کسی اجنبی سے اس طرح معافی نہیں مانگی اور اگر آج مانگی ہے تو وہ فرد اب اجنبی نہیں رہا۔"

سکندر خان کی آواز حمرہ نے سنی ضرور مگر ان سنی کرنے کے لیے۔ وہ وہاں سے چلی گئی۔

سکندر خان نے میز پر رکھی کتاب کو دیکھا۔ جو وہ لے جانا بھول گئی تھی۔ سکندر خان نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھالی۔

"عشق کے چالیس اصول" (ایلف شفق)"

سکندر خان نے ٹائٹل پڑھا اور مسکراتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

☆☆☆

کالج کی گرلز کے ٹرپ کے لیے ایک بہت خوب صورت جھیل کا انتخاب ہوا تھا جس کے آس پاس کا علاقہ قدرتی خوب صورتی سے مالا مال تھا۔ گولائی میں بنی قدرتی جھیل کے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف پہاڑی سلسلہ تھا۔ جھیل سے کچھ فاصلے پر مقامی ریسٹ ہاؤس تھا۔ جہاں سارا سال سیاحوں کا رش لگا رہتا۔ اس دن اتفاق سے سکندر خان ایک میٹنگ کے سلسلے میں ریسٹ ہاؤس میں موجود تھا۔ ساتھ ہی وہ مسلسل کالج اسٹاف سے رابطے میں تھا لڑکیوں کی حفاظت کے لیے گارڈز پر مشتمل چند افراد کا عملہ بھی ان کے ساتھ تھا۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ سب لوگ ہدایات کے مطابق گروپس میں تقسیم ہو گئے۔ مسز فرح اور مس ندرت سب سپروائز کر رہی تھیں۔

کھانا خوش گوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ ہوا میں خنکی کے ساتھ تیزی بھی آگئی تھی۔ گرما گرم چائے کی طلب سب کو ہو رہی تھی۔ اس لیے فوراً چائے بنانے کا اہتمام کیا گیا۔ وہ سب گرما گرم چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

"مس حمرہ! کافی دنوں سے آپ کے اعلا شاعری ذوق کا ذائقہ بھی کانوں نے نہیں چکھا؟ کیا خیال ہے۔ مس سعیدہ نے چائے پیتے ہوئے اچانک کہا تو سب نے تالیاں بجا کر ہاں میں ہاں ملائی۔ حمرہ نے مسکرا کر دائرے کی شکل میں بیٹھیں پر اشتیاق لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

www.pklibrary.com

"بنجر تھی زمین دل کی اور روح پر گھاؤ تھے
دیکھا تیری جانب جب آنکھوں میں الاؤ تھے
جل تھل جو اگر کر دو، تن من میں کمی بھر دو
ہے خشک بہت مٹی، پوری جو کمی کر دو
پھر تم کو بتائیں گے تم روح میں پنہاں ہو
پر تم سے کہیں کیسے، تم ابر گریزاں ہو!

ٹھنڈی اور تیز ہوا کے شریر جھونکوں سے اس کا سبز دوپٹا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ سر پر اسکارف تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے جذب کے عالم میں پڑھ رہی تھی۔ ایونٹ انچارج مسز فرح سے بات کرتے ہوئے سکندر خان نے سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا تھا۔ ہوا کے دوش پر اس کی آواز رقص کرتی، اسی وادی کا کوئی گم نام حصہ لگ رہی تھی۔ قدرت کی طرح بے حد کشش رکھنے والی اور قدرت کی طرح ہی پراسرار تھی اس کی آواز۔

حمرہ نے تالیوں کی آواز پر آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ لڑکیاں اور اس کی کولیگز "ونس مور" کے نعرے لگا رہی تھیں۔ ہنستے ہوئی حمرہ کی نظر ہجوم پر سے ہوتی ہوئی کچھ دور کھڑے سکندر خان پر پڑی۔ جس کا رخ اس کی طرف ہی تھا اور مسز فرح کی پشت نظر آ رہی تھی۔ سکندر خان کی آنکھوں پر کالا چشمہ تھا، اس لیے حمرہ کو اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ ان کی طرف دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ حمرہ سر جھٹک کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"مسز فرح! موسم کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔ کوشش کریں کہ جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جائیں!"

سکندر خان نے آسمان پر چھائے گھنے بادلوں کی طرف دیکھ کر کہا تو مسز فرح کے ساتھ کھڑی مس ندرت نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ سکندر خان نے چند اور ضروری باتیں کی اور وہاں سے چلا گیا۔

مسز ندرت اور مس فرح نے سب کو اکٹھا کیا اور پھر جلدی جلدی چیزیں سمیٹنے کا حکم دیا۔ اس وقت اچانک ہی ہوا کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ آندھی ایک دم سے آئی تھی۔ گھنے بادلوں نے ہر طرف گھپ اندھیرا کر دیا۔ ہوا کے زور سے ہر طرف پتے اڑنے لگے۔ حمرہ اپنی کولیگز کے ساتھ مل کر سب لڑکیوں کو بحفاظت بس تک پہنچا رہی تھی۔ بادلوں کی گرج چمک میں اضافہ ہو گیا۔ لڑکیاں آتے ہوئے جتنی پرجوش اور خوش تھیں اب سروں پر اچھی طرح دوپٹا لپیٹے دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ تیزی سے بس کی طرف بھاگتی حمرہ نے کچھ دور سفید آنچل لہراتا دیکھا تو چونک کر رک گئی۔

"رمشا!" حمرہ کو لگا کہ تیز آندھی کی وجہ سے رمشا کو راستہ نہیں مل رہا ہے۔ حمرہ آوازیں دیتی ہوئی تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

آدھے راستے میں پہنچ سکندر نے لب بھینچ کر خراب موسم کی طرف دیکھا۔ اس نے فون ملایا مگر خراب سگنلز کی وجہ سے کال نہیں مل رہی تھی۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور سکیورٹی گارڈ کو کال ملائی تو اس نے بتایا کہ کالج کی بس وہاں سے نکل گئی ہے تو پھر اس نے وہیں رک کر بس کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ کچھ دیر کے بعد بس کی لائٹس جلتی بجھتی نظر آئیں۔ شیر دل نے بس ڈرائیور کو اشارہ کیا کہ وہ آگے چلے مگر بس آگے چلنے کے بجائے رک گئی۔ سکندر خان نے چونک کر دیکھا۔ بس کا دروازہ کھلا اور روتی ہوئی رمشا گاڑی کی طرف بھاگی۔ سکندر خان نے تیزی سے دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ رمشا بھائی سے لپٹ گئی۔

"کیا ہوا گڑیا؟ ڈر گئی ہو؟ فکر مت کرو۔ میں ہوں تمہارے پاس۔" سکندر خان جانتا تھا کہ رمشا کا دل بہت کمزور ہے۔

"سکندر بھائی! مس حمرہ ہم سے بچھڑ گئی ہیں۔"

رمشا نے روتے ہوئے کہا۔ سکندر خان چونکا۔ مسز فرح کے ساتھ دوسرا اسٹاف بھی پریشان چہرے لیے بس سے اتر کر شیڈ کے نیچے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"مسز فرح، رمشا کیا کہہ رہی ہے؟ مس حمرہ کہاں ہے؟" سکندر خان نے غصے سے پوچھا۔

"سر! ہمیں خود پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں رہ گئیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہی سب بچیوں کو بس میں بٹھا رہی تھیں۔ افراتفری اور تیز آندھی کی وجہ سے

www.pklibrary.com

ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ مس حمرہ بس میں نہیں ہیں۔ وہ تو کچھ آگے آ کر رمشا نے اچانک ان کی کمی محسوس کر کے شور ڈال دیا مگر ہم بس کو واپس کیسے موڑتے۔ آپ کو مسلسل فون کر رہے تھے مگر سگنلز ڈراپ تھے۔" مسز فرح نے پریشانی سے کہا۔

"حد ہے اتنی لاپروائی، آپ کو چیک کرنا چاہیے تھا کہ سب لوگ بس میں موجود ہیں یا نہیں......" سکندر خان غصے سے دھاڑا۔ "آپ جانتی ہیں کہ وہ جگہ کتنی خطرناک ہے؟ موسم خراب ہونا تو ایک الگ بات ہے مگر وہاں ہر طرح کے جنگلی درندے بھی موجود ہیں اور اگر ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا تو۔" سکندر خان کو بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ یہ ذمہ داری اس پر عائد تھی کہ سب لوگ بحفاظت گھروں تک پہنچائے۔

"سکندر بھائی اب کیا ہوگا؟" رمشا نے روتے ہوئے پوچھا۔

"پریشان مت ہو گڑیا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" سکندر خان نے کہتے ہوئے کالج اسٹاف کی طرف دیکھا۔

"آندھی کا زور کم ہوا ہے۔ آپ سب شہر کی طرف جائیں اور سب بچیوں کو بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچائیں۔ ہم مس حمرہ کے پیچھے جا رہے ہیں۔ جاؤ رمشا۔" سکندر خان نے کہا تو رمشا نے نفی میں سر ہلایا۔

"سکندر بھائی! میں آپ کے ساتھ جاؤں گی پلیز، منع مت کریں۔"

رمشا نے منت کی تو سکندر خان کچھ کہتے کہتے رک گیا اور اثبات میں سر ہلانے لگا۔ سب بس میں بیٹھ گئے تو سکندر خان نے اپنے ساتھ موجود سیکورٹی گارڈ کی گاڑی کو بھی بس کے ساتھ بھیج دیا اور خود شیر دل اور رمشا کے ساتھ واپس چلا گیا۔

☆☆☆

"رمشا کو۔" آنکھوں میں اڑ کر پڑتے ذرے حمرہ کچھ بھی دیکھنے نہیں دے رہے تھے۔ وہ بمشکل آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گھنے بادلوں کی وجہ سے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ حمرہ ٹھٹک کر رک گئی۔ رمشا کی مدد کرنے کے خیال میں وہ بھول گئی کہ اسے اندھیرے اور آندھی سے بہت ڈر لگتا ہے، وہ جو روشنی میں اپنے اندر کے ڈر کو چھپائے رہتی تھی، ایک دم ہی اس کا ڈر دل سے نکل کر ایک خوف ناک عفریت کی شکل میں تبدیل ہو کر چاروں طرف پھیل گیا۔ حمرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ جنگل کے پاس پہنچ گئی۔ آندھی کا زور کم ہوا مگر تیز ہوا ابھی بھی چل رہی تھی۔ حمرہ کو لگا کہ جنگل میں سرسراہٹ ہوئی ہے۔ حمرہ کا دل کانپنے لگا مگر وہ کھڑی رہی۔ اس نے پھر سفید آنچل کو لہراتے دیکھا۔ اب کی بار اس لڑکی کا سائیڈ پوز نظر آیا۔ وہ بری طرح چونکی۔ وہ اس لڑکی سے واقف تھی۔ کہیں دیکھا ہوا تھا یہ چہرہ!

"یہ اگر رمشا نہیں ہے تو کون ہے؟" حمرہ نے حیرت سے سوچا۔ بادل زور سے گرجا۔ بجلی نے چمک کر ساتھ دیا۔ اچانک تیز موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ موسلا دھار بارش کے برسنے سے شیشے کی ایک دیوار بن گئی۔ شیشے کی دیوار کے ایک طرف گم صم حمرہ کھڑی تھی اور شیشے کی دیوار کے دوسری طرف سفید لباس میں ملبوس وہ لڑکی۔ جس کا مانوس چہرہ حمرہ کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس لڑکی نے بے بسی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ بہت تکلیف اور اذیت میں تھی۔ حمرہ کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

"گل!" حمرہ کے لب کپکپائے اور وہ سسک کر رو پڑی۔ حمرہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا دوسری طرف سے اس لڑکی نے بھی۔ حمرہ اس کا ہاتھ تھام کر تسلی دینا چاہتی تھی، اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتی تھی مگر۔

☆☆☆

"گل!"

ذیشان حسن بے ساختہ چلایا اور ہڑبڑا کر سیدھا ہوا۔ راکنگ چیئر پر جھولتے نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ پچھلی تین راتوں سے آنکھ موند کے کب دیکھی تھی اس نے۔ ذیشان اور افشاں کے دعا مانگتے لب خشک ہو گئے مگر آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں

www.pklibrary.com

کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ لوگ بظاہر زندہ ہوتے ہیں مگر ان کے اندر زندگی نہیں ہوتی ہے! زندگی ایسے چھپ جاتی ہے جیسے رات کے اندھیرے روشنی کو نگل لیں۔ اور روشنی کی واپسی کے لیے ایک لمبی اور طویل رات کاٹنی پڑتی ہے۔ تب اندھیرے کے بطن سے نئی صبح، نئی روشنی جنم لیتی ہے مگر اکثر آزمائش کی کالی رات کو کاٹنے والے اپنا سب کچھ گنوا دیتے ہیں۔ پھر آنے والی صبح کتنی بھی روشن ہو، انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ ایسا ہی ذیشان اور افشاں کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ رات کٹ بھی گئی تب بھی روشنی اب ان کا مقدر نہیں بنے گی۔

افشاں جو جائے نماز پر گم صم بیٹھی تھی۔ ذیشان نے کندھوں پر ڈالی چادر سے اپنا پسینے سے تر چہرہ صاف کیا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا۔ اپنے سینے کو مسلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ عجیب سے گھبراہٹ تھی جو دل کو مسل رہی تھی۔

"میری بیٹی! میری گل، بہت تکلیف میں ہے۔ ربا میں کیا کروں۔" ذیشان نے دروازے کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر سرد اور ویران رات میں باہر جھانکا۔ ہلکی پھیلی دھند میں گلی میں جلتی روشنیاں بہت مدھم تھیں۔ "کیا فاروق ملک کو کال کروں؟" ذیشان نے خاموش پڑے موبائل کی طرف دیکھا۔ فاروق ملک پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اس مشکل وقت میں ان کی یقین دہانی بھی ذیشان کے دل سکون نہیں پہنچا رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ ڈی ایس پی فاروق ملک اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے گل کو ڈھونڈنے کی پوری کوشش کر رہا تھا مگر قسمت ان کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"اس قسمت نے ہی تو دھوکا دیا ہے۔" اس نے آزردگی سے سوچا اور مڑ کر لاؤنج میں رکھی لکڑی کی بڑی سی کرسی پر آتش دان کے بجھتے ہوئے شعلوں کے پاس بیٹھ گیا۔ یہ جگہ گل اور اس کی پسندیدہ تھی۔ گل کا معصوم بچپن، لڑکپن، نوجوانی کے کتنے ہی خوب صورت لمحے اس جگہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ گل چھوٹی تھی تو شام کو جب ذیشان چائے پینے کے لیے اس کرسی پر آ کر بیٹھ جاتا تو گل بھی سب کچھ چھوڑ کر باپ کے پاس آ جاتی۔ اپنی توتلی اور میٹھی زبان میں سارے دن کی روداد سناتی۔ ذیشان کا یہ فرض تھا کہ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا جائے نہیں تو گل کو لگتا تھا کہ اس کی بات بابا جان نہیں سن رہے ہیں۔

لڑکپن کی دہلیز پر پہنچی تو اپنے سب خواب، خواہشیں اسی جگہ بیٹھ کر باپ سے ڈسکس کرتی۔ جوانی کی بہار اتری تو اس کی شخصیت کی معصومیت اور پاکیزگی دیکھنے والوں کے دل موہ لیتی تھی۔ وہ مستقبل کے لیے بہت پرعزم تھی، اس کی آنکھوں میں ہزاروں رنگ کے خواب سجے تھے۔ وہ اپنے چھوٹے سے گھر کی شہزادی تھی۔ باپ کی شفقت اور محبت کے سائے میں پروان چڑھنے والی گل کو لگتا تھا کہ ساری دنیا اتنی ہی معطر اور خوب صورت ہے۔ اپنے والدین کے زیر سایہ پرورش پانے والی گل، اپنے نام کی طرح ہی تر و تازہ پھول تھی۔

گل کی خواہش تھی ڈاکٹر بننے کی۔ وہ بہت جنونی تھی۔ وہ ڈاکٹر بننے کے لیے شروع سے بہت محنت کر رہی تھی۔ ایف ایس سی کا رزلٹ اس کی توقع کے مطابق بہت شان دار رہا۔ ذیشان کو یاد ہے ابھی کچھ دن پہلے کی بات ہے، جب وہ اپنا رزلٹ دیکھ کر خوشی سے چیختی ان کے پاس آئی تھی۔ اس نے نم آنکھوں کے ساتھ گلے سے لگایا تھا۔ گل کی آنکھوں سے جڑا ہر خواب اسے بہت عزیز تھا۔

ہلکی سی چاپ پر ذیشان نے چونک کر سر اٹھایا۔ بلی کھلے ہوئے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور کارنس پر رکھا ایک کارڈ اٹھا لیا۔ نفاست سے بنے کارڈ پر نرمی سے انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے کارڈ کھولا۔ یہ کارڈ ذیشان کو بہت عزیز تھا۔ گل نے اپنے ہاتھوں سے بنا کر انہیں "فادرز ڈے" پر دیا تھا۔ کارڈ پر "بہترین باپ" لکھا تھا اور اندر ایک

www.pklibrary.com

خوب صورت نظم جو ایک عہد کی طرح اس کے دل سے بندھی ہوئی تھی۔

"مجھے اتنا پیار نہ دو بابا!
کل جتنا مجھے نصیب نہ ہو!
یہ جو ماتھا چوما کرتے ہو
کل اس پر شکن عجیب نہ ہو
میں جب بھی روتی ہوں بابا
تم آنسو پونچھا کرتے ہو
تم ماتھا چوما کرتے ہو
مجھے اتنی دور نہ چھوڑ آنا
میں روؤں اور تم پاس نہ ہو
میرے ناز اٹھاتے ہو بابا
میرے لاڈ اٹھاتے ہو بابا
میری چھوٹی چھوٹی خواہش پر
تم جان لٹاتے ہو بابا
کل ایسا نہ ہو کہ ایک نگری میں
میں تنہا تم کو یاد کروں
اور رو رو کر فریاد کروں
اے اللہ! میرے بابا سا
کوئی پیار جتانے والا ہو!
میرے لاڈ اٹھانے والا ہو!
مجھے اتنا پیار نہ دو بابا!

"یہ نظم کہاں سے ملی؟" اس نے حیرت سے سوال کیا۔

"بابا جان! ایک میگزین سے ملی مگر جب پڑھی تو ایسا لگا جیسے یہ میرے بابا کے لیے لکھی ہے۔ اچھی ہے نا۔" گل نے معصومیت سے پوچھا تو وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی گل نہیں دیکھ سکی۔ اس لمحے ذیشان نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی گل کی حفاظت کرے گا اور کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دے گا۔

"میں ناکام ہو گیا میری بچی۔ میں اپنا عہد نہیں نبھا سکا، میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکا۔ میں اچھا باپ نہیں ہوں مجھے معاف کر دو۔" ذیشان نے روتے ہوئے سر جھکا لیا۔

رات کا آخری پہر تھا۔ اچانک ایک تیز رفتار گاڑی کے ٹائروں نے ان کے گھر کے سامنے بریک لگائی، دھم کی آواز آئی، تیز ہارن بجا اور پھر گاڑی کے پہیوں کے چرچرانے کے آواز سناٹے میں ابھری تھی۔ ذیشان نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

☆☆☆

سکندر نے رمشا کو گاڑی میں ہی بیٹھے رہنے کو کہا اور شیر دل کے ساتھ گاڑی لاک کر کے چلا گیا۔

سکندر خان اور شیر دل الگ الگ سمت میں حمرہ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ بارش بہت تیز تھی۔ اونچے نیچے راستوں پر قدم جما کر چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ جنگل کی طرف جاتا ہوا سکندر خان چونک گیا۔ کچھ دور سبز آنچل لہرایا تو اسے کچھ دیر پہلے حمرہ کا لہراتا ہوا آنچل یاد آ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ کچھ آگے جا کر اسے نسوانی وجود نظر آنے لگا۔ سکندر خان نے سکھ کی سانس لی۔ وہ حمرہ ہی تھی مگر وہ یک ٹک جنگل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے کوئی بت ہو۔ سکندر خان نے اسے آواز دی جو بارش کے شور میں دب گئی۔ وہ آگے بڑھا۔ اسی وقت ہی حمرہ نے ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر سکندر خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ حمرہ ایک دم ہی خوف زدہ ہو کر چیخنے لگی۔

"مس حمرہ!" سکندر خان نے پریشانی سے پکارا مگر حمرہ دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے چیخ رہی تھی اور پھر سکندر خان کے دیکھتے دیکھتے ہی ایک دم ہی نیچے گر کے بے ہوش ہو گئی۔ شور کی آواز پر شیر دل بھی وہاں آ گیا۔

"مالک! لگتا ہے کہ یہ گھنے جنگل سے ڈر گئی ہیں۔" شیر دل نے کہا تو سکندر خان نے سر ہلا کر بے ہوش پڑی حمرہ کی طرف دیکھا۔

"اگر ان کی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنی پڑے گی۔" سکندر خان نے پریشان ہو کر بے ہوش حمرہ کی طرف دیکھا۔

شیر دل نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ گاڑی کی

www.pklibrary.com

طرف واپس چل پڑے۔ گاڑی کی پچھلے سیٹ پر حمرہ کو بمشکل لٹا کر وہ لوگ ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆

''آرام سے بتاؤ، کل رات کیا ہوا تھا؟''

ڈی ایس پی فاروق ملک نے نرمی سے ذیشان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ وہ دونوں اس وقت ہسپتال کے کوریڈور میں موجود تھے۔ ذیشان کے زرد چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور ہونٹ مسلسل کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ بولنے کی کوشش کرتا مگر لفظ منہ سے نکلنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے۔ وہ کسی کو کیا بتاتا؟ رات کے آخری پہر کوئی ان کی نازو پلی، پھول جیسی بیٹی کو مخدوش حالت میں گھر کے دروازے پر کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک گیا تھا؟ وہ کسی کو کیا بتاتا کہ بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر وہ نہ زندوں میں رہا تھا اور نہ مردوں میں۔ وہ کسی کو کیا بتاتا کہ بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر ان کی بیوی اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ اسے مسلسل دورے پڑ رہے تھے۔ افشاں چیخیں مارتی ہوئی گل کو ڈھونڈنے کے لیے یہاں سے وہاں بھاگنے لگتی۔ ڈاکٹرز اسے بے ہوشی کے انجکشن لگا رہے تھے مگر آخر کب تک؟ جب بھی ہوش میں آئے گی وہ اپنی بیٹی کی حالت کو دیکھ کر کیا دوبارہ ہوش میں رہ سکے گی۔

ڈی ایس پی فاروق ملک کے ساتھ ان کی ٹیم بھی موجود تھی۔ جو رسمی کارروائی میں مصروف تھی۔ مجرم کون تھے؟ یہ جاننے کے لیے انہیں گل سے تفتیش کرنی تھی مگر گل کو ابھی ہوش نہیں آیا تھا۔

''حوصلہ رکھو ذیشان، یہ آزمائش بہت بڑی ہے۔''

فاروق ملک نے ہمدردی سے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

رات کا اندھیرا روشنی میں بدل گیا مگر ان کی زندگی میں آنے والا اندھیرا ہمیشہ کے لیے ٹھہر گیا۔ بارہ گھنٹے کے بعد گل کو ہوش آیا مگر ہوش میں آتے ہی وہ بابا جان پکارتے ہوئے پھر بے ہوش ہو گئی۔ میڈیکل رپورٹ پولیس کو مل چکی تھی۔ گل کے ساتھ گینگ ریپ ہوا تھا۔ گل کے ساتھ ظلم اور بربریت کی انتہا ہو گئی۔ گل کی حالت سنبھلنے میں تقریباً پندرہ دن لگے۔ ہوش میں آنے کے بعد پہلی بار جب اس نے باپ کو دیکھا تو چیخیں مار مار کر روئی تھی۔ ذیشان کے لیے اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا۔ نرس نے نیند کا انجکشن لگایا مگر ہوش میں آنے کے بعد وہ جب بھی ذیشان کو دیکھتی اسی طرح روتی بلکتی۔ ذیشان نے بمشکل اسے سنبھالا اور پھر جو چپ لگی تھی، وہ اتنے دنوں میں بھی ٹوٹی نہیں تھی۔ اس کے زخم مندمل ہونے میں وقت لگتا تھا۔ ذیشان اس کے آس پاس رہتا۔ گل نے اب تک پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا تھا مگر بابا جان کے مسلسل سمجھانے پر وہ پولیس کو بیان دینے پر رضامند ہو گئی۔

☆☆☆

اس دن کالج میں پارٹی تھی جس میں گل کے سارے دوست شریک تھے۔ ذیشان نے کسی ضروری کام سے شہر سے باہر جانا تھا اس نے کہا کہ وہ گل کو واپس پک کرے گا۔

گل اپنی دوست آسیہ کے ساتھ کالج چلی گئی تھی۔ آسیہ اور وہ جب کالج پہنچیں تو کالج میں بہت گہما گہمی تھی۔ ایک لڑکی نے گل کے پاس آ کر کہا کہ اسے باہر کوئی بلا رہا ہے۔ وہ سمجھی کہ شاید بابا جان وقت سے پہلے اسے لینے آ گئے ہیں وہ آسیہ کو بتا کر پارکنگ ایریا کی طرف چلی آئی۔ پارکنگ ایریا میں کوئی نہیں تھا گل مڑنے لگی تھی جب کسی نے اس کی ناک پر رومال رکھا تھا۔

گل کو ہوش آیا تو وہ ایک بڑے سے لاؤنج میں موجود صوفے پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے یہاں کون لایا تھا۔

وہ روتی ہوئی بابا کو پکارتی لاؤنج کے دوسرے کونے کی طرف گئی کہ اچانک دیوار پر لگے آئینے میں اسے ایک شخص نظر آیا۔ گل نے ڈرتے ڈرتے آہستگی سے پلٹی۔ سرخ آنکھوں میں بڑھی شیو، قمیص کے کھلے بٹنوں کے ساتھ وہ نفرت بھری نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

www.pklibrary.com

"کون ہو تم اور مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"
گل نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔
وہ شخص آگے بڑھا۔ گل ڈر کر پیچھے ہٹی۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے گل کا رنر میز سے لگ گئی۔ وہ شخص لڑکھڑاتا ہوا چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ گل خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کو یاد آیا کہ پہلا تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ اچانک اس شخص کا ہاتھ اٹھا اور گل کے نازک رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔ تھپڑ اتنا شدید تھا کہ گل پوری گھومی اور کرسٹل کے ڈیکوریشن پیس سے ٹکرا کر نیچے گر گئی۔ ڈیکوریشن پیس کئی ٹکڑوں میں میں تقسیم ہو گیا۔ گل کو اپنے گال پر شدید جلن اور تکلیف کا احساس ہوا، اپنے ہونٹوں پر خون کا ذائقہ محسوس کر کے گل نے وہاں ہاتھ رکھا تو اس کی انگلیاں خون سے رنگین ہو گئیں۔ خوف زدہ گل کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

گل نے سر اٹھا کر سامنے کھڑے شخص کی طرف دیکھا۔ وہ آگے بڑھا اور جھک کر اس کے گھنے بالوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ گل تکلیف سے بلبلا اٹھی۔ اس شخص کی آنکھوں اور چہرے کی وحشت اور دیوانگی نے گل کی رگ رگ میں خوف و دہشت کے پنجے گاڑ دیے تھے۔ وہ بے اختیار خوف سے چلانے لگی۔

"بابا جان...... مما جانا!"

"چلاؤ جتنا چلا سکتی ہو! تمہیں تکلیف اور اذیت میں دیکھ کر مجھے بہت تسکین مل رہی ہے۔ بالکل اسی طرح میں بھی چلایا تھا۔ تمہارے باپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتا رہا تھا مگر اس شخص نے مجھ پر رحم نہیں کیا تو میں تم پر کیسے رحم کروں گا؟" وہ شخص نفرت سے بولا۔

"تمہاری اس حالت کو دیکھ کر جب تمہارا باپ زندہ قبر میں اترے گا یہ دیکھ کر مجھے جتنی خوشی اور راحت ملے گی تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

وہ شخص پاگلوں کی طرح قہقہے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ اس نے بے رحمی سے گل کا بازو پکڑ کر کھینچا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ اور پاؤں ٹوٹے ہوئے کانچ کے ٹکڑوں پر رگڑنے لگے۔

وہ شخص اسی طرح گل کو گھسیٹتا ہوا اوپر بنے کمرے میں لے کر آیا۔ کمرے کا دروازہ کھول کر گل کو دھکا دیا۔ وہ منہ کے بل گر گئی۔ خوف سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں موجود صوفے پر دو لوگ اور بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ گل کی طرف حریص نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ گل کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر سامنے کھڑے شخص نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔ اس نے گل کو اٹھا کر بیڈ پر ایسے پھینکا جیسے وہ جیتی جاگتی لڑکی نہیں بلکہ کوئی بے جان چیز تھی۔ گل کا سر سائیڈ میز کے کونے سے لگا۔ تکلیف سے گل بے دم ہو گئی۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ گل نے ادھ کھلی آنکھوں سے سامنے کی طرف دیکھا۔ اس کے حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ بے ہوش ہونے سے پہلے گل نے اس شخص کو اپنے پاس آتے دیکھا تھا۔ گل دہشت سے چلائی۔

"بابا جان!"

☆☆☆

ریسٹ ہاؤس میں بہت رش تھا۔ بمشکل انہیں صرف ایک کمرا خالی ملا۔ بے ہوش حمرہ کو کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ کچھ دیر میں ہی ریسٹ ہاؤس کے چوکیدار دلاور کی بیوی سکینہ اور پندرہ سالہ بیٹی بھی آ گئی۔ اکیلی رمشا کے لیے حمرہ کی دیکھ بھال کرنا آسان نہیں تھا۔ سکینہ اپنے ساتھ ایک جوڑا بھی لائی تھی۔ حمرہ کو بارش میں بھیگنے کی وجہ سے بخار ہو گیا۔ سکینہ نے حمرہ کے کپڑے تبدیل کیے۔ کچھ دیر کے بعد حمرہ کو ہوش آیا تو سکینہ نے اسے گرم چائے اور ابلے ہوئے انڈے پیش کیے۔ حمرہ چائے پیتے ہی دوبارہ سو گئی۔ اس کی آنکھ صبح کے وقت کھلی۔ تب وہ پوری طرح اپنے حواسوں میں تھی۔ اسے آہستہ آہستہ کر کے سب یاد آنے لگا۔ حمرہ نے اپنے ساتھ سوئی ہوئی رمشا کی طرف دیکھا۔ جو حمرہ سے ایسے لپٹی ہوئی تھی جیسی چھوٹی سی بچی ہو۔ حمرہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر آہستگی سے بستر سے نیچے اتری۔ سکینہ اس کے کپڑے استری کر کے رکھ گئی تھی

www.pklibrary.com

۔حمرہ نے لباس تبدیل کیا اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ویٹنگ روم کے صوفے پر سکندر خان صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی ریسٹ ہاؤس میں زیادہ چھل پہل نہیں تھی۔ حمرہ کو شرمندگی ہونے لگی کہ اس کی وجہ سے سکندر خان نے ساری رات یہاں بیٹھ کر گزار دی۔ سکندر خان کی آنکھ کھلی اور اس نے سیدھا ہو کر سامنے کی طرف دیکھا۔ حمرہ کو دیکھتے ہی چونک گیا۔ سکندر خان کی سرخ ہوتی آنکھیں حمرہ پر مرکوز تھیں۔ حمرہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس کے پاس آگئی سکندر نے نظریں جھکالیں۔

"میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی!" حمرہ کی ٹھہری ہوئی آواز پر سکندر خان نے سر اٹھا کر دیکھا۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" سکندر خان نے موضوع بدل دیا۔

"الحمدللہ!" حمرہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

سکندر خان کو اس کا انداز اچھا لگا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے پاس آکر اپنے کندھوں پر رکھی چادر اتار کر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

"اور میں نہیں چاہتا کہ ایک اور رات مجھے اس صوفے پر بیٹھ کر گزارنی پڑے اس لیے اپنا خیال رکھیں۔" سکندر خان نے مسکراتے ہوئے کہا اور حمرہ کو وہاں چھوڑ کر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ فریش ہو کر واپس آیا تو اس کے ساتھ چہکتی ہوئی رمشا بھی تھی۔ گرما گرم ناشتے سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ وہاں سے نکلے۔ واپسی کے راستے میں رمشا مسلسل بولتی رہی اور حمرہ مسکرا کر اس کی باتوں کے جواب دیتی رہی۔ رمشا کی وجہ سے شہر پہنچنے تک سکندر خان حمرہ کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا!

☆☆☆

اس واقعہ کے بعد سے حمرہ اور سکندر خان کے درمیان تکلف اور بدگمانی کی دیواریں گر گئیں اور دوستی جیسے سادہ مگر گہرے جذبے نے جگہ بنانا شروع کر دی۔

ان دنوں کالج میں اسپورٹس ڈے کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ سکندر خان کو جہاں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ حمرہ بیڈمنٹن بہت اچھا کھیلتی ہے، وہاں حمرہ بھی سکندر خان کو فٹ بال ٹیم کے ساتھ پریکٹس کرتے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی۔ سکندر خان بوائز ٹیم کو بہت اچھا گائیڈ کرتا تھا۔ کھیل کے میدان دونوں کالج ونگز کے مشترکہ تھے۔ ایک طرف بوائز ونگ اور دوسری طرف گرلز ونگ تھا۔ درمیان میں کھیل کے بڑے بڑے میدان تھے۔ ان دنوں کالج میں ہونے والی گہما گہمی میں اساتذہ بھی اپنے شاگردوں کے ساتھ شامل تھے۔ اسپورٹس ڈے کا آغاز جتنا شاندار تھا اس کا اختتام بہت زبردست طریقے سے ہوا۔

آخری روز اساتذہ کی ٹیم جس میں سکندر خان بھی شامل تھا اور کالج بوائز کے درمیان فٹ بال کا بہت شاندار مقابلہ منعقد ہوا۔ رمشا کا ووٹ اپنے بھائی کی طرف تھا اور حمرہ کا اپنے شاگردوں کی طرف۔ بالآخر مقابلہ سکندر خان کی ٹیم جیتی۔ رمشا نے خوشی سے اچھل اچھل کر داد دی۔ حمرہ نے بھی مسکرا کر تالیاں بجائی۔

"اچھا کھیلے آپ لوگ۔ مگر میرے اسٹوڈنٹ سے کچھ کم۔"

حمرہ نے مسکراتے ہوئے سکندر خان کو مبارک باد دی۔ پسینے سے تر اس اور پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ سکندر خان نے چونک کر حمرہ کی طرف دیکھا۔

"کیا، آپ دوسری ٹیم کی طرف تھیں۔" سکندر خان نے حیرت سے پوچھا تو حمرہ نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

"پہلے بتا دیتیں۔ میں ایسے ہی آپ کو امپریس کرنے کی کوشش میں ٹین ایجر والی حرکتیں کر رہا تھا۔" سکندر خان کے شرارت سے کہنے پر حمرہ چونکی۔

"جی؟" حمرہ نے حیرت سے استفسار کیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ سکندر خان سنجیدہ ہے یا مذاق کر رہا ہے۔

"جی ہاں!"

www.pklibrary.com

سکندر خان نے اس کی آنکھوں میں ایک نئے جذبے سے جھانکا تو حمرہ لرز اٹھی۔ اس کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتی چند قدم پیچھے ہٹی۔ اس سے پہلے کہ سمندر خان کھل کر اپنے جذبوں کا اظہار کرتا۔ رمشا تیزی سے آگے بڑھی۔

''واؤ بھائی! بہت زبردست کھیلا آپ نے۔''

رمشا نے ہمیشہ کی طرح جذباتی انداز میں کہا۔

سکندر خان نے ایک نظر دوسری طرف دیکھتی حمرہ پر ڈالی۔ اس وقت کچھ اور لوگ بھی سکندر خان کے پاس آگئے۔ سکندر خان ان سے مل کر فارغ ہوا تو حمرہ کی تلاش میں نظریں گھمانے لگا مگر حمرہ وہاں سے جا چکی تھی۔ سکندر خان سر جھٹک کر رمشا سے باتیں کرتا آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

''گل سے ساری تفصیل سننے کے بعد تو یہ لگ رہا ہے کہ کسی نے ذاتی دشمنی کی بنیاد پر ایسا کیا ہے۔ ذیشان کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمہارا کوئی دشمن ایسا ہے جو اس حد تک جا سکے؟''

ڈی۔ ایس پی فاروق ملک نے پوچھا تو ذیشان نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ذیشان کی نگاہوں کے سامنے کئی سال پہلے میری جوزف کے ساتھ ہوا حادثہ گھومنے لگا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

''کئی سال پہلے میں جسے ماضی سمجھ کر بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ وہ شخص بدلہ لینے مجھ تک پہنچ جائے گا۔'' ذیشان نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ سب کچھ سوچی سمجھی سازش ہے۔''

فاروق ملک نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ ذیشان سر جھکائے بیٹھے رہا۔

''میں جانتا ہوں ذیشان۔ ابھی بہت مشکل وقت ہے۔ ایک طرف تمہاری بیوی ذہنی مریض بن گئی ہیں اور دوسرے طرف بیٹی ہے۔ جسے اس وقت تمہارے ساتھ کی بہت ضرورت ہے۔'' فاروق ملک نے ہمدردی سے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر گہری سانس لی۔ ''ہم اس شخص کو ٹریس کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے ہی کوئی خبر ملے گی میں فوراً انفارم کر دوں گا۔''

ذیشان خاموش نگاہوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹے سے شہر میں جہاں ان کے نام اور شرافت کا ڈنکا بجتا تھا، اب وہاں گل کے ساتھ ہونے والے حادثے کی گونج سنائی دیتی تھی۔ لوگ افسوس کرتے، ہمدردی کرتے، ترس کھاتے، طنزیہ باتیں، عجیب نظریں جو ان کے گھر کی طرف اٹھتی تو پلٹنا بھول جاتی۔ گل کے جسم پر جو گھاؤ تھے، وہ شاید وقت کے ساتھ بھر جاتے مگر وہ اپنی روح پر لگے زخموں کا کیا کرتی۔ گل کی نگاہوں کے آگے ان کے چہرے گھومتے رہتے۔

☆☆☆

فون سے باہر آتے وحشی قہقہے ذیشان کو جلتے الاؤ میں دھکیل گئے۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس بھیڑیے کے ساتھ کیا کرے۔

''دیکھا۔ میرا انتقام!'' پوچھنے والے نے طنزیہ انداز میں سوال کیا۔

''تم قانون کے ہاتھوں سے بچ گے نہیں!'' ذیشان نے چلا کر کہا۔

''ہاں کوشش کر لو۔ اس بار تو تین راتوں کے بعد بیٹی کی شکل دیکھنے کو مل گئی تھی، اگلی بار ہو سکتا ہے کہ کبھی نہ دیکھ سکو، فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' سرد لہجے میں واضح دھمکی تھی۔

ذیشان لرز کر رہ گیا۔ کتنی ہی دیر وہ بند فون کو پکڑے کھڑا رہا۔ وہ گزرتے وقت کے ساتھ کتنا کمزور ہو گیا ہے اس کا اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔ گل جو پہلے ہی نہیں سنبھلی تھی۔ وہ اپنے ساتھ دوبارہ ظلم کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ ذیشان سوچتا گیا اور الجھتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فاروق ملک کی طرف سے پوری مدد کرنے کی یقین دہانی کروائی گئی تھی مگر ذیشان اپنے ملک کے قانون سے بہت اچھی

www.pklibrary.com

طرح واقف تھا۔ ذیشان اسی الجھن میں گرفتار تھا جب ایک دن گل نے انتہائی قدم اٹھالیا۔

گل کی ذہنی حالت بہت ابتر تھی کہ ایک دن اسی حالت میں اس نے اپنے ہاتھ کی رگیں کاٹ لیں۔ بروقت ملنے والی طبی امداد سے اس کی زندگی بچ گئی مگر ہر بار ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس رات ذیشان نے ایک فیصلہ کیا اور کچھ دنوں کے بعد اپنے گھر کو اونے پونے بیچ کر بیوی اور بیٹی کو لے کر یہ چھوٹا مگر محبوب شہر چھوڑ کر چلا گیا۔

☆☆☆

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔''

''مجھے بھی اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ اولاد سے محبت انسان کو کتنا کمزور بنا دیتی ہے۔'' ذیشان نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور سامنے بیٹھی ڈاکٹر ارم کی طرف دیکھا۔

''گل کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جاتی تم تو پھر اس کے باپ ہو۔'' ڈاکٹر ارم نے گہری سانس لے کر کہا۔

''ارم! اس مشکل وقت میں تمہارا ساتھ کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اگر تم نہیں ہوتیں تو میں اپنی بیمار بیوی اور گھائل بیٹی کو لے کر کہاں جاتا۔'' ذیشان نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ کئی سال پہلے میں نے اپنا ہسپتال بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ کامیاب رہا۔ الحمد اللہ آج یہ ہسپتال شہر کے بہترین ہسپتالوں میں سے ایک ہے۔'' ڈاکٹر ارم نے انکساری سے کہا۔

ذیشان کی بیوی افشاں اسی ہسپتال کے ذہنی وارڈ میں داخل تھی۔ گل کا قیام ڈاکٹر ارم کے گھر تھا۔ اس کی حالت میں تھوڑی بہتری آئی تھی مگر پھر بھی ابھی اسے بہت وقت لگنا تھا سنبھلنے میں۔ ذیشان نے ایک گھر کا بندوبست کر لیا تھا جسے آج کل وہ سیٹ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر ارم کا مزید احسان نہیں لینا چاہتا تھا مگر گل کی حالت ایسی نہیں تھی کہ ذیشان اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔

''تمہیں اپنے مجرموں کو سزا دلوانی چاہیے تھی۔ تمہیں یہ مقدمہ لڑنا چاہیے تھا۔ اس طرح سب چھوڑ کر آنے سے ان لوگوں کو ہی فائدہ ہوگا۔''

ڈاکٹر ارم نے سنجیدگی سے کہا۔

''ایسا ہی سوچا تھا کہ ان لوگوں کو کڑی سے کڑی سزا دلواں گا مگر ارم......'' ذیشان نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے پیغام بھجوایا تھا کہ اگر میں نے اپنا منہ بند نہیں رکھا تو وہ میری بیٹی کو ہمیشہ کے لیے غائب کر دیں گے۔ ارم، میں ڈر گیا ہوں۔ میں بوڑھا اور کمزور شخص، ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔ میں رشتوں کی بساط پر سب ہار چکا ہوں ارم۔ میں اپنی عدالت کا مجرم ہوں۔ اپنی بیٹی کا، جس کی حفاظت میں نہیں کر سکا۔''

ذیشان نے مایوسی سے کہا۔

''ذیشان! اس طرح سوچو گے تو بہت جلد تم بھی بیمار پڑ جاؤ گے۔ تم خود کو الزام دینا چھوڑ دو۔ والدین کبھی اپنی اولاد کا برا نہیں سوچ سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر ارم نے نرمی سے سمجھایا۔

''تم نہیں سمجھو گی ارم......'' ذیشان نے سر جھٹک کر کہا۔ ''گل کی خاموشی، اس کی حالت دیکھ کر میں جس اذیت سے دوچار ہوتا ہوں۔ اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ گل کا تڑپنا، اس کا رونا، چیخنا ایک دن میرا دل بند کر دے گا۔ میں کیا کروں ارم۔''

ذیشان نے بے بسی سے سر میز پر رکھ لیا۔

ڈاکٹر ارم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ذیشان جیسے مضبوط اور شان دار شخص کو قسمت کے ہاتھوں اس طرح ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھنا، ارم کے لیے بہت مشکل تھا۔

☆☆☆

گھریلو تقریب میں رمشا کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی۔ شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی تیاریوں کا آغاز ہو گیا۔ رمشا نے ضد کی کہ وہ اپنی شادی کی

www.pklibrary.com

ساری شاپنگ لاہور شہر سے کرے گی۔ صباحت نے تو اس بات کی مخالفت کی مگر سکندر خان اپنی بہن کی ہر خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے رمشا کو بخوشی اجازت دے دی۔ رمشا شاپنگ کے لیے لاہور جا رہی تھی اور اسے لاہور کے بارے میں زیادہ پتا نہیں تھا۔ اس نے حمرہ سے اپنے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے ساتھ چلنے پر اصرار کیا تو حمرہ مان گئی۔

ویک اینڈ آیا تو رمشا اور حمرہ کے ساتھ شیر دل لاہور گیا۔ سکندر خان کو شیر دل پر بہت بھروسا تھا۔ سکندر خان اور صباحت حویلی کے لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ساتھ ساتھ شادی کی تیاریوں کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"سچ پوچھو تو مجھے رمشا کا کسی سے اتنا فری ہونا بالکل پسند نہیں ہے۔" صباحت کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"تم حمرہ کی بات کر رہی ہو؟" سکندر خان نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔" صباحت نے جلدی سے کہا۔

"مگر حمرہ بہت اچھی اور سمجھدار لڑکی ہے۔" سکندر خان کے لہجے میں احترام تھا۔

"ہوں! اچھے تو بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔ پھر آپ دونوں اس کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہیں؟" صباحت کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"اس لیے کہ میں حمرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

سکندر خان نے اطمینان سے کہا تو صباحت کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ سکندر خان اتنے آرام سے اپنے دل کی بات بتا دے گا۔

"کیا؟" صباحت نے حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں۔ مجھے حمرہ اپنی اچھی عادتوں اور مضبوط کردار کی وجہ سے بہت پسند ہے! میں چاہتا ہوں کہ رمشا کی شادی سے فارغ ہوتے ہی خاندان کے بڑے رشتہ لے کر حمرہ کے گھر جائیں۔"

سکندر خان نے سنجیدگی سے کہا تو صباحت کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ سکندر خان اپنی مرضی کا مالک تھا۔ وہ سکندر خان کے سامنے مزید حمرہ کی برائی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے خاموشی سے سر ہلانے لگی۔

"حمرہ سے بہتر آپشن بھی موجود ہیں۔" صباحت نے سرسری انداز میں کہا۔

"حمرہ میرے لیے آپشن نہیں، محبت ہے!" سکندر خان کی بات نے صباحت کو لاجواب کر دیا تھا۔

☆☆☆

"کیا ڈھونڈ رہی ہو؟"

گل کافی دیر سے الماری میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔

ڈاکٹر ارم کی آواز سن کر گل کا رنگ اڑ گیا اس نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"وہ میں۔ پتا نہیں۔"

گل کی ذہنی حالت اتنی ہی کمزور تھی کہ اس کا ذہن فوری طور پر جواب نہیں سوچ سکا۔ ارم گہری سانس لے کر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے پاس آئی۔

"یہ چاہیے تمہیں؟" ارم نے اپنی بند مٹھی اس کے سامنے کرتے ہوئے کھولی۔ چھوٹی سی شیشی میں نیند کی بہت ساری گولیاں تھیں جو کسی کو بھی ہمیشہ کی نیند سلانے کے لیے کافی تھیں۔ گل نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے نہیں پتا کہ یہ نیند کی گولیاں کس کی ہیں؟" گل نے کہا۔

"مگر میں نے تو ایسا نہیں کہا کہ یہ نیند کی گولیاں ہیں۔ تمہیں کیسے پتا؟" ارم نے پوچھا تو گل گڑبڑا گئی۔

"وہ... میرا اندازہ تھا۔"

گل کو سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ارم نے گہری سانس لی اور مڑ کر سائیڈ میز کی طرف گئی۔ پانی کا گلاس تھام کر گل کے پاس آئی۔

www.pklibrary.com

''اپنا ہاتھ آگے کرو۔'' ارم نے سختی سے کہا۔ گل نے ڈرتے ڈرتے اپنا زرد ہاتھ آگے کیا۔ ارم نے کھلی بوتل کو اس کی ہتھیلی پر الٹ دیا۔ چھوٹے سائز کی کئی گولیاں تھیں۔

ارم نے پانی کا گلاس اس کو تھمایا۔ گل نے کچھ سوچا اور جلدی سے منہ اوپر کی طرف کھول کر بند مٹھی آگے کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

''کیا تمہیں اپنی بند آنکھوں کے پیچھے اپنی بیمار ماں کا چہرہ نظر آ رہا ہے؟'' ارم کے پوچھنے پر گل کا ہاتھ لرزا اور جہاں تھا وہاں ہی رک گیا۔

''کیا تمہاری بند آنکھیں اپنے بوڑھے اور ٹوٹے ہوئے باپ کو دیکھ سکتی ہیں؟'' ڈاکٹر ارم کی آواز گونجی۔ گل کی بند آنکھوں سے ایک قطرہ نکل کر نیچے گر گیا۔

''تم آج نہیں تو کبھی نہ کبھی مر ہی جاؤ گی پھر تمہارے بوڑھے والدین کیا کریں گے؟ باپ جو پہلے ہی تمہارے ساتھ ہوئے حادثے کی وجہ سے اندر سے ٹوٹ چکا ہے، ہو سکتا ہے کہ تمہارے مرنے کی خبر اسے بھی جسم کی قید سے آزاد کر دے۔ مرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے اپنی پاگل ہوتی ماں کے بارے میں سوچو۔ جو آج بھی چیخیں مارتے ہوئے اپنی بیٹی کو آواز دیتی ہے۔

''نہیں!'' گل زور سے چیخی اس نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی دونوں چیزیں پھینک دیں۔

''پھر میں کیا کروں۔ مجھے کچھ نہیں بھولتا۔ وہ درندے، وہ اذیت وہ تکلیف! آخر میرا کیا قصور تھا؟ مجھے کس بات کی سزا ملی؟ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ دنیا تو بہت دور کی چیز ہے، میں اپنے والدین، خود کا سامنا نہیں کر سکتی ہوں۔ اللہ مجھے موت کیوں نہیں دے دیتا۔'' گل روتے ہوئے نیچے بیٹھ گئی اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''گل! تم اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہو؟ اگر اس نے تمہارے لیے تکلیف کو چنا ہے تو راحت بھی وہ ہی دے گا......'' ڈاکٹر ارم نے اس کے پاس آ کر کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔ ''ابھی بھی تمہارے پاس جینے کی وجہ موجود ہے گل!'' ڈاکٹر ارم نے نرمی سے کہا تو گل نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے بابا جان اور مما۔ گل انہیں تمہاری ضرورت ہے......'' گل رونا بھول گئی اور گم صم سی بیٹھی رہی۔ ''تمہارے والدین کے پاس تمہارے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ انہیں مزید اذیت سے بچا لو۔ نہیں تو تم انہیں ہمیشہ کے لیے کھو دو گی۔'' ڈاکٹر ارم سوچوں میں ڈوبی گل کا ہاتھ تھام کر بستر تک لائی اور اسے لٹا کر اوپر کمبل ڈال دیا۔

''سو جاؤ گل! جب آنکھیں کھولو گی تو ایک نئی صبح تمہیں منتظر ملے گی۔''

ڈاکٹر ارم نے نرمی سے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو گل نے آنکھیں موند لیں۔ ڈاکٹر ارم کے چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ پھیل گئی۔ لائٹ بند کر کے وہ کمرے سے باہر چلی گئی مگر جاتے ہوئے وہ نیند کی گولیوں کی بوتل اٹھانا نہیں بھولی تھی۔

☆☆☆

''مس حمرہ پلیز! میں آپ کو اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتی ہوں اور اس سے بھی زیادہ ایک دوست۔ کیا آپ میری اتنی سے خواہش پوری نہیں کر سکتی ہیں؟'' رمشا نے کوریڈور میں حمرہ کو روکتے ہوئے جب اپنی شادی کا کارڈ دیا تو ساتھ ہی ایک فرمائش بھی کر ڈالی۔ جسے سنتے ہی حمرہ نے منع کر دیا۔

''کیوں؟ کیا برائی ہے اس میں اور ویسے بھی آپ ہوسٹل میں رہ رہی ہیں۔ اگر آپ میری شادی تک حویلی میں رہ لیں گی تو کیا ہرج ہے؟ میری بہت خواہش ہے کہ میں بہت سا وقت آپ کے ساتھ گزاروں۔'' رمشا نے بچوں کی طرح ضد کرتے ہوئے کہا تو حمرہ نے گہری سانس لی۔

''ہمم! چلو ٹھیک ہے مگر تمہارے رخصتی ہوتے ہی میں واپس آ جاؤں گی۔''

www.pklibrary.com

حمرہ نے سوچتے ہوئے حامی بھری تو رمشا خوشی سے نہال ہوتی اس کے گلے لگ گئی۔

"بہت شکریہ پیاری مس حمرہ!" رمشا نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا تو حمرہ ہنس پڑی۔

"آپ اپنی تیاری رکھیں بس۔ مایوں والے دن ڈرائیور آپ کو آکر لے جائے گا۔"

رمشا نے جلدی سے کہا تو حمرہ سر ہلانے لگی۔

رمشا نے حویلی واپس آکر جب یہ خبر صباحت کو دی تو اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔

"رمشا! یہ بچپنا چھوڑ دو اب۔ پہلے ہی حویلی میں اتنے مہمان ہیں۔ تم فالتو لوگوں کو بھی مدعو کرتی پھر رہی ہو۔"

"اف صبا آپی! ایک تو مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو مس حمرہ سے کیا چڑ ہے؟"

رمشا نے جھنجلا کر کہا تو اندر آتا سکندر خان بھی چونک کر رک گیا

"مجھے کسی سے کوئی چڑ نہیں ہے، فضول مت بولو۔"

صباحت نے سکندر خان کو دیکھ کر فوراً بات پلٹی اور ملازمہ کو آواز دیتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ سکندر خان کو لگا کہ صباحت نے بات پلٹی تھی۔ سکندر خان سوچتا ہوا مردانے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ذیشان کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ گل ایک گھنٹہ پہلے ڈاکٹر ارم کے ساتھ ہاسپٹل آئی تھی۔

"میں جانتی ہوں کہ ذیشان کے لیے تم کیا ہو؟"

کاریڈور میں سر جھکائے بینچ پر بیٹھی گل کے پاس آکر تھکی ہاری ڈاکٹر ارم نے کہا۔ گل نے سر نہیں اٹھایا۔ ڈاکٹر ارم اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"ذیشان کے لیے تم آتی جاتی ان سانسوں کی طرح ہو، جس کے بغیر جسم جسم نہیں رہتا، مردہ وجود بن جاتا ہے۔ مجھے آج بھی یاد ہے گل! جب وہ تم سے بظاہر دور تھا مگر ہر لمحہ تمہارے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسے بے تابی سے اس دن کا انتظار تھا جب وہ اپنی سب ذمہ داریوں کو جلد از جلد مکمل کر کے واپس اپنے گھر جا سکے۔ جہاں اس کی لاڈلی بیٹی اس کی منتظر تھی۔ تم جانتی ہو گل۔ ذیشان کے پاس تمہارے ٹاپک اور نام کے علاوہ بولنے کے لیے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ گل ایسے ہنستی ہے، گل ایسے بولتی ہے۔ گل کو یہ چیز پسند ہے۔ گل کو وہ چیز پسند نہیں ہے! گل کو اس بات پر غصہ آتا ہے، گل ناراض ہوتی ہے تو کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ گل گل سن کر میں اکثر سوچتی کہ تم کتنی خوش نصیب ہو کہ جسے اتنا چاہنے والا باپ ملا ہے!" ڈاکٹر ارم کے کہنے پر گل نے بھیگی پلکوں سے اس کی طرف دیکھا۔ "ہاں گل! تم خوش نصیب ہی تو ہو۔ جسے اتنا چاہنے والے والدین کا ساتھ اور پیار ملا اور جب سے تم نے زندگی سے منہ موڑا ہے، تمہارے پیارے بھی زندگی سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ گل وہ تمہیں اس حال میں دیکھ کر زندہ کیسے رہیں گے۔ کبھی تم نے یہ سوچا ہے؟ گل تم جانتی ہو کہ بے لوث محبت کرنے والوں کے زخم کبھی بھی دنیا کی کسی دوا، جادو منتر سے نہیں بھرتے ہیں۔ سوائے اس شخص کی خوشی اور لمس سے جس سے وہ بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ شیشے کے پار لیٹے اس شخص کا دل تمہارے درد کے بوجھ سے تھک چکا ہے یہ ہارٹ اٹیک بہت شدید تھا۔ اگر اگلی بار بھی ایسا ہوا تو......"

ڈاکٹر ارم اپنی جگہ سے اٹھی۔ گل کو سوچوں میں گم دیکھ کر وہاں سے چلی گئی۔

کچھ فیصلے ہم نے خود کرنے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے بعد آنے والے سب امتحان بھی صرف ہم نے ہی دینے ہوتے ہیں۔ جس میں نہ کسی کا سہارا ملتا ہے اور نہ کسی کی مدد۔ بس ایک آپ ہوتے ہیں اور ایک اوپر والا۔ درمیان میں بے انتہا پھیلی ہوئی دھند یا تیز دھوپ۔ جھیلنا پڑتا ہے۔ دھند میں بھی چلنا پڑتا ہے اور دھوپ میں بھی۔ دونوں ہی راستوں کو الجھاتے ہیں۔ مشکل بنا دیتے ہیں مگر راستے چلنے کے

www.pklibrary.com

لیے بنے ہیں اور ان پر چلنا ہی پڑتا ہے کہ زندگی میں کوئی بھی مقام اڑنے کی خواہش سے نہیں ملا کرتے ہیں۔ اس کے لیے زینہ بہ زینہ چڑھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔

☆☆☆

رمشا کی شادی کا دن آن پہنچا! حویلی میں گہما گہمی عروج پر تھی۔ ماہر بیوٹیشن صبح سویرے ہی شہر سے حویلی پہنچ گئی تھی۔ جس نے رمشا کو تیار کرنا تھا۔ آج خلاف معمول رمشا بہت چپ چپ تھی۔ بیوٹیشن نے اپنا کام شروع کیا۔

حمرہ ڈریسنگ روم سے تیار ہو کر واپس کمرے میں آئی تو رمشا پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئی۔ رمشا جنت سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ رمشا نے اسے اشارہ کیا۔ حمرہ پاس آئی۔

"ماشاءاللہ! بہت پیاری لگ رہی ہو لڑکی، اللہ بہت خوشیاں نصیب کرے۔ آمین۔"

حمرہ نے خلوص دل سے دعا دی تو رمشا نے مہندی سے سجے ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"مس حمرہ! بابا اور اماں جان کی اچانک موت نے میری زندگی میں بہت خلا پیدا کر دیا تھا۔ صباحت آپی کی شادی ہوئی اور وہ چلی گئیں۔ سکندر بھائی میرا بہت خیال رکھتے تھے مگر میں ذہنی تنہائی کا شکار ہوتی گئی اور ہر وقت خود ترسی میں مبتلا رہتی۔ آپ سے ملنے کے بعد میں نے جانا کہ زندگی کو کیسے جیتے ہیں۔ آپ کی باتیں، آپ کا عزم، آپ کی شخصیت ہم سب کے لیے مشعل راہ ہے۔ میں نے آپ سے بہت سیکھا کہ زندگی میں آگے بڑھتے رہنا چاہیے، ہمیشہ مثبت رخ کو دیکھنا چاہیے اور جب میں نے اس پر عمل کیا تو مجھے زندگی خوب صورت لگنے لگی۔ آپ مجھے بہت عزیز ہیں مس حمرہ، بالکل اپنی بہن کی طرح۔"

رمشا کے سادہ سے لفظوں نے حمرہ کو ساکت کر دیا تھا۔ حمرہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"رمشا! میں تمہارے محبت بھرے الفاظ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ خوش رہو۔"

حمرہ نے کہتے ہوئے پیار سے رمشا کی روشن پیشانی پر بوسہ دیا۔

اسی وقت گلا کھنکار کر کسی نے متوجہ کیا۔ حمرہ اور رمشا نے مڑ کر دیکھا تو کمرے کے دروازے پر صباحت اور سکندر خان کھڑے تھے۔ سکندر خان کی آنکھیں بھی ہلکی سرخ تھیں۔ جیسے وہ بہت ضبط سے کام لے رہا تھا۔ صباحت عجیب سی نظروں سے حمرہ کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھی تو حمرہ جھجک کر پیچھے ہٹی اور سکندر خان کو دیکھ کر فوراً دوپٹا سر پر لے لیا۔ حمرہ ملازمہ کے ساتھ کمرے سے باہر جانے لگی تو سکندر خان نے سر کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔ حمرہ حیران ہوتی ہوئی ایک کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"رمشا! میری بہن، میں نے بابا اور اماں جان کے جانے کے بعد ہر ممکن کوشش کی کہ کبھی تمہیں ان کی کمی محسوس نہ ہونے دوں۔ تمہارے لیے ہر اس بہترین چیز کا انتخاب کروں جو وہ خود اپنی زندگی میں تمہارے لیے کرتے۔ آج میں سرخرو ہوا۔"

سکندر خان نے کہتے ہوئے اپنا بھاری ہاتھ رمشا کے سر پر رکھا تو رمشا سسکتی ہوئی بھائی کے سینے سے لگ گئی۔ صباحت بھی رونے لگی۔ دونوں سکندر خان سے لگ کر رو رہی تھیں۔ وہ تینوں اپنے والدین کو یاد کر رہے تھے۔ آج اگر وہ یہاں ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ روتے روتے رمشا کی ہچکی بندھ گئی تو صباحت کو ہی خیال آیا۔

"بس کرو رمشا! باقی آنسو رخصتی کے لیے رکھ لو۔"

صباحت نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو رمشا چپ ہونے کے بجائے اور شدت سے رونے لگی۔ سکندر خان نے بمشکل اسے چپ کروایا۔ کمرے سے نکلتے سکندر خان کی نظر کونے میں کھڑی حمرہ پر پڑی۔ اس کی آنکھوں کا کاجل رونے کی وجہ سے بہہ گیا تھا اور ناک ہلکی گلابی ہو رہی تھی۔

"یہ لے لیجیے آپ کے کام آئے گا۔"

www.pklibrary.com

سکندر خان نے اپنا رومال اس کی طرف بڑھایا تو حمرہ نے بے خیالی میں تھام لیا اور پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جو مسکرا رہا تھا۔ حمرہ کو سخت شرمندگی ہوئی کہ سکندر خان نے اسے روتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔

"میں رو تو نہیں رہی۔" حمرہ نے بوکھلاہٹ میں کہا تو سکندر خان بے ساختہ امڈ آنے والی ہنسی کو روکتے ہوئے سر ہلاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

"زمانے کی حد اور وقت کی قید نہ ہوتی تو میں ساری عمر گزارہ کر تمہاری وضاحت سنتا رہتا حمرہ۔ مگر ابھی میرا وقت نہیں۔" سکندر خان نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے سوچا تھا۔

☆☆☆

"آج میں مما کے پاس گئی تھی۔ ان کے ساتھ کافی وقت گزارا۔ ان کی کنگھی کی، ناخن کاٹے، کپڑے تبدیل کروائے اور انہیں اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلایا۔ بالکل ایسے ہی جیسے آپ کے لیے لائی ہوں۔"

صاف ستھرے حلیے میں سلیقے سے باندھے بالوں کے ساتھ وہ مگن سی انداز میں بولتی ہوئی سوپ کا باؤل لے کے باپ کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور چمچ بھر کے باپ کی طرف بڑھایا۔ ذیشان نے خوش گوار حیرت سے گل کی طرف دیکھا اور پھر منہ آگے کیا۔

"سوپ تم نے بنایا ہے؟" ذیشان نے پہلا سپ لینے کے بعد سوال کیا۔ گل کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"آنٹی ارم کے کک نے بنایا ہے۔" گل نے سنجیدگی سے کہا تو ذیشان سر ہلانے لگا۔

"ہاں اسی لیے اس میں تمہارے ہاتھ کا ذائقہ نہیں ہے۔"

گل نے کچھ سوچتے ہوئے باپ کی طرف دیکھا۔

"اگر آپ کو میرے ہاتھ کا بنا ہوا سوپ اتنا پسند ہے تو کل سے میں خود بنا کر لاؤں گی۔"

گل نے کہا تو ذیشان نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔ وہ جانتا تھا کہ گل کو کچن کے کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر وہ چاہتا تھا کہ گل خود کو مصروف رکھے۔ جتنے دن ذیشان ہسپتال میں داخل رہا۔ گل ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی رہی۔ پہلے کی طرح باپ سے باتیں کرنے لگی تھی۔ ابھی اس کی باتوں میں پہلے کی طرح روانی نہیں رہی تھی۔ اکثر ذیشان کو ایسا لگتا کہ جیسے گل بہت سوچ سوچ کر بول رہی ہے۔ ذیشان یہ سب دیکھ کر نظر انداز کر دیتا۔ اسے گل کی صحت یابی سے مطلب تھا۔ وہ گل کے بولنے کا منتظر رہتا۔ دونوں عام سے موضوع پر بھی ایسے تبادلہ خیال کرتے، جیسے اس سے ضروری کچھ اور ہے ہی نہیں۔

ذیشان ڈسچارج ہو کر اپنے گھر گیا۔ گل بھی اس کے ساتھ تھی۔ گل اب بہت سنبھل گئی تھی۔ ڈاکٹر ارم اور ذیشان نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ گل کو زندگی کی طرف لانے میں انہوں نے بہت محنت کی تھی۔ ٹھیک ہونے کے بعد ذیشان نے ایک یونیورسٹی کو جوائن کر لیا۔ جو کافی عرصے سے اسے جاب کی آفر کر رہے تھے۔ پروفیسر ذیشان کی قابلیت سے سب ہی واقف تھے۔ بہت جلد ذیشان اپنے سب طالب علموں میں دل عزیز پروفیسر کا درجہ پانے میں کامیاب ہو گیا۔ یونیورسٹی میں نئے سال کے داخلے شروع ہوئے تو ذیشان گل کے لیے بھی داخلہ فارم لے آیا مگر ذیشان کے لیے گل کا ردعمل بہت حیران کن تھا۔ گل نے خوف زدہ ہو کر خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ وہ گھر سے باہر نہیں جانا چاہتی تھی۔ ذیشان نے ڈاکٹر ارم کو کال کر کے بلا لیا۔ وہ دونوں سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور اس نئے مسئلے کا حل تلاش کرنے لگے۔

☆☆☆

پریوں جیسی رمشا، شہزادے جیسے علی کے ساتھ بہت شاندار طریقے سے رخصت ہوئی تو حویلی کی جگمگاتی روشنیاں بھی آنسوؤں کی دھند میں ماند پڑ گئیں۔ حمرہ ٹیرس پر اداس بیٹھی نیچے لان میں

www.pklibrary.com

ملازموں کو ادھر سے ادھر بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ ملازمہ نے پاس آکر کافی کا مگ حمرہ کو پیش کیا تو حمرہ چونکی۔ ٹرے میں دوسرا مگ بھی رکھا ہوا تھا۔

"یہ کس کا ہے؟" حمرہ نے اپنا مگ تھامتے ہوئے سوال کیا۔

"مالک کا، لان میں بیٹھے ہیں وہ۔" ملازمہ نے باادب انداز میں کہا اور واپس مڑ گئی۔ حمرہ نے کچھ لمحے سوچا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

میرون شال کندھوں پر لپیٹے وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لان میں پہنچی تو گم صم بیٹھا سکندر خان ایک دم چونکا تھا اور اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ حمرہ کو دیکھ کر وہ بس خاموش نظروں سے دیکھتا رہا۔

حمرہ پاس آئی اور بینچ کے آخری سرے پر بیٹھ گئی۔ ایک سرے پر سکندر خان بیٹھا ہوا تھا اور دوسرے سرے پر حمرہ۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش تھے۔ جب دونوں کی کافی ختم ہوئی تو حمرہ نے اپنی ریسٹ واچ میں وقت دیکھا اور دھیرے سے گویا ہوئی۔

"فجر قریب ہے۔" حمرہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

"شکریہ حمرہ۔" سکندر خان نے آہستگی سے کہا۔

"کس بات کا؟" حمرہ نے مڑ کر پوچھا۔

"دکھ بانٹنے کے لیے۔" سکندر خان نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر میں تو کچھ بولی ہی نہیں۔" حمرہ نے حیرت سے کہا۔

"حمرہ! یہ ضروری نہیں ہوتا کہ شدید دکھ کا اظہار بول کر، یا شدید دکھ کو سن کر ہی بانٹا سمجھا جائے۔ جب ہم اپنی ذات کے محاذ پر اکیلے کھڑے ہوں تو وہاں الفاظ کی نہیں، کسی کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے۔ چاہے وہ ساتھ خاموش ہی کیوں نہ ہو۔" سکندر خان نے کہا۔

"کیا یہ ساتھ آپ کو تب بھی درکار تھا جب آپ رمشا سے ملنے کمرے میں آئے تھے۔" حمرہ نے اپنے ذہن کی الجھن کو نام دیا تھا۔

"مجھے آپ کا ساتھ اب ہر قدم پر چاہیے حمرہ۔ اس وقت آپ کو کمرے سے باہر جانے سے اس لیے روکا تھا کہ آپ میرے لیے غیر نہیں ہیں اور اس بات کا اظہار میں اپنی فیملی کے سامنے کر چکا ہوں۔ بہت جلد میری فیملی آپ کی۔" سکندر خان کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔

"مگر مجھے آپ کا ساتھ قبول نہیں ہے۔ نہ آج اور نہ ہی کبھی۔ آپ نے مجھے جو عزت اور مان دی اس کے لیے میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں مگر اس سے زیادہ کی توقع رکھ کر آپ بے وقوفی کا ثبوت دیں گے۔" حمرہ نے سخت لہجے میں کہا اور مڑنے لگی۔

"وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" سکندر خان نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔ آج تک کب ایسا ہوا تھا کہ سکندر خان کو کسی نے اتنی بری طرح سے رد کیا ہو جیسے وہ بہت ہی عام ہو، اتنا عام کہ کسی کی نگاہ اس پر ٹھہر ہی نہیں سکتی۔

"اگر میں وجہ نہ بتانا چاہوں تو۔" حمرہ نے روکھے انداز میں کہا۔

"تو میں وجہ خود تلاش کر لوں گا۔" سکندر خان نے مضبوط لہجے میں کہا تو حمرہ سر جھٹکتی پلٹ گئی۔

"ویسے کتنا عجیب ہے نا کہ جس کا نام سکندر ہو اور وہ ہار جائے۔ یہ سکندر کی تاریخ تو نہیں۔"

حمرہ کے قدم رکے اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سکندر خان اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

"ہاں اس سکندر اعظم نے دنیا کو فتح کیا تھا۔" حمرہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اور میں دل کو۔ دیکھتے ہیں کہ میں اپنے نام کی لاج رکھ سکتا ہوں یا نہیں۔" سکندر خان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"دل نہ ہوا میدان جنگ ہو گیا کہ جسے ہر حال میں جیتنا ضروری ہے۔" حمرہ بڑبڑاتے ہوئے پلٹ

www.pklibrary.com

گئی۔

"کبھی محبت کرو اور پھر بتانا کہ دل کی حالت کب میدان جنگ سے مختلف ہوتی ہے۔"

سکندر خان اپنی بات پر قائم تھا۔ حمرہ تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

"گل تم پڑھنا کیوں نہیں چاہتی ہو؟"

ڈاکٹر ارم نے نرمی سے پوچھا۔ وہ تینوں اس وقت لاؤنج میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہی زرینہ (ملازمہ) چائے سرو کر کے گئی تھی۔

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" گل نے پریشانی سے کہا۔ وہ بے خیالی میں اپنے ناخنوں کو دانتوں سے کتر رہی تھی۔

"کس سے؟" ڈاکٹر ارم نے نرمی سے پوچھا۔ ذیشان خاموشی سے بیٹھا تھا۔

"سب سے۔" گل نے جلدی سے کہا۔

"دیکھو گل! آج نہیں تو کل تمہیں اپنے ڈر کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ دنیا کا سامنا کیے بغیر تم زندگی نہیں گزار سکتی ہو۔" ڈاکٹر ارم نے نرمی سے سمجھایا۔

"میں گھر کے سب کام کروں گی۔ بابا کے لیے سوپ بنانا بھی سیکھ رہی ہوں۔ ہر روز کھانا میں بناؤں گی۔ صفائی بھی کروں گی اور کپڑے بھی دھولوں گی۔ اگر بابا جان کہیں گے تو میں گاڑی بھی دھو دوں گی مگر۔"

گل نے جلدی جلدی کہا تو ذیشان نے ضبط سے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ڈاکٹر ارم ایک دم اپنی جگہ سے اٹھی اور ذیشان کے پاس آ کر پانی کا گلاس بڑھایا۔

"ریلیکس ذیشان! گل سمجھ جائے گی۔ اسے تھوڑا وقت دو پلیز، زیادہ ٹینشن تمہارے لیے ٹھیک نہیں ہے۔"

گل پریشان نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ باپ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے چمکتے دیکھ کر گل کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ اس لمحے گل کو باپ کی خیریت سے زیادہ کچھ اور یاد نہیں رہا۔ وہ ایک دم ہی بولی۔

"میں۔ں۔ں! یونیورسٹی میں داخلہ لے لوں گی۔ مگر بابا جان سے کہیں کہ ہمیشہ میرے ساتھ ہی رہنا۔"

گل نے بے چارگی سے کہا تو ذیشان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں میری بچی۔"

ذیشان نے بازوؤں پھیلائے تو گل تیزی سے اٹھ کر باپ کے سینے سے لگ گئی۔ باپ کے سینے سے لگتے ہی وہ ایک دم پرسکون ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ارم نے اطمینان بھری سانس لی۔

☆☆☆

سکندر خان غصے سے تیز تیز قدم اٹھاتا پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوا اور سیدھا ایس ایچ او کے کمرے میں چلا گیا جہاں پہلے سے کچھ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر ایس ایچ او بشیر جاوید اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سکندر خان نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سلام کا جواب دیا۔

"مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟" سکندر خان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"دیکھیے سکندر صاحب! مسئلے کا سلجھانے کے لیے ہی میں نے آپ لوگوں کو یہاں بلایا ہے، الیکشن سر پر ہیں اور......" ایس ایچ او بشیر جاوید نے کہنا شروع کیا۔

"اور یہ ڈر ہی ان لوگوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر رہا ہے!" سکندر خان نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"گھٹنے کس نے ٹیکے ہیں؟" ولی احمد بھڑک کر بولا۔

سکندر خان نے سخت نگاہ اس پر ڈالی۔ چوہدری یعقوب نے ولی احمد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا تو ولی احمد بڑبڑاتا ہوا

www.pklibrary.com

دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''دیکھو سکندر خان! میں بات کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ میرے بیٹے سے غلطی ہوئی ہے۔ میں اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔ ان لوگوں سے پوچھ لو کہ انہیں زمین، پیسہ جو بھی چاہیے میں دوں گا مگر اس کیس کو یہاں ہی ختم کر دو۔'' چوہدری یعقوب نے اصل مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔ سکندر خان کا چہرہ تن گیا۔

''تم نے کیا لوگوں کو بکاؤ مال سمجھ رکھا ہے؟ تمہارے بیٹے کی ہمت کیسے ہوئی میرے علاقے میں آ کر بدمعاشی کرنے کی۔ میرے علاقے کی کسی بچی پر بری نظر ڈالنے کی! اور تو اور وہ اسے اغواء کر کے اپنے ڈیرے پر لے گیا۔ اگر میرے بندے بروقت کارروائی نہیں کرتے تو یہ بھیڑیا اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا؟'' سکندر خان نے تپ کر کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ اس سے غلطی ہوئی مگر وہ لڑکی خود بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' چوہدری یعقوب نے سارا الزام لڑکی پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''چوہدری یعقوب اپنے بیٹے کے کالے کرتوت پر پردہ ڈالنے کے لیے کسی شریف لڑکی پر الزام مت لگاؤ!''

سکندر خان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے قریب تھا۔ ایس ایچ او بشیر جاوید کو معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا اسی لیے وہ مداخلت کرتے ہوئے بولا۔

''غلطی ولی احمد کی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں بہرحال ان شریف لوگوں کی عزت اچھالنے کے بجائے، خاموشی سے بات ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔''

''ٹھیک ہے میں بات ختم کرنے کو تیار ہوں۔''

''اگر ولی احمد اس لڑکی کے پاؤں میں گر کر معافی مانگے اور دوبارہ ایسا نہ کرنے کا عہد کرے گا تو!''

''سکندر خان! تم بھول رہے ہو کہ ہم کون ہیں؟ اگر الیکشن سر پر نہ ہوتا تو میں اس بات کا جواب تمہیں بہت اچھی طرح دیتا۔'' چوہدری یعقوب کا

انداز دھمکی آمیز تھا۔ سکندر خان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم سکندر خان کو نہیں جانتے ہو۔ میں اصولوں پر مر مٹنے والا آدمی ہوں چوہدری یعقوب۔ تم کیا سوچ کر یہاں بولی لگانے آئے تھے۔ کیس تو ہوگا اور تمہارا بیٹا اس کی سزا بھی ضرور بھگتے گا۔''

''دیکھتے ہیں۔ کون چوہدری یعقوب کے بیٹے کو جیل میں ڈالتا ہے۔'' چوہدری یعقوب نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور ولی احمد کو اشارہ کیا۔ دونوں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ''سکندر خان! تم قیمت بھرو گے اس بے عزتی کی۔'' چوہدری یعقوب نے پلٹ کر کینہ توز نظروں سے سکندر خان کو دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سکندر خان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''میری تو خواہش تھی کہ یہ معاملہ فہم و تفہیم سے حل ہو جاتا مگر خیر۔'' ایس ایچ او بشیر جاوید نے گہری سانس لے کر کہا۔

''آپ اس مقدمے کی فائل تیار کریں۔ میں مجرم کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔'' سکندر خان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور شیر دل کو اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

گھر کے چھوٹے سے لان میں سرما کی پھیلی پرسکون دھوپ میں لان میں رکھے بڑے سے لکڑی کے جھولے میں گل اپنی ماما جان کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں گل کی شخصیت میں بہت مثبت تبدیلی آئی تھی، وہاں ہی افشاں (ماما جان) کی ذہنی حالت بھی بہتری کی طرف گامزن تھی۔ وہ اب گل اور ذیشان کو پہچاننے لگی تھی۔ زرینہ کے سر پر کھڑے ہو کر گھر کے چھوٹے موٹے کام کروا لیتی تھی۔ اکثر گل کی پسند کا کھانا بھی بنا لیتی تھی۔ گل کو گھر آنے میں تھوڑی سی دیر بھی ہو جاتی تو افشاں کی طبیعت خراب ہونے لگتی تھی۔ اس

www.pklibrary.com

لیے گل فون پر اس سے مسلسل رابطے میں رہتی۔ ذیشان کسی کام سے باہر نکلا تو ان دونوں کو دیکھ کر رک گیا۔ افشاں گل کو مالٹے چھیل کر دے رہی تھی۔ گل کسی بات پر بے ساختہ ہنس رہی تھی۔ جبکہ افشاں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ ذیشان چپ چاپ کھڑا اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پہلے اس کا آنگن ایسے ہی خوش رنگ منظروں سے آباد تھا۔ آج کتنے عرصے کے بعد ذیشان نے ایک طویل سفر کے بعد پڑاؤ دیکھا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کے اپنے زندگی کی طرف لوٹ آئے ہیں مگر ذیشان کا دل جانتا تھا کہ آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ماضی کی راکھ میں ابھی بہت سی جلتی بجھتی چنگاریاں تھیں جو وقتاً فوقتاً اس کا دل اور دامن جلاتی رہتی تھیں۔

جیسے آج اس کا ایک دوست اچانک ہی مل گیا۔ وہ یونیورسٹی میں اپنی بیٹی کے داخلے کے لیے آیا تھا۔ پروفیسر ذیشان کو دیکھ کر پہلے تو وہ چونکا اور پھر اس نے کتنے ہی سوال کر ڈالے۔ گل کے ساتھ ہوئے حادثے سے لے کر شہر چھوڑنے تک۔ ذیشان سر جھکائے سنتا رہا۔ وہ اسی خوف میں مبتلا رہا کہ کہیں گل سے اس کا آمنا سامنا نہ ہو جائے یا یہاں کوئی یہ بات نہ جان لے۔ اس دن گھر واپس آیا تو بہت خاموش تھا۔ وہ جس خوف سے اپنا برسوں پرانا شہر چھوڑ آیا تھا، وہ داغ تو ہمیشہ کے لیے اس کی کی پیشانی پر چمکتا تھا۔ وہ کہاں کہاں اور کس کس سے بھاگ سکتا تھا۔

"ذیشان! شہر یا لوگوں کو چھوڑ دینے سے ہم کبھی بھی مضبوط نہیں بن سکتے ہیں۔ جب تک کہ ہم ان کا سامنا کرنا نہ سیکھ لیں۔" ڈاکٹر ارم نے ساری بات سننے کے بعد سمجھایا تھا۔

"مگر ارم! میں کتنا بھی مضبوط بن جاؤں۔ گل کا کیا کروں؟" ذیشان نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"گل کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا، اسے ہر حال میں اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔ تب ہی وہ آگے دیکھ سکے گی۔ جب تک ہم اپنے درد سے بھاگتے ہیں، یا اس کا سامنا کرنے سے ڈرتے رہتے ہیں تب تک ہم اپنے دکھ یا تکلیف کا حل نہیں پا سکتے ہیں۔ زندگی میں ہر چیز صفر سے شروع کرنی پڑتی ہے۔ قدم بہ قدم ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔"

ذیشان ہمیشہ کی طرح ڈاکٹر ارم سے بات کر کے مطمئن تو ہو گیا تھا مگر اسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھی کہ وہ یہ سب گل کو کیسے سمجھائے گا۔ وہ گل کو کیسے بتائے گا کہ جب تک وہ اپنا ڈر، اپنی تکلیف کو دل سے قبول نہیں کرے گی، اس کی دوا کیسے کرے گی۔

ذیشان نے گہری سانس لی اور تھکے ہوئے قدموں سے گھر سے باہر نکل گیا۔ گل نے باپ کے قدموں کی تھکن کو محسوس کر لیا تھا۔ اس لیے اس کی آنکھوں میں اداسی گہری ہو گئی تھی مگر ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی اپنی ماں کی تسلی کے لیے۔

اکثر ہم ایک وقت پر کئی محاذوں پر لڑ رہے ہوتے ہیں۔ بس ظاہر نہیں کرتے ہیں۔ یہ ہی گل کر رہی تھی۔

☆☆☆

سکندر خان راکنگ چیئر پر آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے ہزاروں منظر تیزی سے آگے پیچھے گزرتے جا رہے تھے۔ دن بھر کتنے ہی مسائل اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ الیکشن کی تیاریوں کی وجہ سے سکندر خان کی نیند ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔ کبھی یہاں ہوتا اور کبھی دوسرے شہر کی طرف عازم سفر۔ آج کل سکندر خان کو اپنا ہوش بھی نہیں تھا۔ اچانک ذہن پر دوڑتے بھاگتے منظروں میں ایک چہرہ ابھرا اور سب کچھ ساکت ہو گیا۔ جیسے تیز رفتار ٹرین کو اسٹیشن آ گیا ہو۔ سکندر خان جھولتے جھولتے رک گیا اور اس نے آنکھیں کھولیں۔ سائیڈ میز پر رکھا کاغذ اٹھایا۔ نجانے وہ اس تحریر کو کتنی بار پڑھ چکا تھا مگر پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

یہ حمرہ کا ریزائن تھا۔ اصول کے مطابق حمرہ کو نوکری چھوڑنے سے ایک مہینے پہلے انفارم کرنا تھا۔ جو اس نے کر دیا تھا۔ سکندر خان نے کاغذ واپس میز

www.pklibrary.com

پر رکھا۔ اسی وقت سکندر خان کے موبائل کی رنگ ٹون بجی۔ سکندر خان نے اسکرین پر چمکتا نام دیکھا۔ شیر دل کا نام دیکھ کر اس نے فوراً فون کان سے لگایا۔

"مالک! ولی احمد جیل سے رہا ہو گیا ہے۔ بابا فیض نے اچانک ہی اپنا کیس واپس لے لیا۔ میں نے بات کرنی چاہی تو اس نے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے کہ وہ مزید کوئی لڑائی جھگڑا نہیں چاہتا ہے اور کچھ دیر پہلے اطلاع ملی ہے کہ بابا فیض یہ شہر ہی چھوڑ کر اپنے گاؤں چلا گیا ہے۔ اب آپ بتائیں آگے کیا کرنا ہے؟" شیر دل نے ساری تفصیل بتائی۔

"ہمم! چوہدری یعقوب کسی طرح بابا فیض کو ڈرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس لیے بابا فیض نے یہ فیصلہ کیا۔ خیر تم احتیاط کرو۔ ولی احمد جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی کوشش ضرور کرے گا۔ سب سے کہہ دو کہ چوکس رہیں۔"

سکندر خان نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر ولی احمد کو کچھ عرصے کے لیے جیل بھیجنے پر کامیاب تو ہو گیا تھا مگر بابا فیض نے کیس واپس لے کر سکندر خان کے ہاتھ کمزور کر دیے تھے۔

سکندر خان نے سگریٹ لگایا اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگا۔ اگلے دن شہر جاتے ہوئے سکندر خان کی گاڑی پر نامعلوم افراد نے فائرنگ کر دی۔ فائرنگ سے سکندر خان شدید زخمی ہو گیا تھا مگر اس کی جان بچ گئی۔ سکندر خان جانتا تھا کہ ان نامعلوم افراد کے پیچھے کون ہے مگر اس نے پولیس کے سامنے نام لینے سے گریز کیا۔ وہ دشمن کو سب سود سمیت واپس کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے اسے ابھی انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

رمشا سکندر کی خبر لینے آئی تو اسے حمرہ کے ریزائن کا پتا چلا۔ رمشا نے اسی وقت حمرہ کو کال کی اور اگلے دن ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

اگلے دن ڈرائیور حمرہ کو لینے کالج ہوسٹل چلا گیا۔ حمرہ دوپہر کے وقت حویلی پہنچی تو رمشا نے حمرہ کا استقبال بہت گرم جوشی سے کیا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ کل رات سکندر رمشا اور صباحت سے حمرہ کے بارے میں بات کر چکا تھا۔ اس لیے آج رمشا کا انداز بہت الگ تھا۔ اس کے دل میں کھد بھد لگی ہوئی تھی کہ وہ حمرہ سے اس سلسلے میں بات کرے۔

وہ دونوں صوفے پر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے ہوئے ڈرائی فروٹس کھا رہی تھیں۔ جب صباحت کسی کے ساتھ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے ساتھ کھڑی عورت ایک دم چونکی تھی۔

"غزل باجی! آپ جا رہی ہیں؟"

رمشا نے جلدی سے اپنی جگہ سے کھڑے ہو کر پوچھا تو غزل نے چونک کر رمشا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر آگے بڑھی۔ غزل کی پرسوچ نگاہیں مسلسل حمرہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

"شادی کے بعد تم پر بہت روپ آیا ہے۔ ماشاءاللہ۔" غزل نے رمشا کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔ تو رمشا شرما گئی۔ صباحت نے جب حمرہ کا تعارف کروایا تو غزل نے حیرت سے صباحت کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ ہے سکندر بھائی کی پسند۔ صباحت نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ہاں کا اشارہ کیا۔ غزل حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔

"اچھا میں اب چلتی ہوں۔" حمرہ کہتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ رمشا اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ جب اچانک غزل بولی۔

"مس حمرہ! آپ پروفیسر ذیشان حسن کی بیٹی ہیں نا آپ کا پورا نام بھلا کیا تھا؟" غزل نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

حمرہ نے فوراً مڑ کر دیکھا اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا جو۔ سب کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔

"ہاں یاد آیا، حمرہ گل، آپ کو تو میں کبھی نہیں

www.pklibrary.com

بھول سکتی۔ آپ کے ساتھ اس حادثے کی وجہ سے کتنا عرصہ تو ہم دونوں بہنوں نے بھی گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔"

غزل نے اس وقت کو یاد کرتے ہوئے کہا تو حمرہ نے ضبط کرتے ہوئے ایک پلٹی تھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئی جبکہ رمشا اور صباحت نے حیرت سے غزل کی طرف دیکھا تھا۔

"کون سا حادثہ؟" صباحت نے جلدی سے پوچھا۔

"اغواء اور پھر گینگ ریپ۔"

غزل نے کہا تو رمشا کو ایسا لگا جیسے زمین اور آسمان گھوم گئے ہیں۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے ہٹی۔ غزل کو جتنی تفصیل معلوم تھی، وہ جلدی جلدی ان دونوں کو بتانے لگی۔ صباحت نے سنتے ہوئے سر اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ جہاں سکندر خان ساکت کھڑا تھا۔ ایک دم ہی وہ تیزی سے وہاں نکل گیا۔

"رکو حمرہ!"

اس وقت حمرہ کی جو حالت تھی، اسے ایسی ہی کسی جگہ کی ضرورت تھی جہاں اسے کوئی نہ دیکھ سکے مگر نجانے کیوں سکندر خان یہاں بھی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ حمرہ رکی نہیں۔ چلتی رہی۔

پھر اس کو ٹھوکر لگی اور وہ نیچے گری۔ اس کی ہتھیلیاں پتھریلے پتھر سے ٹکرا کر زخمی ہو گئیں۔ سکندر خان پاس آ کر گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھا اور اس کی زخمی ہتھیلیوں پر ایک نظر ڈال کر بولا۔

"دیکھا، میری بات نہ مان کر خود کو زخمی کر لیا۔"

سکندر خان نے کہتے ہوئے اپنی جیب سے رومال نکالا اور حمرہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ حمرہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایک رومال پہلے بھی اس کے پاس امانت کے طور پر پڑا ہوا تھا اور آج پھر اس نے اپنا رومال دے دیا تھا۔ پہلے بھی آنسوؤں صاف کرنے کے لیے دیا تھا اور آج بھی زخم صاف کرنے کے لیے۔ اتنا خیال رکھنے والا شخص جو محبت کی کوئی کرن بن کر دل کے گھپ اندھیرے میں اکثر دکھنے لگا تھا، وہ اس شخص کو پانے کی تمنا تو کیا، سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"کیا تم اسی ڈر کی وجہ سے مجھ سے، اس شہر سے دور جانا چاہ رہی تھیں؟"

سکندر خان نے سنجیدگی سے پوچھا تو حمرہ نے ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"جانا تو مجھے تھا۔"

حمرہ کہتے ہوئے بمشکل اپنی جگہ سے اٹھی۔ تھوڑا لڑکھڑائی اور پھر چل پڑی۔ سکندر خان بھی گہری سانس لے کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا حمرہ۔ میں کیا کہوں۔ تمہارے ساتھ جو ہوا مجھے اس پر بہت افسوس ہے مگر۔" سکندر خان کہتے کہتے چپ کر گیا۔ حمرہ ایک دم پلٹی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"مگر اب آپ کی محبت اس مقام پر آ کر ہوش میں آ گئی ہے مسٹر سکندر خان۔ میں نے اپنی زندگی کے بارہ سال اس داغ کو ماتھے پر سجائے گزارے ہیں۔ میں لوگوں کی بدلتی سوچ کو بہت پہلے ہی سمجھ لیتی ہوں۔ آپ کو نظریں چرانے کی ضرورت نہیں، میں تو پہلے ہی انکار کر چکی ہوں۔"

حمرہ نے لفظ چبا چبا کر کہا اور غصے سے مڑ کر جانے لگی۔ اسی وقت ہی ایک گولی سنسناتی ہوئی اس کے کان کے پاس سے گزری۔ حمرہ نے ڈر کر چیخ ماری۔ سکندر خان نے حمرہ کو ہاتھ پکڑ کر درخت کے تنے کے پیچھے کھڑا کیا۔ حمرہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ سکندر خان نے اپنا چھوٹا سا پسٹل نکالا اور چونکنے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ حمرہ نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟" حمرہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"سکندر۔" حمرہ نے زور کی چیخ مارتے ہوئے سکندر خان کو پوری قوت سے دھکا دیا تھا۔ وہ دشمن کو

www.pklibrary.com

جھاڑیوں کے پیچھے سے نکلتا ہوا دیکھ چکی تھی۔

وہ دو لوگ تھے۔ جن کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ حمرہ کے چیخ مارتے ہی ان میں سے ایک شخص نے فائر کیا۔ سکندر خان دھکے سے لڑکھڑایا اور گولی سیدھا حمرہ کو لگی۔ حمرہ کی چیخ کے ساتھ ہی فائرنگ کی آوازیں جنگل میں چاروں طرف پھیل گئی تھیں۔ حمرہ تیورا کر نیچے گرنے لگی جب کسی کے ہاتھوں نے اسے سنبھال لیا۔ اندھیرے کی سیاہ چادر نے حمرہ کے حواسوں کو ڈھانپ لیا تھا۔

☆☆☆

حمرہ کی آنکھ کھلی تو اس کی طبیعت کچھ سنبھل چکی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو بابا جان اس کے سرہانے بیٹھے قرآن پڑھ رہے تھے۔ اسے آنکھیں کھولے دیکھ کر نرمی سے مسکرائے اور اس کے چہرے پر پھونک مارتے ہوئے قرآن شریف بند کر کے دیوار میں بنی چھوٹی سی شیلف میں رکھ دیا۔ حمرہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بابا جان آگے بڑھے اور نرمی سے اس کے ماتھے پر پیار کیا۔

"کیسی ہے میری بہادر بیٹی!" بابا جان نے کہا تو حمرہ تلخی سے مسکرا دی۔

"بہادر کہہ کہہ کر آپ نے مجھے پتھر میں تبدیل کر دیا ہے بابا جان۔ سچ پوچھیں تو آپ کی بیٹی اتنی بہادر نہیں ہے جتنی بننے کی کوشش کرتی ہے۔" حمرہ کا لہجہ پست تھا۔ بابا جان چونکے مگر پھر اس کی حالت کو دیکھ کر مزید سوال جواب کرنے سے گریز کیا۔

"تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔" بابا جان نے تسلی دی تو حمرہ کا دل کیا کہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"میں کہاں ہوں؟"

ڈاکٹر ارم کو اندر آتا دیکھ کر حمرہ چونکی تھی۔ ڈاکٹر ارم نے پاس آ کر حمرہ کو پیار کیا اور پھر اس کی فائل دیکھنے لگیں۔

"تم لاہور میں ہو۔ ابتدائی طبی امداد کے بعد ہم تمہیں ضد کر کے یہاں لے آئے تھے۔ پتا نہیں ان لوگوں کی کیا دشمنیاں ہیں، آپس میں نبٹاتے رہیں۔ ہماری بچی کو بلاوجہ ہی نشانہ بنا لیا۔"

ڈاکٹر ارم نے ناگواری سے کہا تو حمرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اچانک امڈ آنے والے آنسوؤں کو سب کی نظروں سے چھپانا چاہتی تھی۔

"سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ دل کسی کے ساتھ کی تمنا کیوں کرنے لگا ہے۔" حمرہ نے بے بسی سے سوچا تھا۔

☆☆☆

گولی حمرہ کے کندھے پر لگی تھی۔ اس کا دایاں بازو شدید متاثر ہوا تھا۔ بازو میں پٹی بندھی تھی جو گلے کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ حمرہ فی الحال تو اپنے ذاتی کاموں کے لیے بھی دوسروں پر انحصار کر رہی تھی۔ ابھی بھی آپا نے اس کے کپڑے تبدیل کروائے۔ حمرہ نے بے ترتیب بالوں کی کنگھی کرنے کا کہا تو آپا نے اپنی طرف سے اچھا اسٹائل بنانے کے لیے بچوں کی طرح درمیان سے مانگ نکال کر کس کر بال بنا دیے۔ حمرہ نے چھوٹے سے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اسی وقت دروازہ کھول کر سکندر خان اندر داخل ہوا۔ اسے ہنستا دیکھ کر رک گیا۔ حمرہ کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ اس کی نگاہ سامنے پڑی تو سکندر خان کو دیکھ کر ایک دم چپ کر گئی۔ سکندر خان آگے بڑھا۔ شیر دل نے سلام کرتے ہوئے بڑا سا پھولوں کا گلدستہ میز پر رکھ دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ حمرہ نے گردن موڑ کر پھولوں کی طرف دیکھا۔ پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبو نے حمرہ کے اعصاب کو پرسکون کر دیا تھا۔

"میرے پاس تمہارا شکریہ کہنے کے لیے لفظ نہیں ہیں حمرہ!"

سکندر خان نے کمرے کی کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔ وہ کھڑا ہوا تھا۔

"شکریہ تو مجھے کہنا چاہیے، اتنے اچھے پھول لائے ہیں آپ!" حمرہ نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ پھولوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

www.pklibrary.com

سکندر خان نے گردن موڑ کر زرد چہرے کے ساتھ مطمئن لیٹی حمرہ کی طرف دیکھا۔

''کسی کی خاطر اپنی جان پر کھیل جانا۔ اسے کیا کہتے ہیں حمرہ؟''

سکندر خان نے الجھ کر سوال کیا تھا۔ حمرہ نے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا۔

''شاید ہمدردی، جرأت یا......'' حمرہ نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ سکندر خان ان کہے لفظ کو سننے کے لیے منتظر تھا جب دروازہ کھول کر رمشا اور صباحت اندر داخل ہوئیں۔ دونوں کے پیچھے دو ملازم عورتیں پھلوں اور دوسری اشیاء اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوئیں

''کیسی ہیں آپ حمرہ؟'' رمشا کہتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

صباحت کا انداز نارمل تھا مگر اس کی آنکھوں میں تشکر بہت واضح تھا۔ وہ کچھ دیر وہاں بیٹھے۔ جب بابا جان کے ساتھ ڈاکٹر ارم کمرے میں داخل ہوئی۔ سکندر خان نے گرم جوشی سے بابا جان سے ہاتھ ملایا۔ بابا جان کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ وہ سب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔

''انکل! آپ سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ مس حمرہ کی شخصیت اتنی مضبوط اور متاثر کن کیسے ہے۔'' رمشا نے اعتراف کیا تو بابا جان مسکرا اٹھے۔

''پہلے مجھے بھی اس کا بات کا اندازہ نہیں تھا کہ حمرہ گل کتنی بہادر اور باہمت ہے مگر جب سات سال پہلے اس کی ماں قضائے الٰہی سے وفات پا گئی تھی اور اس موقع پر حمرہ نے جس طرح مجھے حوصلہ دیا، مجھے تب اندازہ ہوا تھا کہ میری بیٹی پہاڑوں سے بھی بلند حوصلہ اور عزم رکھتی ہے۔''

بابا جان نے کہا تو سکندر خان چونکا تھا۔ حمرہ کی آنکھیں ماں کے ذکر پر نم ہو گئی۔ کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد بھی بابا جان ان کے اچھے اخلاق کی تعریف کرتے رہے۔ حمرہ کھڑکی سے آتی دھوپ کو دیکھ رہی تھی۔

''کسی وجود کے سائے کے بغیر یہ دھوپ کتنی چبھتی ہے نا!'' حمرہ نے خفگی سے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆

حمرہ ٹھیک ہو کر گھر آ گئی اور سکندر خان کی کبھی کبھار آمد اور پھول لانے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ حمرہ نے نئے سرے سے ہمت جمع کر کے نئی جاب کوشش کرنے لگی۔ اس کے لیے اسے اپنے ڈاکومنٹس کی ضرورت تھی۔ اس لیے حمرہ کو مجبوراً واپس جانا پڑا۔

پرنسپل رخشندہ بانو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ بہت گرم جوشی سے ملیں۔ باقی کولیگز کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ حمرہ کے تمام اسٹوڈنٹ بھی اسے دیکھ کر بہت خوش تھے۔ وہ کالج میں سب سے مل کر اپنا سامان لینے ہوسٹل آ گئی۔ جب وہ سامان لے کر باہر نکلی تو پورچ میں کھڑے شیر دل کو دیکھ کر چونک گئی۔ شیر دل نے مودب انداز میں سلام کیا اور پھر رمشا کا پیغام اسے دیا کہ اسے حویلی بلایا ہے۔

''مگر مجھے واپس جانا ہے۔ میں نے رمشا کو یہاں آنے کو کہا تھا۔'' حمرہ نے ہاتھ میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

''بے فکر رہیں۔ میں آپ کو وقت سے پہلے بس اسٹاپ پر چھوڑ آؤں گا۔'' شیر دل نے یقین دہانی کروائی تو حمرہ سر ہلاتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

''تم بے وقوف لڑکی! تمہیں کس پاگل نے مشورہ دیا تھا کہ حمرہ کو یہاں بلاؤ!''

''مگر آپی! حمرہ نے سکندر بھائی کی جان بچائی تھی اور......'' رمشا نے پریشانی سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رمشا! مت بھولو کہ اس کا ماضی کیا ہے؟ خدا جانے کہ اصل ماجرا کیا تھا؟ وہ خود کسی کے ساتھ گئی تھی یا کوئی ایسے ہی کسی کو کیوں اپنے ساتھ لے جائے گا؟ اور اگر مان بھی لیں کہ وہ مظلوم ہے تو ہمیں کیا لینا دینا

www.pklibrary.com

؟ میں تو شکر ادا کرتی ہوں کہ سکندر بھائی کے سر پر ہمدردی کا بھوت سوار نہیں ہوا۔ کیا انہوں نے دوبارہ حمرہ کا نام لیا؟ یا اس کا ذکر کیا؟ کوئی بھی مرد کسی عورت کے کردار پر لگے داغ کو قبول نہیں کرتا ہے۔ اس لیے تم بھی اپنی ہمدردی......"

صباحت کو احساس ہوا کہ رمشا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا ہے۔ صباحت نے گردن گھما کر دیکھا تو حمرہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بہت اطمینان سے کھڑی تھی۔ صباحت گڑبڑا گئی۔ حمرہ نے گہری سانس لی۔

"بس یا آپ نے کچھ اور بھی کہنا ہے؟" حمرہ کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

"کیوں؟ کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟" صباحت نے تنک کر کہا۔

"نہیں۔ آپ نے وہ ہی کہا ہے جو سب کہتے ہیں۔" حمرہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر آپ بھی دوسروں کی طرح کچھ باتوں سے انجان ہیں۔" حمرہ نے کہا تو صباحت سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پہلی بات تو یہ" کہ میں اپنے ساتھ ہوئے حادثے کی وجہ سے اتنی مضبوط بن گئی ہوں کہ مجھے اب دنیا کی باتیں، طعنے، تبصرے، اندازے، پہلے کی طرح دکھ نہیں دیتے ہیں۔ ہاں مگر مجھے ان کی عام ذہنیت پر افسوس ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کی ذہنیت پر ہو رہا ہے......" حمرہ نے کہا تو صباحت تلملا کر رہ گئی۔ "دوسری بات، آپ کے بھائی کی پسند جانتے ہوئے بھی میں بہت پہلے اس رشتے سے انکار کر چکی ہوں۔ پھر آپ کو یہ خوف یا ڈر کیوں ہے کہ میں آپ کے بھائی کو پھنسانے کے لیے ایسا کچھ کروں گی۔ شادی کرنا میرا مسئلہ یا خواہش نہیں ہے محترمہ، کہ جس کے لیے میں کسی بھی حد تک چلی جاؤں گی۔ مجھے جینا ہے۔ اپنی روح پر لگے ہر زخم کے ساتھ۔ یہ آزمائش میرے رب نے میرے لیے چنی ہے۔ اور میرا رب ہی مجھے ہمت دینے والا ہے۔"

حمرہ نے کہا اور رمشا پر ایک نظر ڈال کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ رمشا کو ایک دم ہوش آیا اور وہ تیزی سے حمرہ کے پیچھے بھاگی تھی۔

"رکیے مس حمرہ!" رمشا کے پکارنے پر حمرہ کے قدم سست ہوئے مگر اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"رمشا! مجھے دیر ہو رہی ہے!" حمرہ نے گھڑی میں وقت دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

"میں آپ کو بس اسٹاپ تک چھوڑنے جا سکتی ہوں۔ پلیز منع مت کیجیے گا۔"

رمشا نے منت کرتے ہوئے کہا تو حمرہ نے سر ہلا دیا۔ بس اسٹاپ بیس منٹ کے فاصلے پر تھا۔ مطلوبہ مقام پر حمرہ گاڑی سے نیچے اتری تو رمشا نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کچھ دیر تک علی مجھے لینے آ رہا ہے۔ جانے سے پہلے میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔"

"پلیز، ہمیں معاف کر دیجیے گا۔ شاید ہم بہت کمزور لوگ ہیں جو دنیا کے ڈر سے آپ کا ساتھ نہیں دے سکے۔"

حمرہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ رمشا کا ہاتھ تھپتھپایا اور دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئی۔ زندگی کا ایک اور اہم باب یہاں ختم ہو گیا۔

☆☆☆

"تم آج بہت خوش ہو ارم!"

اپنا مکمل چیک اپ کروانے کے بعد جب ذیشان ڈاکٹر ارم کے کمرے میں داخل ہوا تو اسے فون پر بات کرتے ہوئے بے تحاشا خوش ہوتے دیکھ کر بے اختیار کہنے لگا۔ ارم نے فون بند کر کے میز پر رکھا اور اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھا۔ جس کے چہرے پر گزرتے وقت کے ساتھ تیزی سے زردی چھا رہی تھی۔

"ہاں ایک طرف اپنی بیٹی حمرہ کے اسکالرشپ ملنے کی خوشی ہے اور دوسری طرف......"

ڈاکٹر ارم نے گہری سانس لے کر سامنے رکھی

www.pklibrary.com

فائل کی طرف دیکھا۔ جس کے اوپر سرخ روشنائی سے ذیشان کا نام لکھا ہوا تھا۔ ذیشان نے اطمینان سے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"بہت لمبا سفرا کیلے کاٹا ہے ارم۔ اب یہ دل تھکنے لگا ہے۔ تمنا صرف یہ ہی ہے کہ اس دل کی دھڑکن رکنے سے پہلے حمرہ گل کو کسی ایسے شخص کے سنگ رخصت کردوں جو اس کے سب زخموں پر اپنی مسیحائی کا مرہم رکھنا جانتا ہو۔ جو حمرہ گل کو اتنی ہی محبت اور توجہ دے، جتنی میں نے اسے دی ہے۔ کوئی ایسا شخص جو میرے بعد میری حمرہ گل کو بکھرنے سے سمیٹ لے۔ میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی بہت بہادر ہے۔ مگر ہر والدین کی طرح میری اور افشاں کی بھی یہ ہی خواہش تھی کہ حمرہ گل زندگی کا سفر اکیلے نہ گزارے۔" ذیشان نے دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ ارم خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔ "مجھے آج بھی یاد ہے ارم۔ جب مجھے لگنے لگا تھا کہ زندگی کے بکھرے پزل ہم تینوں پھر سے مل کر جوڑ کر ایک مکمل تصویر بنالیں گے۔ حمرہ گل نے اپنی تعلیم کا ٹوٹا ہوا سلسلہ پھر سے جوڑ لیا تھا۔ وہ ڈاکٹر بننے کے خواب کو تو ہار گئی تھی مگر وہ زندگی میں آگے بڑھنا نہیں بھولی تھی۔ افشاں کی حالت بھی بہتری کی طرف تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا۔ جب یونیورسٹی میں میرے ایک دوست کی بیٹی نے داخلہ لیا اور میں جو یہ سمجھ رہا تھا کہ حمرہ گل کے ماضی پر اب ہمیشہ پردہ پڑا رہے گا، وہ سوچ غلط نکلی۔ اس لڑکی نے ہمدردی یا ترس میں وہ بات ایک سے دوسرے کو بتائی اور یوں [illegible] وہ بات پھر سے سب کی زبان پر عام ہوگئی۔ میں جو ڈر رہا تھا کہ حمرہ گل نجانے کیا کرے گی! تم جانتی ہو اس نے یہ سب سن کر کیا کیا؟" ذیشان نے ایک لمحے کو توقف لیا۔

"اس بار حمرہ گل نے لوگوں کا سامنا برداشت سے کیا اور یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ خود اس بات کو مان لیتی کہ وہ عام لوگوں کی طرح نہیں ہے۔ اسے رب نے کسی خاص مقصد یا آزمائش کے لیے چنا ہے۔ حمرہ گل نے اس بات کو سمجھ لیا۔ میں نے سوچا کہ پھر سے شہر بدر ہو جاؤں مگر حمرہ گل نے سخت مخالفت کی کہ "بابا جان! شہر بدر ہونے سے ہم نصیب کی کالک کو نہیں دھو سکتے ہیں! میری بس ایک ہی خواہش ہے کہ میں اپنے مجرم کو سزا ضرور دلواؤں۔" حمرہ گل نے کئی بار اس عزم کا اظہار کیا تھا مگر میں ہر بار ٹال جاتا۔ شاید مجھے ابھی بھی دنیا کا خوف تھا۔ کہ میری بیٹی عدالت میں، میڈیا، اخبارات کی زینت بن جائے گی۔ ابھی جو تھوڑی بہت امید تھی کہ میں حمرہ گل کے لیے کوئی اچھا جیون ساتھی ڈھونڈ ہی لوں گا، وہ امید تب بالکل ختم ہو جاتی۔"

"اور مجھے تمہاری اس سوچ پر اس وقت بھی حیرت ہوئی تھی اور آج بھی۔ کیا یہ وہ ذیشان ہے جو ایک غیر لڑکی کے ساتھ ہوئی زیادتی پر غم و غصے سے پاگل ہو گیا تھا اور اس کے مجرم کو سزا دلوانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار تھا۔"

ڈاکٹر ارم نے کہا تو ذیشان کے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہاں میں ان کی دھمکی سے ڈر گیا تھا۔ مجھے بھی کبھی اندازہ نہیں ہوسکا کہ ایک بیٹی کا باپ بن کر میں اتنا کمزور ہو جاؤں گا۔ میرے غصے اور نفرت کے آگے میری بیٹی کا مستقبل آ کھڑا ہوا۔ میں شاید اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کی لالچ میں خودغرض بن کے سوچنے لگا تھا۔ وہ اچھا مستقبل جو میں [illegible] دے ہی نہیں سکا....." ذیشان نے افسردگی سے اپنی ہار کا اعتراف کیا تھا۔ "اب اکثر میں سوچتا ہوں کہ کاش میں اس وقت ان لوگوں کا سامنا کرتا۔ یا حمرہ گل کی بات مان کر اس کے مجرم کو ہی سزا دلوانے کی کوشش کرتا تو آج یہ پچھتاوا تو نہیں ہوتا کہ میں اپنی بیٹی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔ میں پڑھا لکھا سمجھدار ہو کر بھی کم عقل اور جاہل لوگوں کی طرح اپنی بیٹی کے دامن پر لگے داغ کو سب سے چھپاتا، نگر نگر پھرتا رہا مگر پھر بھی اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔ میں کیسا باپ ہوں ارم، جب حمرہ گل نے اپنے مجرم کے

www.pklibrary.com

خلاف قدم اٹھانے کا سوچا تب ہی ہم پر یہ جان لیوا انکشاف ہوا کہ افشاں کو بلڈ کینسر ہے۔ وہ بھی آخری اسٹیج پر۔ میں اور حمرہ گل سب کچھ بھول بھال کر افشاں کے علاج میں لگ گئے مگر ہماری کوئی بھی کوشش، اسے زندگی کی طرف نہیں لا سکی۔" ذیشان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"اور یہ روگ ہی تمہارے دل کو آہستہ آہستہ کمزور کر رہے ہیں ذیشان۔ تمہاری رپورٹس ٹھیک نہیں ہیں۔ اگر تم اسی طرح لاپروائی کرتے رہے تو۔" ڈاکٹر ارم نے فکرمندی سے کہا۔

"اس دل میں اب کوئی تمنا باقی نہیں رہی ہے ارم، سوائے اپنی بیٹی کو مضبوط پناہ گاہ میں دیکھنے کے۔ مگر شاید میری یہ خواہش آخری سانس کی حسرت بن کر ساتھ ہی جائے گی۔" ذیشان نے مایوسی سے کہا تھا۔

"ذیشان مایوس مت ہو! تمہاری بیٹی حمرہ گل کے نام پر ہی میں نے اپنی بیٹی کا نام حمرہ رکھا تھا۔ اور جس طرح آج میری بیٹی زندگی میں کامیاب اور محفوظ ہے مجھے پورا یقین ہے کہ اللہ تمہاری حمرہ گل کے لیے بھی بہت اچھا کرے گا۔ بس مایوس مت ہو! اور اپنا بہت خیال رکھو۔"

ڈاکٹر ارم نے نرمی سے کہا تو ذیشان نے مسکراتے ہوئے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"حمرہ گل واپس کب آ رہی ہے؟ ملائیشیا نور کی تصاویر بھیجتی رہی ہے مجھے۔ اس کا کورس بھی کامیابی کے ساتھ مکمل ہو گیا ہے۔ ماشاءاللہ بہت خوش ہے وہ۔"

ڈاکٹر ارم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ حمرہ گل ایک بڑے ادارے میں لیکچرر کی جاب کر رہی تھی اور اسی ادارے کے تحت ہونے والے ایک بین الاقوامی کورس کے سلسلے میں پچھلے چھ مہینے سے ملائیشیا میں تھی۔

"ڈیئر ارم! حمرہ سے میری بیماری کے بارے میں کوئی بات مت کرنا۔ بچی پریشان ہو جائے گی۔"

ذیشان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایک شرط پر۔ اگر تم اپنا خیال رکھو تو۔"

ڈاکٹر ارم نے وارننگ دیتے ہوئے کہا تو ذیشان سر ہلاتا وہاں سے چلا گیا۔ جبکہ ڈاکٹر ارم نے ذیشان کی فائل پر افسردگی سے نگاہ ڈالی تھی۔

"کاش میرے بس میں ہوتا ذیشان تو میں تمہاری ہر خواہش جادو کی چھڑی گھما کر پوری کر دیتی مگر افسوس۔ یہ زندگی ہے جہاں نہ میں پری ہوں اور نہ تم کھوئے ہوئے شہزادے۔ ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو حقیقت کے تلخ ذائقے۔" ڈاکٹر ارم نے خودکلامی کی تھی۔

☆☆☆

حمرہ گل ملائیشیا سے واپس آئی تو بہت فریش اور خوش تھی۔ بات بے بات ہنستی مسکراتی حمرہ گل پہلے سے زیادہ پر اعتماد ہو گئی تھی۔ ذیشان اس کی خوشی میں خوش تھا۔ حمرہ گل نے کچھ دن آرام کیا اور پھر سے زندگی معمول پر آ گئی۔ صبح بابا جان کو ناشتا دے کر وہ زرینہ کو دوپہر کے کھانے کے بارے میں ہدایت دے کر یونیورسٹی چلی جاتی۔ ذیشان کو ریٹائرڈ ہوئے ایک عرصہ گزر گیا تھا مگر اس کے پاس اب بھی بہت سے طالب علم آتے تھے۔ جنہیں وہ خوش دلی سے خوش آمدید کہتا۔ اس طرح ان کا دن بھی اچھا گزر جاتا تھا۔ ایک دن حمرہ کو گھر سے گئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی جب وہ واپس آ گئی۔ ذیشان صحن میں توتوں کے پنجرے کے پاس کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہا تھا۔ حمرہ کی گاڑی دیکھ کر چونکا۔

"کیا ہوا حمرہ! تمہاری طبیعت ٹھیک ہے۔"

حمرہ پریشان چہرہ لیے اندر داخل ہوئی۔ حمرہ اندر جاتے ہوئے رک کر بابا جان کے چہرے کی طرف خالی خالی نظ... رزنی سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ ان کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بابا جان! کیا آپ جانتے ہیں کہ سکندر خان!"

ذیشان نے چونک کر حمرہ گل کے چہرے کی

www.pklibrary.com

طرف دیکھا۔ جہاں کچھ کھو دینے کا ملال بہت واضح تھا۔ ذیشان کو کچھ کلک کیا۔

"ہاں اخبار میں پڑھا تھا کہ......" ذیشان آہستہ آواز میں تفصیل بتانے لگا۔ حمرہ گل سر جھکائے سنتی رہی۔

"زرینہ!" ذیشان خاموش ہوا تو حمرہ گل نے آواز دی۔ زرینہ کچھ دیر کے بعد کچن سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی نکلی۔

"جی گل بی بی!" زرینہ نے پوچھا۔

"مجھے پچھلے تین مہینے کے سب اخبار چاہئیں!" حمرہ گل نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا اور اندر چلی گئی۔ ذیشان پرسوچ انداز میں اخبار پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔

"کیا حمرہ، سکندر خان کو پسند کرتی ہے؟"

ایک سوال بار بار ذیشان کے ذہن میں سر اٹھا رہا تھا۔ جس کو جواب اس کا دل تو ہاں میں دے رہا تھا مگر پھر سامنے پھیلا قسمت کا ایک طویل جال تھا۔ جس سے نکلنا ان کے لیے آسان نہیں تھا۔

☆☆☆

بڑی سی کالی چادر میں چہرہ چھپائے، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی پولیس اسٹیشن کی حدود میں داخل ہوئی تو احاطے میں موجود شیر دل کو دیوار کے ساتھ کھڑا سگریٹ کا دھواں ہوا میں اڑاتا ہوا دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی۔ شیر دل کی تیز نگاہ نے اس کا چونکنا محسوس کرلیا۔ اس لیے وہ اسے گھورنے لگا۔

"کیسے ہو شیر دل؟" جانی پہچانی نسوانی آواز پر شیر دل چونکا۔

"حمرہ بی بی! آپ اور یہاں؟" شیر دل نے حیرت سے سوال کیا۔

"تمہارے صاحب سے ملنے آئی ہوں۔" حمرہ گل نے چہرے پر سے نقاب ہٹایا۔

"مگر ملاقات کا وقت تو ختم ہو گیا ہے۔" شیر دل نے کہا۔

"مجھے ہر حال میں سکندر خان سے ملنا ہے۔" حمرہ گل نے ضدی لہجے میں کہا۔

"اچھا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔" شیر دل نے سر ہلایا اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا۔

"اجازت مل گئی ہے۔" شیر دل نے مودب انداز میں حمرہ گل کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔

اپنے خیال کو مجسم دیکھ کر سکندر خان کتنی دیر ہی چپ چاپ حمرہ گل کو دیکھتا رہا۔ پھر گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھا۔

"آخر تم تک خبر پہنچ ہی گئی۔" سکندر خان نے سلاخوں کے پاس آکر کہا۔ سلوٹ زدہ عام سے کپڑوں میں، بڑھی شیو اور سرخ آنکھوں کے ساتھ سکندر خان، بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

"کیا مطلب؟" حمرہ گل نے الجھے انداز میں پوچھا۔

"مجھے یقین تھا کہ جب تمہیں پتا چلے گا تم مجھ سے ملنے ضرور آؤ گی۔ دیر سے ہی سہی تم آئیں یہ ہی بہت ہے۔" سکندر خان نے اداسی سے کہا۔ حمرہ گل کی آنکھوں میں ہلکی سے نمی پھیل گئی۔

"یہ سب کیسے ہوا سکندر خان؟ آپ کا کردار تو بے داغ اور شفاف تھا آپ کسی پر قاتلانہ حملہ کیسے کر سکتے ہیں؟" حمرہ گل نے حیرت سے سوال کیا۔

"حمرہ! ہم جاگیرداروں کی زندگی میں یہ سب بہت معمولی باتیں ہیں۔" سکندر خان نے لاپروائی سے کہا۔

"ہاں مگر میرا دل کہتا ہے کہ آپ کوئی غلط کام نہیں کر سکتے۔" حمرہ گل نے یقین سے کہا تو سکندر خان اس کے چہرے پر پھیلے اضطراب کو دیکھتا رہا۔

"مان لو۔ یہ ہی سچ ہے۔" سکندر خان نے نظریں چرائی تھیں۔

"کیسے مان لوں۔ سچ وہ ہے جو میرا دل کہہ رہا ہے کہ سکندر خان بے گناہ ہے۔" حمرہ گل اپنی بات پر قائم تھی۔

"اگر بے گناہ بھی ہوں تو پھر بھی میں کسی اپنے کے لیے سولی چڑھنے کو تیار ہوں۔ تم سے ہی سیکھا ہے

حمرہ گل کہ انسان جسے اپنی جان سے زیادہ چاہتا ہے، اس کی بقا کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔ مجھے مت روکو۔"

سکندر خان نے ہلکی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا تو حمرہ گل چپ چاپ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ دیر معنی خیز خاموشی دونوں کے درمیان رہی۔

"میں نہیں جانتی کہ سچ کیا ہے؟ مگر میرا وعدہ ہے کہ میں سکندر خان کو ایسے ہی ان سلاخوں کے پیچھے گل گل کر مرنے کے لیے نہیں چھوڑوں گی۔"

حمرہ گل نے عہد کرتے ہوئے کہا اور واپس پلٹ گئی۔

"شیر دل!" سکندر خان نے پکارا تو شیر دل ایک لمحے میں حاضر ہو گیا۔

"خیال رکھنا!" سکندر خان نے حمرہ گل کے پیروں کے نشان کی طرف اشارہ کیا تو شیر دل نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔

وہاں سے حمرہ حویلی پہنچی تو حویلی کے گیٹ پر موجود چوکیدار نے اسے پہچان کر فوراً سلام کیا اور گیٹ کھول دیا۔ حمرہ ٹرالی بیگ کو کھینچتی ہوئی روش پر چلنے لگی۔ حویلی کے دروازے پر موجود ملازمہ نے اسے دیکھا اور جلدی سے پاس آئی۔

"آپ چھوٹی بی بی کی استانی ہیں ناں؟" حمرہ نے اثبات میں سر ہلایا تو ملازمہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئیں۔ چھوٹی بی بی تو......" کسی کے قدموں کی چاپ سن کر ملازمہ چپ کر گئی۔

"کون ہے جھومر؟" دروازے پر صباحت کا چہرہ نمودار ہوا۔ حمرہ گل کو دیکھتے ہی پہلے وہ حیرت سے گنگ رہ گئی۔

"تم اور یہاں؟" صباحت نے حیرت سے کہا اور پھر ملازمہ کو اشارہ کیا۔

"انہیں گیسٹ روم میں لے جاؤ۔ اور خاص خیال رکھنا۔ کسی چیز کی کمی نہ ہو۔" صباحت نے اس طرح کہا جیسے حمرہ گل کا مقصد صرف یہاں رہنا ہو۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے صباحت۔"

حمرہ گل نے مضبوط انداز میں کہا۔ صباحت نے سر ہلایا۔

"ہاں باتیں تو مجھے بھی کرنی ہیں مگر ابھی دوپہر کے کھانے کا وقت ہے، تم فریش ہو جاؤ!" صباحت نے کہا اور واپس مڑ گئی۔

ملازمہ نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ حویلی کے اندر ہی ایک شاندار کمرا حمرہ گل کو رہنے کے لیے دیا گیا۔ حمرہ فریش ہو کر اور وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو جھومر کمرے میں داخل ہوئی۔

"استانی جی! آپ کو بڑی بی بی بلا رہی ہیں۔"

حمرہ نے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

بڑی سی میز پر کھانے کے مختلف لوازمات سجے ہوئے تھے اور کھانے والے صرف دو لوگ تھے۔ صباحت اور حمرہ گل۔ حمرہ گل نے ایک طائرانہ نظر سجی ہوئی میز پر ڈالی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ پاس کھڑی ملازمہ صباحت کے اشارے پر کھانا سرو کرنے لگی۔ حمرہ کو بے ساختہ رمشا کی شادی کے ہنگامے یاد آئے۔ اس وقت حویلی میں اتنی رونق تھی کہ ہر طرف ہنسی اور شور سنائی دیتا تھا۔ حمرہ گل ماضی میں جھانکتی آہستہ آہستہ نوالے توڑ رہی تھی۔

"کیا کھانا پسند نہیں آیا؟" صباحت نے اس کے انداز پر چوٹ کی۔

"آں۔ کھانا ہمیشہ کی طرح بہت مزے دار ہے۔ میں حویلی میں چھائی خاموشی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رمشا کی شادی میں کتنی رونق لگی ہوئی تھی!"

حمرہ گل نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو صباحت کا چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔

"جب اچھا وقت ہمارے پاس ہوتا ہے، تب ہمیں اس کی قدر ہی نہیں ہوتی!" صباحت نے افسردگی سے کہا۔

www.pklibrary.com

''ان شاء اللہ! اچھا وقت پھر سے آئے گا۔''
حمرہ گل نے یقین سے کہا تو صباحت اسے دیکھتی رہ گئی۔

اس سے پہلے صباحت کچھ کہتی شمشاد بھاگتی ہوئی آئی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''چھوٹی بی بی نے کھانا کھاتے ہوئے اچانک شیشے کا گلاس توڑا اور اپنی کلائی پر پھیر لیا، جلدی سے ڈاکٹر فون کریں۔''

''چھوٹی بی بی یعنی کہ رمشا۔'' حمرہ گل کو جیسے ہی سمجھ آئی وہ بھی تیزی سے صباحت کے پیچھے بھاگی تھی۔

☆☆☆

رمشا کو دوائیوں کے زیر سایہ گہری نیند سلا کر دونوں آتش دان کے پاس بیٹھی تھیں۔

''صباحت! آپ کی خاموشی میرے سوالوں کو ختم نہیں کرے گی۔ مجھے سچ جاننا ہے۔ وہ سچ جو سکندر خان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے گیا، وہ سچ جو رمشا جیسی زندہ دل اور چنچل لڑکی کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مجھے وہ سچ سننا ہے۔''

حمرہ گل نے ضدی لہجے میں کہا۔ صباحت نے ٹشو پیپر سے آنکھ کی نمی صاف کی۔

''میرے پاس کہنے کے لیے کچھ زیادہ تو نہیں ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ شاید یہ میرے ان بڑے بولوں کا نتیجہ تھا جو میں نے تمہارے کردار پر انگلی اٹھاتے ہوئے کہے تھے۔ کسی انسان کو زندگی میں بھلے شامل مت کریں مگر کبھی اسے حقیر سمجھ کر دھتکاریں مت۔ اسے انسانیت کے مقام سے گرائیں مت، وہ عزت ضرور دیں جو اس کا حق ہے، کیچڑ ہمیں میلا ضرور کر دیتا ہے مگر وہ کیچڑ کسی انسان کی پہچان یا اس کا کردار نہیں ہوتا ہے۔''

صباحت بولنے پر آئی تو بغیر رکے بولتی ہی چلی گئی۔

''جس دن تم آخری بار یہاں آئی تھیں، اس دن رمشا تم نے کچھ خاص بات شیئر کرنا چاہتی تھی مگر میری جلد بازی کی وجہ سے اس کی خوشی کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔'' صباحت نے افسردگی سے کہا۔

''کیسی خوشی؟'' حمرہ گل نے حیرت سے پوچھا۔

''ماں بننے کی۔ رمشا امید سے تھی۔'' صباحت نے گیلی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ حمرہ حیرت سے اسے سن رہی تھی۔

''رمشا کو ماں بننے کی خوشی کیا ملی اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ علی بھی خوشی سے بے حال ہو کر اسے لینے آ رہا تھا۔ جب رمشا تمہیں چھوڑ کر واپس آ رہی تھی تو راستے میں کچھ لوگوں نے ان کی گاڑی پر فائرنگ کر دی۔ گاڑی کے ساتھ دو گارڈز بھی تھے۔ گارڈز نے نامعلوم دشمنوں کا مقابلہ جم کر کیا۔ رمشا بہت خوف زدہ تھی۔ اس نے سکندر خان کو کال ملائی۔ سکندر خان جو کام سے فارغ ہو کر حویلی لوٹ رہا تھا اس نے فوراً فون ریسیو کر لیا مگر رمشا کی آواز کے بجائے جب اسے گولیاں چلنے اور رمشا کے چیخنے چلانے کی آواز آئی تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دیوانہ وار بھاگا تھا۔ شیر دل کے ساتھ گارڈز سے بھری تین گاڑیاں بھی تھیں۔ وہ جائے وقوعہ پر جب پہنچے، دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں گارڈز جاں بحق ہو چکے تھے جبکہ رمشا کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔''

صباحت کافی کے مگ کو دیکھتے ہوئے ماضی میں پہنچ گئی تھی۔

☆☆☆

''وہ لوگ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، ٹریس کروانہیں۔''

سکندر خان غصے سے دھاڑا۔ دوسری طرف رمشا کو لینے تایا جان اور تائی اماں کے ساتھ ساتھ علی بھی پہنچ گیا اور جب انہیں یہ خبر ملی کہ رمشا اغواء ہو گئی ہے تو علی غم اور غصے سے بھر گیا۔

سکندر خان اپنے ساتھیوں کے ساتھ رمشا کی

www.pklibrary.com

تلاش میں نکل گیا۔ پولیس سے ابھی اس خبر کو چھپایا جا رہا تھا۔ کیونکہ سکندر خان اپنے خاندان کی عزت کو نہیں اچھالنا چاہتا تھا۔ مگر پولیس تک کسی لڑکی کے اغواء کی خبر چوہدری یعقوب کے لوگوں نے پہنچا کر انہیں الرٹ کر دیا تھا۔ اس لیے اوپر سے لے کر نیچے تک ہر فرد حرکت میں آ گیا تھا۔ سکندر خان جس کا یہ علاقہ تھا اور اب تو وہ مضبوط سیاسی پوزیشن کا مالک تھا ۔اس کی بہن کو یوں سر عام اغواء کر لینا کوئی چھوٹی بات نہیں تھی مگر مسلسل ناکامی اور انتقام کی آگ میں جلتا ولی احمد غصے میں قدم اٹھا بیٹھا۔

جبکہ رمشا کی تلاش میں ناکام سکندر خان غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح رمشا تک پہنچ جائے اور اس پر بری نظر ڈالنے والوں کو فنا کر دے۔

صباحت کو کچھ ہوش آیا تو وہ سجدے میں گر کر رمشا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی ۔ اس رات صباحت نے جانا کہ قیامت کسے کہتے ہیں؟ ابھی رمشا بازیاب بھی نہیں ہوئی تھی اور لوگوں کی باتیں، تبصرے، سرگوشیاں، معنی خیز اشارے، صباحت کا دل چیر رہے تھے۔

صبح کے قریب سکندر خان کو امید افزاء خبر ملی۔ رمشا جس جگہ تھی، وہ ٹریس کر لی گئی تھی۔ پولیس تک اطلاع پہنچنے سے پہلے ہی سکندر خان اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔

دشمنوں کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اتنی جلدی وہ ٹریس ہو جائیں گے ۔ بوکھلاہٹ میں فائرنگ کا تبادلہ ہوا، جو کافی دیر تک جاری رہا۔ فتح سکندر خان کا نصیب بنی۔ رمشا کو تہ خانے سے بے ہوشی کی حالت میں بازیاب کروالیا گیا۔ پولیس کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ساری صورت حال سکندر خان کے کنٹرول میں آ چکی تھی۔

''خیال رہے! رمشا کا نام سامنے نہ آئے!''

سکندر خان نے شیر دل کو سختی سے ہدایت دی۔ شیر دل نے اثبات میں سر ہلایا۔ پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے ہی سکندر خان رمشا کو وہاں سے لے کر جا چکا تھا۔ پولیس آئی تو رسمی کارروائی کرتے ہوئے زخمی افراد کو گرفتار کرنے لگی۔ قیامت کی ایک رات تھی جو آئی اور پھر ٹھہر گئی!

صباحت نے شکر ادا کیا کہ رمشا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔ سکندر خان نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ، رمشا کا نام پولیس کے سامنے آنے سے روک دیا تھا اور یہ ظاہر کیا کہ اس کے علاقے کی کسی لڑکی کو اغواء کیا گیا۔ پولیس کی طرف سے مکمل کارروائی کرنے پر زور دیا جا رہا تھا۔ وہ متاثرہ خاندان تک رسائی حاصل کرنا چاہ رہے تھے مگر سکندر خان تفصیل میں جانے سے انکاری تھا۔ سکندر خان بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ان سب کے پیچھے چوہدری یعقوب کے بیٹے ولی احمد کا شیطانی ذہن ہے۔ سکندر خان پر پے در پے ہونے والے جان لیوا حملے جب کامیاب نہیں ہوئے تو ولی احمد نے سکندر خان کی دکھتی رگ کو ڈھونڈا تھا۔ سکندر خان خود پر آئی ہر بات برداشت کر گیا مگر رمشا کے معاملے میں وہ کنٹرول کھو رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جس دن بھی ولی احمد اس کے سامنے آیا، وہ اسے گولیوں سے بھون دے گا۔

دوسری طرف سکندر خان کے اعصاب پر خاندان میں ہونے والی باتوں کی وجہ سے بہت دباؤ تھا۔ کئی دن گزرنے کے باوجود علی یا اس کی فیملی کی طرف سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ سکندر خان ساری ساری رات جاگ کر رمشا کے بارے میں سوچتا رہتا ۔اس کی معصوم بہن بدنامی کے گہری قبر میں زندہ اتر رہی تھی ۔ سکندر خان مضبوط پوزیشن کا مالک تھا، طاقت ور تھا، اس نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر جہاں تک ممکن ہو سکا رمشا کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی مگر رمشا کی طرح دوسری لڑکیاں جو اس ظلم کا شکار ہوتی ہیں، ان پر حیات کتنی تنگ ہوتی ہوگی۔

سکندر خان جیسے جیسے سوچتا، اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی ۔ اس کی آنکھوں کے آگے بھی رمشا

www.pklibrary.com

کا چہرہ ابھرتا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر روتی حمدہ گل کا!
وہ حمدہ گل جس کا ماضی جان کر وہ اپنی محبت کی چادر سے اسے ڈھانپ نہیں سکا۔

شادی کے بعد میں رمشا کو پہلی بار علی کی طرف سے بے رخی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ علی کے رویے سے صرف رمشا ہی پریشان نہیں تھی، صباحت اور سکندر خان کے ماتھے بھی ٹھنکے تھے۔ صباحت تو پہلے ہی تائی اماں اور خاندان کی دوسری عورتوں کے بدلے ہوئے رویے محسوس کر کے خوف زدہ تھی۔ اب ان کی طرف سے مسلسل خاموشی اور نظر اندازی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہا تھا۔ جبکہ رمشا نے سسرال واپس جانے کی رٹ لگا دی۔ سکندر خان پریشان تھا کہ وہ کیسے رمشا کو واپس چھوڑ کر آئے جبکہ دوسری طرف سے مسلسل خاموشی تھی۔ علی رمشا کا فون بھی ریسو نہیں کر رہا تھا۔ رمشا کے دل کو عجب بے چینی لگی ہوئی تھی۔ اس کی چھٹی حس کسی خطرے کی طرف نشان دہی کر رہی تھی۔

اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے۔ رمشا کا رونا، بے چین رہنا سکندر خان کو پاگل کر رہا تھا۔ اس کا ضبط آخری سرحد پر آ کھڑا ہوا تھا۔ جس بہن کو خوش دیکھنے کی تمنا اس نے دن رات کی تھی، جس بہن کی خوشیوں کی حفاظت کرنے کی قسم اس نے اپنے مرے والدین کی قبر پر کھائی تھی۔ اب اسے کیسے روتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

''صبح تائی اماں کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ رمشا کی ان کے گھر میں اب کوئی جگہ نہیں ہے۔''

صباحت نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ سکندر کو بتایا جو ابھی حویلی کے اندر تھکا ہارا داخل ہوا تھا۔ سیڑھیاں اترتی رمشا ٹھٹک کر رک گئی۔

''کیوں؟'' سکندر خان ایک دم چلایا۔

''اس لیے کہ انہیں اب رمشا کی پاک دامنی پر یقین نہیں رہا ہے۔'' صباحت کہتے ہوئے ہچکیوں کے ساتھ رو پڑی۔ سکندر خان کا چہرہ سرخ ہوا اور اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لی۔

''سب بکواس ہے میری بہن پر جو بھی انگلی اٹھائے گا میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا!''

سکندر خان غصے سے دھاڑا تھا۔ اسی وقت اس کی نظر زرد چہرا لیے کھڑی رمشا پر پڑی۔ وہ چونکا۔ صباحت نے بھی گردن موڑ کر دیکھا اور پریشان ہو گئی۔

''بھائی!'' رمشا کے ہونٹ کپکپائے، اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''رمشا!''

سکندر کی چھٹی حس نے الارم دیا۔ اسی وقت رمشا کو شدید چکر آیا اور وہ لہراتی ہوئی سیڑھیوں سے لڑھکتی نیچے گری۔

رمشا کا مس کیرج ہو گیا۔ رمشا ہوش میں آئی تو یہ خبر اس کے کمزور اعصاب پر بجلی بن کر گری۔ وہ دیوانہ وار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے بے دردی سے ڈرپ کھینچ دی۔ ہاتھ مار کر چیزیں گرا دیں۔ وہ کسی کے قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ نرس نے بمشکل اسے نیند کا انجکشن لگایا۔ رمشا کے سسرال تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی مگر وہاں سے پھر بھی کوئی نہیں آیا تھا۔

''سکندر بھائی! یہ ہمارے ساتھ کیا ہو گیا؟ ہماری پھولوں جیسی بہن پر غم کا اتنا بڑا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ وہ زندہ کیسے رہے گی۔''

صباحت تھک کر رونے لگی تھی۔ سکندر خان نے خود پر ضبط کرتے ہوئے اس کا سر تھپتھپایا تھا۔

سکندر نے ولی احمد کے خلاف رپورٹ درج کروادی۔

☆☆☆

دوسرے دن سکندر خان اور تیمور جب پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئے تو وہاں چودھری یعقوب اپنے بندوں کے ساتھ موجود تھا۔ ولی احمد اور سکندر خان کے درمیان بڑھتی جنگ کو ختم کرنے کے لیے ہی پولیس ایس ایچ او بشیر جاوید نے ان دونوں کو بلایا تھا۔ سکندر خان کافی دیر سے وہاں پہنچا اس لیے چودھری یعقوب غصے میں واپس جانے کے لیے اٹھ

www.pklibrary.com

گیا۔ گاڑی کے پاس کھڑے ولی احمد کی آنکھوں میں تیز چمک ابھری تھی جب اس نے سکندر خان کو آتے ہوئے دیکھا۔ وہ شوخ انداز میں سیٹی بجاتا ہوا سکندر خان کے پاس گیا۔ تیمور چند قدم آگے تھا۔ سکندر خان نے ولی احمد کو استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے دیکھا تو اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔

"سکندر خان! اونچی پگڑی اور شملہ والا۔ انصاف پسند آقا۔ اب بتاؤ اپنی عزت کیسے واپس لاؤ گے؟ میں تو اس کیس سے صاف بچ جاؤں گا مگر تم کیا کرو گے؟ کیسے ثابت کرو گے کہ اس سب کے پیچھے میں تھا۔" ولی احمد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"میں کسی کو ثابت نہیں کروں گا ولی احمد۔" سکندر خان نے سخت لہجے میں کہا۔

"مطلب؟"

ولی احمد نے الجھ کر پوچھا۔ اسی وقت ولی احمد کی نظر سکندر خان کے جیب کی طرف رینگتے ہوئے ہاتھ پر پڑی۔ وہ چونکا اور فوراً پلٹ کر بھاگا۔

"بابا سائیں!"

ولی احمد کی چیخ کے ساتھ ہی فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔ لینڈ کروزر میں بیٹھا چوہدری یعقوب ہڑبڑا کر باہر نکلا۔ سرخ اینٹوں کے فرش پر ولی احمد خون میں لت پت پڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی حفاظت پر مامور ایک گارڈ بھی۔ اندر موجود پولیس کے افراد باہر نکل آئے اور سکندر خان کو اسلحے سمیت حراست میں لے لیا۔ تیمور ہکا بکا کھڑا یہ سب دیکھتا رہ گیا۔ چودھری یعقوب اپنے زخمی بیٹے کو لے کر ہسپتال کی طرف بھاگا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا سکندر خان۔" جاتے ہوئے اس نے دھمکی دی تھی۔

"تم نے یہ کیا کیا سکندر خان۔" تیمور نے افسوس بھری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔

"مجھے اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہیں ہے۔ بس آپ اس بات کا خیال رکھیے گا کہ اس کیس میں حویلی کی عزت سامنے نہ آئے۔ میں سب الزام اپنے سر لے لوں گا۔ مگر اپنی بہن پر آنچ بھی نہیں آنے دوں گا۔"

سکندر خان نے سختی سے کہا تو تیمور نے بجھ کر سر ہلایا۔ شیر دل افسردگی سے آگے بڑھا۔

"مالک! آپ مجھے حکم کرتے!" شیر دل نے پریشانی سے کہا۔ سکندر خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

"ولی احمد اس حادثے میں بچ گیا مگر اس نے سکندر پر قاتلانہ حملے کا کیس کر دیا۔ سکندر خان نے بھی پولیس کو یہ بیان دیا کہ سیاسی مخالفت کی وجہ سے اس نے ولی احمد پر حملہ کیا۔ سکندر خان چونکہ پارلیمنٹ کا رکن تھا۔ اس کیس کی وجہ سے بہت ہنگامہ آرائی ہوئی۔ سکندر خان کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ میڈیا سے لے کر اخبارات تک اس کے خلاف زہر اگلنے لگے۔

"کیس کا فیصلہ سکندر خان کے خلاف آئے گا! یہ تو ہم سب جانتے ہیں کیونکہ اس واقعہ کے بہت سے گواہ ہیں اور دوسری بات کہ سکندر خان نے خود اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے۔ میرا بھائی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا۔ چوہدری یعقوب کی مکمل کوشش ہے کہ سکندر خان کبھی جیل سے باہر نہ آئے۔"

صباحت کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

حمرہ گل اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہی۔ سکندر کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر پچھلے سارے اخبارات ڈھونڈ کر ساری تفصیل پڑھی تھی۔ اخبارات میں آنے والے چوہدری یعقوب اور ولی احمد کے بیانات اور تصاویر بھی حمرہ نے دیکھی تھیں۔

"اللہ سے اچھی امید رکھیں، وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں لوٹائے گا۔" حمرہ گل نے یقین سے کہا۔

"تمہیں اتنی پر امید کیوں ہو؟" صباحت نے حیرت سے پوچھا۔

www.pklibrary.com

"اس لیے کہ مایوسی میرے رب کو سخت ناپسند ہے۔" حمرہ گل نے سادہ لہجے میں کہا تو صباحت اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

"مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ مجھ سے محبت کے دعوے کرنا والا، میری چاہت کا دم بھرنے والا، ہر مشکل اور تکلیف میں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والا، ایک آزمائش سے گھبرا کر اتنا بدل گیا کہ جیسے وہ مجھ سے کبھی آشنا بھی نہیں تھا۔"

ہوا خشک ہے کے درمیان بنی سڑک پر دور تک بکھرے زرد پتوں پر دھیرے دھیرے قدم رکھتی وہ دونوں آگے بڑھ رہی تھیں۔ حمرہ آج بہت مشکل سے رمشا کو کمرے سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ رمشا کی مایوسی اور بے دلی ہر کام اور بات سے جھلکتی تھی۔ وہ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ جہاں روشنی کا داخلہ بھی سختی سے منع تھا۔

آج حمرہ گل شام کے وقت رمشا کو اپنے ساتھ باہر لے آئی۔ رمشا کے دل میں جو کچھ دبا ہوا تھا، حمرہ گل نے اسے باہر کا راستہ دکھا دیا تھا۔ اس لیے رمشا بول رہی تھی، بے تکان اور حمرہ گل سن رہی تھی محو ہو کر۔

یہ سچ ہے کہ ہمارے آدھے دکھ اور تکلیفیں اظہار کا راستہ پاتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ جو ہم دلوں میں دکھوں کی گٹھڑی بنا کر اس کے بوجھ تلے سانس لیتے رہتے ہیں، ایک دن یا تو اسی بوجھ کے تلے دب کر مر جاتے ہیں یا اسی بوجھ کے تلے دب کر ظالم بن کر دوسروں کی زندگیاں اجاڑ دیتے ہیں۔

حمرہ گل چاہتی تھی کہ رمشا اپنے دل کے بوجھ تلے دب نہ کر نہ مرے اور نہ ہی منفی سوچ اور راستہ اختیار کر کے دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔

"میں شاید علی کی بے حسی پر صبر کر بھی لیتی جیسا کہ ہمارے معاشرے میں عورتیں ہر ظلم و جبر پر خاموش رہنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔ میں بھی اسی معاشرے میں پلی بڑھی ہوں میری گھٹی میں بھی صبر شامل ہے مگر میری وجہ سے سکندر بھائی جیل چلے گئے، ہمارا سارا گھر تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا۔ میں یہ کیسے برداشت کروں۔ میں جب جب سوچتی ہوں کہ سکندر بھائی نے میری وجہ سے اپنی زندگی تباہ کر لی ہے، تب میرا دل کرتا ہے کہ میں مر جاؤں۔ اور پچھلے مہینوں میں یہ کوشش کئی بار کر چکی ہوں مگر ہر بار بچ جاتی ہوں۔ نجانے کیوں؟" رمشا نے آزردگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ حمرہ گل کا چہرہ بے تاثر تھا۔ جیسے اسے رمشا کی بات سن کر بالکل افسوس نہیں ہوا ہے۔

"لگتا ہے کہ سورج نے نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ کتنی سردی ہے نا!" حمرہ گل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور شال کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لیا۔ رمشا نے الجھ کر حمرہ گل کی طرف دیکھا۔

"سورج تو ہر روز نکلتا ہے۔ آج دھند کے پیچھے چھپا ہے۔"

"ہاں کیا ہوا اگر سورج کی کرنیں زمین کو نہیں چھو رہیں مگر ہم یہ تو جانتے ہیں کہ وہ ہر روز نکلتا ہے اور پھر غروب ہو جاتا ہے۔" حمرہ گل نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ رمشا چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔

"ایک سادہ سی بات۔ جسے تم نے الجھا کر رکھ دیا ہے رمشا!" حمرہ گل نے کہا۔

"وہ کیسے؟" رمشا اب بھی حیران تھی۔

"تم جانتی ہو کہ اس رات خدا کی مہربانی سے تم دشمنوں کے برے ارادوں سے محفوظ رہیں۔ تمہارے گھر والے اس بات کو مانتے ہیں۔ صرف کچھ لوگوں کے نہ ماننے سے کیا تمہارا وجود داغدار ہو گیا ہے؟"

حمرہ گل کے سوال نے رمشا کے چہرے کا رنگ اڑا دیا تھا۔

"رمشا! میں مانتی ہوں کہ ایک عورت کے لیے یہ چھوٹی بات ہرگز نہیں ہے! اس کا اغوا ہونا اور اکثر تو

www.pklibrary.com

میری جیسی ہوتی ہیں جو اغوا ہونے کے بعد ظلم و بربریت کا شکار ہوتی ہیں مگر کیا کسی کے برے فعل یا عمل کی وجہ سے متاثرہ لڑکی خود پر زندگی حرام کرلے؟ کیا پہلے ہی اس کے ساتھ ہوا ظلم کم ہے جو زندگی کے دروازے بند کرکے اس پر مزید ظلم کیا جائے......"

حمرہ گل بغیر رکے بول رہی تھی اور رمشا اسے گم صم سن رہی تھی۔ "ہم ہر چیز کا الزام خود کو یا معاشرے کو دیتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی، اپنا وقت دوسروں پرا لزام لگانے میں ضائع کردیتے ہیں مگر ہم اپنے ذات کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں کیوں؟ تمہارے ساتھ کسی نے غلط کیا اور تم اپنے ساتھ کیا کررہی ہو ظلم۔ خود کو نقصان پہنچا کر، خودکشی کی کوشش کرکے، تمہیں کیا مل جائے گا؟ اس زندگی سے چھٹکارا۔ جو پہلے ہی تمہارے پاس رب کی امانت ہے ایک مخصوص وقت کے لیے!" حمرہ گل کہتے کہتے جب ہوئی اور رمشا کو واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے چلنے لگی۔ "تم جانتی ہو، جب میں اس ظلم کا شکار بنی تو میری سوچ اور رویہ بھی تمہاری طرح ہی تھا۔ ہر وقت روتے رہنا، چیخنا، چلانا، خود کو ختم کرنے کے مختلف طریقے ڈھونڈنا اور ان پر عمل کرنا۔ ان دنوں مجھے بالکل بھی احساس نہیں تھا کہ میرے اس عمل سے میرے والدین پر کیا گزر رہی ہے جو پہلے ہی شدید ذہنی اذیت کا شکار تھے۔ مگر رمشا، یہ مایوسی چیز ہی ایسی ہے جو ہم سے روشنی اور امید کی ہر کرن چھین لیتی ہے۔ مایوسی سب سے بدگمان کرکے صرف اپنا بنا لیتی ہے۔ مایوس شخص نہ خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ خود پر۔ وہ صرف مایوسی کو ہی پہنتا اور اوڑھتا ہے۔ جیسے کہ میں کرتی تھی، جیسا کہ تم کررہی ہو۔" حمرہ گل نے توقف کیا۔

"پھر آپ نے کیسے اس مایوسی سے نجات حاصل کی؟" رمشا کا لہجہ پرتجسس تھا۔

"کوشش اور اللہ پر یقین سے۔ ارم آنٹی نے اس فیز میں میری بہت مدد کی۔ انھوں نے مجھے بار بار احساس دلایا کہ میری وجہ سے میرے والدین بھی متاثر ہورہے ہیں۔ اور یہ دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے کہ جس سے ہم سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں، ان کے لیے کچھ بھی کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اور یہ حوصلہ ہی میرا زادہ راہ بنا۔ پھر میں نے قرآن کی کلاسز لینا شروع کیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم جس دنیا کو سب کچھ سمجھ کر جیتے ہیں، یہ دراصل کچھ بھی نہیں سوائے ایک امتحان گاہ کے۔ تب میں نے جانا کہ میرے رب نے مجھے اس آزمائش کے لیے چنا ہے۔ کیوں؟ کا سوال ابھی میری بندگی میں نہیں آتا تھا۔ اس لیے میں نے اس سوال کو بھول کر صرف یہ سیکھنا شروع کیا کہ مجھے اب کیسے جینا ہے؟

تب میں نے جانا رمشا کہ ہم سب کی زندگی بھی روشن اور چمکتا ہوا سورج ہے جو ایک مخصوص وقت کے بعد غروب ہوجائے گی۔ تب تک ہمیں جلنا ہے، اپنی کوشش اور ہمت سے ڈر اور مایوسی کی اندھیر راتوں سے نکل کر روشن دن میں ڈھلنا ہے، اور صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے آس پاس ہر طرف روشنی پھیلانی ہے! جب میں اس نکتے کو سمجھ گئی تو مجھے اس کیوں کا جواب بھی مل گیا۔"

"وہ کیا؟"

رمشا نے بے تابی سے کہا۔ وہ دونوں حویلی کے بڑے آہنی گیٹ کے پاس پہنچ گئی تھیں۔ چوکیدار نے فوراً گیٹ کھولا۔ حمرہ گل نے مسکرا کر ایک نظر چند قدم دور کھڑی رمشا کی طرف دیکھا۔

"کسوف!" حمرہ گل نے اطمینان سے کہا اور اندر کی طرف چل پڑی۔

"کسوف؟" رمشا نے حیرت سے دہرایا۔

"مجھے اس کا مطلب جاننا ہے۔" رمشا نے سوچا تو تیزی سے اندر کی طرف بڑھی۔

☆☆☆

"بابا جان! مجھے آپ سے اجازت چاہیے۔"

ذیشان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا پنجرے میں ادھر ادھر اڑتے آسٹریلین طوطوں کا دیکھ رہا تھا۔ جب گرما گرم ناشتے کی ٹرے اٹھائے حمرہ گل آئی۔ حمرہ

www.pklibrary.com

گل کو حویلی سے واپس آئے کئی دن گزر گئے تھے اور ان دنوں وہ اتنی مصروف تھی کہ اس کے پاس اپنے دل عزیز بابا جان کے لیے بھی وقت نہیں بچتا تھا۔ اس لیے اتنے دنوں کی کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لیے وہ بابا جان کے لیے اپنے ہاتھوں سے ناشتا بنا کر لائی تھی۔ میز پر ٹرے رکھ کر وہ سلائس پر مکھن لگانے لگی۔ ذیشان نے اس کے چہرے پر محبت سے نگاہ ڈالی۔

"اجازت؟" ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

"جی بابا جان! آپ کئی سال پہلے میرے ساتھ ہوئے حادثے کو سب سے چھپانے کے لیے نگر نگر پھرتے بالآخر یہاں آ کر بس گئے تھے مگر میں چاہتی ہوں کہ اس ڈر کو شکست دی جائے۔ میں اپنے مجرم کو کٹہرے میں لانا چاہتی ہوں۔"

حمرہ گل نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ذیشان حیرت سے اسے سن رہا تھا۔

"اتنے سال بعد کیا تم؟" ذیشان نے کسی خدشے کے تحت جلدی سے پوچھا تو حمرہ گل نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں چوہدری یعقوب کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا ولی احمد۔ آپ کا پرانا اسٹوڈنٹ۔ جس نے آپ سے بدل لینے کے لیے مجھے چنا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس نے جو کچھ میرا ساتھ کیا، اسے اس کی سزا ملے۔ آپ کو میرا ساتھ دینا ہے بابا جان پلیز۔ مجھے منع مت کیجیے گا۔" حمرہ گل نے ذیشان کا ہاتھ پکڑ کر منت کی تو ذیشان اسے دیکھتا رہ گیا۔

"سوچ لو گل! یہ فیصلہ تم سے سب کچھ چھین لے گا! تمہاری جاب، تمہاری پہچان، تمہاری ساکھ۔"

ذیشان نے اسے ڈرانا چاہا۔ حمرہ گل نے سر جھکا لیا۔

"میں نے سوچ لیا ہے بابا جان، مجھے آپ کی دعا چاہیے۔"

حمرہ گل کو اپنی بات پر اڑا دیکھ کر ذیشان نے گہری سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر تم اکیلی کیا کرو گی؟" ذیشان نے پریشانی سے پوچھا۔

"اکیلی کہاں ہوں۔ آپ کو میری جوزف یاد ہیں، وہ بھی میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔" حمرہ گل نے پوچھا تو ذیشان چونک گیا۔

"ہاں، مگر وہ تمہیں کہاں مل گئی؟" ذیشان نے حیرت سے پوچھا۔

"یہاں ہی، اسی شہر میں۔ ایک این جی او میں کام کرتی ہیں۔ پچھلے کئی دنوں سے میں انہیں ہی ڈھونڈ رہی تھی۔ مشکل تو پیش آئی مگر اللہ نے میرے راستے آسان کر دیے۔" حمرہ گل نے تفصیل سے بتایا۔

"کیا وہ مان گئی ہے؟" ذیشان نے پوچھا۔

"ہاں! وہ خود اپنے ساتھ ہوئے ظلم کا حساب لینا چاہتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ولی احمد کو اب کوئی نہیں بچا سکے گا۔" حمرہ گل نے مضبوط لہجے میں کہا تو ذیشان سر ہلانے لگا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں میری بچی۔" ذیشان نے کہا تو حمرہ گل نے تشکر بھری نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"شکریہ بابا جان! آپ نے میرے لیے بہت سفر کیا ہے۔ بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ مجھے فخر ہے کہ آپ میرے بابا ہیں۔" حمرہ گل نے کہا اور اٹھ کر باپ کے گلے لگ گئی۔

"اور مجھے تم پر فخر ہے حمرہ گل! تم میں اتنا حوصلہ ہے کہ تم ظلم اور جبر کے خلاف آواز اٹھا سکو، چاہے محبت کی خاطر ہی سہی۔"

ذیشان نے اطمینان سے کہا تو حمرہ گل نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

"آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں بابا جان، محبت ہی ہمارا حوصلہ بنتی ہے، جیسے آپ کی محبت نے مجھے دوبارہ سے جینا سکھایا تھا اور آج سکندر خان سے محبت نے مجھے اپنے ساتھ ہوئی زیادتی پر آواز اٹھانے کا حوصلہ

www.pklibrary.com

دیا ہے۔" حمرہ گل نے اعتراف کیا تو ذیشان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بابا جان! کیا آپ انکل فاروق سے رابطہ کر سکتے ہیں؟ میری جوزف کیس کی ساری تفصیل ان کے پاس تھی نا۔"

حمرہ گل نے کہا تو ذیشان پرسوچ انداز میں سر ہلانے لگا۔

☆☆☆

سکندر خان جس پر چوہدری یعقوب کے بیٹے ولی احمد پر قاتلانہ حملے کا کیس بنا تھا۔ چودھری یعقوب خوش تھا کہ اس نے سکندر خان کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور فیصلہ اس کے خلاف آنے کا مکمل یقین تھا مگر کیس کی آخری سماعت سے پہلے حمرہ گل کی اچانک مداخلت نے کیس کا رخ ہی موڑ دیا۔ حمرہ گل نے ولی احمد پر کیس دائر کرتے ہوئے سکندر خان کے حق میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

"ولی احمد ایک بدکردار شخص ہے جس نے اپنی ہوس کا نشانہ میری جیسی کئی لڑکیوں کو بنایا ہے۔ ولی احمد نے دس سال پہلے اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر مجھے گینگ ریپ کا نشانہ بنایا جس کے خلاف وہاں کے تھانے میں ایف آئی آر لکھوائی گئی مگر ولی احمد اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے بچ گیا۔ اس کی بار ولی احمد نے دوبارہ وہ مکروہ فعل دہرانے کی کوشش کی اور مجھے تب اغوا کر لیا جب میں کالج ہوسٹل سے واپس اپنے گھر جانے نکلی چونکہ یہ کالج سکندر خان کی زیرنگرانی تھا اور وہ ولی احمد کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لیے سکندر خان نے جلد ہی مجھے بازیاب کروا لیا مگر میرے منع کرنے پر میرا نام سامنے نہیں لائے۔ اس دن پولیس اسٹیشن میں جب ولی احمد نے دوبارہ دھمکی دی کہ وہ پھر یہ حرکت کرے گا تو سکندر خان نے غصے میں آ کر اس پر حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں ولی احمد زخمی ہو گیا مگر کیا ایسا شخص آزاد رہنے کا حق دار ہے جو دوسروں کی عزت سے کھیلتا پھرے۔ سکندر خان نے جو کیا میری حفاظت کے خیال سے کیا ہے۔"

حمرہ گل کے بیان نے ہر طرف ہلچل مچا دی۔ تبصروں، باتوں، کو طوفان تھا جس کا سامنا حمرہ گل کو کرنا پڑ رہا تھا۔

حمرہ گل نے اپنے ساتھ ہی فیض بابا کی کٹوائی ایف آئی آر کی کاپی بھی پیش کر دی۔ فیض بابا اور ان کی بیٹی کو ڈھونڈ کر اور بمشکل منا کر عدالت تک لانا شیر دل کا کام تھا۔ میری جوزف جو اب ایک مضبوط پوزیشن میں تھی، اس نے ولی احمد کے خلاف میڈیا مہم کا آغاز کر دیا۔ میری جوزف کا ساتھ دینے کے لیے کرسچین کمیونٹی بھی میدان میں کود پڑی۔ میری جوزف کی این جی او تو پہلے ہی جلسے جلوس نکال کر شہر میں طوفان لا چکی تھی۔ ولی احمد کے خلاف کیس مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ ولی احمد کے دونوں ساتھی جنہوں نے کئی سال پہلے میری جوزف اور حمرہ گل کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا تھا، وہ آج اپنی اپنی زندگی میں بہت اچھے مقام پر، بیوی بچوں کے ساتھ پرسکون اور عزت بھری زندگی گزار رہے تھے مگر ماضی کے الاؤ سے لپکتے سچ کے شعلوں نے ان کی آج کی زندگی کو لوگوں کے لیے عبرت بنا دیا تھا۔ ان کے بیوی بچے پہلے مقام پر ہی انہیں تنہا چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ خدا نے ظالموں کی رسی وہاں آ کر کھینچی تھی، جہاں انہیں چوٹ بھی شدید لگی۔

چوہدری یعقوب جو پہلے سکندر خان کی سزا کی توقع کر رہا تھا۔ اچانک ہی ساری بازی پلٹ گئی اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ الٹا اس کی ساکھ شدید متاثر ہوئی۔ کئی سال بعد حمرہ گل نے سامنے آ کر اپنا بدلہ لے لیا تھا۔ تحقیقات شروع ہوئیں۔ کڑی سے کڑی ملتی گئی۔ ولی احمد کے خلاف اور بھی ثبوت مل گئے۔ میری جوزف کیس کے شواہد بھی حاصل کیے گئے اور ان سب کی روشنی میں ولی احمد کو عمر قید اور جرمانے کی سزا سنائی گئی۔

ولی احمد اس سزا کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے اس نے بہت شور مچایا مگر اس کی سننے والا کون تھا۔

www.pklibrary.com

چوہدری یعقوب نے اپنے اکلوتے بیٹے کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا مگر ناکام رہا۔ آسائشوں اور آرام میں پلا بڑھا ولی احمد جیل کے ماحول سے بہت جلد گھبرا گیا۔ اس کے ذہن پر بہت اثر پڑا تھا۔ کبھی وہ غصے توڑ پھوڑ شروع کر دیتا، کبھی خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا۔ جب ولی احمد کی ذہنی حالت زیادہ بگڑی تو اسے جیل سے پاگل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ چوہدری یعقوب بیٹے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ایک دن خود بھی فالج کا شکار ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ چوہدری یعقوب کا نام، اس کا پیسہ، اس کی شان و شوکت سب وقت کی خاک میں مٹی ہو رہا تھا کہ خاک نے خاک ہی میں ملنا ہے۔

سکندر خان کی اچھی شہرت اور ساکھ کو سامنے رکھ کر عدالت نے اپنے فیصلے میں نرمی کا مظاہرہ کیا۔ سکندر خان کو قانون ہاتھ میں لینے کی وجہ سے تین سال کی سزا ہوئی۔ جس کی مدت کل صبح ختم ہو رہی تھی۔ سکندر خان نے گہری سانس لے کر آنکھیں کھولیں۔

''حمد گل!'' اس کے لب ہلے۔ اسی وقت فجر کی صدا بلند ہوئی۔ ''ہاں وہ اولین صبح کے وقت جیسی ہی ہے۔ پرسکون، پاک اور معطر سی!'' سکندر خان نے دل میں اعتراف کیا۔

☆☆☆

رمشا نے مسکرا کر نئی کلاس کو خوش آمدید کہا۔ نئی کلاس میں آکر لڑکیاں جہاں کچھ گھبرائے ہوئے ہوئی تھیں، وہاں ایک جوش اور خوشی بھی محسوس کر رہی تھیں۔ رمشا نے پہلے اپنا تعارف کروایا اور پھر باری باری سب کو اپنا تعارف پیش کرنے کا حکم دیا۔ فرسٹ ائیر میں نئی نئی آئیں لڑکیاں اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے کنفیوز ہو رہی تھیں۔

''ہر روز آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود سے بات کیا کریں۔ جس دن آپ اپنا سامنا کرنا سیکھ جائیں گے، اس دن آپ کو دنیا سے بات کرنے کا ہنر خود بہ خود آجائے گا۔ میری ٹیچر نے مجھے ایک بات سمجھائی تھی کہ ہم ساری زندگی یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم دنیا کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں..... نہیں بلکہ ہم ساری زندگی خود سے نظریں چراتے ہوئے گزار دیتے ہیں کیونکہ خود سے نظر ملانا مشکل ہوتا ہے، دنیا تو بہت بعد میں کہیں آتی ہے۔''

رمشا نے سادہ لفظوں میں بہت گہری بات انہیں سمجھائی تھی۔

رمشا کلاس لے کر باہر نکلی تو کالج پیون نے اسے بتایا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ رمشا سر ہلاتی ہوئی ویٹنگ روم میں داخل ہوئی تو علی کو صوفے پر بیٹھا ہوا دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ علی اسے دیکھتے ہی فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ رمشا گہری سانس لے کر آگے بڑھی۔

''تم پھر آگئے ہو علی۔ اپنی محبت کا الاپ سنانے۔'' رمشا نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ علی کے چہرے پر شرمندگی تھی۔

''نہیں۔ میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میری کتنی سزا باقی رہتی ہے۔ تم مجھے معاف کب کرو گی رمشا؟'' علی نے بے تابی سے پوچھا۔ رمشا اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں تمہیں معاف کر چکی ہوں علی۔'' رمشا کا لہجہ سادہ تھا۔

''پھر تم میرے ساتھ گھر کیوں نہیں چلتیں؟'' علی نے بے تابی سے پاس آکر پوچھا۔

''ابھی وقت پورا نہیں ہوا نا!'' رمشا نے کہا۔

''کس چیز کا وقت!'' علی نے حیرت سے پوچھا۔

''وقتِ کسوف!'' رمشا نے پہیلی سنائی۔

''مطلب؟'' علی الجھا۔

''کسوف مطلب سورج گرہن۔ سورج گرہن ڈھلنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا علی۔ مجھے بھی اس وقت کا انتظار ہے جب میرے وجود پر لگا گہن وقت کے ایک مخصوص چکر کے بعد ڈھل جائے گا اور میرا دل پھر سے تمہاری محبت کے ساز پر جینے کی خواہش

www.pklibrary.com

کرے گا۔ تب میں لوٹ آؤں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ رمشا کی وفا صرف ایک مرد کے لیے ہی ہے اور وہ مرد تم ہو علی۔ مگر مجھے اپنا راستہ خود بنانے دو۔ مس حمرہ گل ٹھیک ہی کہتی تھی کہ اگر اللہ نے ہمیں کسی آزمائش کے لیے چنا ہے تو ہمیں اس کے ساتھ جینا آنا چاہیے بجائے کہ ہم اللہ سے ناراض ہو کر کیوں کا سوال لے کر ناشکری کے کنکر جمع کرتے رہیں۔ میرے ساتھ وہ حادثہ نہ ہوتا تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ میں کہاں ہوں؟ میری وقعت کیا ہے؟"

رمشا نے اداسی سے کہا تو علی اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور گود میں رکھے رمشا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے۔

"رمشا! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ میں اس وقت بھی جانتا تھا کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ جھوٹ نہیں ہے۔ تمہاری عزت پر کوئی آنچ نہیں آئی ہے۔ مگر رمشا میں اپنے گھر والوں کے سامنے، دنیا کے سامنے کمزور پڑ گیا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ میں دنیا کے سامنے تمہاری پاک دامنی کیسے ثابت کروں گا؟ میں لوگوں کے سوالوں کے کیا جواب دوں گا؟ اس لیے میں کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ جس کا فائدہ میرے گھر والوں نے اٹھایا مجھے ہر بات سے بے خبر رکھا گیا حتیٰ کہ تمہارے مس کیرج کے بارے میں بھی مجھے کسی نے نہیں بتایا۔ مجھے تو انتظار تھا اس کی آمد کا۔ مگر ہماری پہلی خوشی، پہلا خواب ہمارے کالے نصیب کا حصہ بن گیا۔" علی دھیرے سے کہہ رہا تھا اور رمشا کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے گر رہے تھے۔

"پھر تم واپس کیسے لوٹے؟" رمشا نے پوچھا

"رمشا! میں پہلے ہی ایک غلطی کر چکا ہوں تمہارے معاملے میں بزدلی دکھا کر۔ مگر میں نے حمرہ گل سے سیکھا ہے کہ حوصلہ کیا ہے، ہمت کسے کہتے ہیں اور محبت میں سب کس طرح قربان کرتے ہیں۔ حمرہ گل ایک لڑکی ہو کر اتنی ثابت قدم ہے۔ اس نے سکندر خان کو بچانے کے لیے زمانے کے سامنے خود کو پیش کر دیا۔ سکندر خان کی عزت کا پاس رکھنے کے لیے تمہاری جگہ اپنا نام لیا۔ میں نے جب حمرہ گل کو ہر چیز سے بے نیاز ہو کر سکندر خان کے لیے لڑتے دیکھا، تب مجھے اندازہ ہوا کہ میں مرد ہو کر بھی کتنا کمزور ہوں۔ جو ایک عورت، جو اس کی بیوی بھی ہے، اسے تحفظ نہیں دے سکتا!" علی کے چہرے پر پچھتاوے کے سب رنگ تھے۔ رمشا چپ چاپ اسے دیکھتی رہی۔

"میں وعدہ کرتا ہوں رمشا۔ میں اب تمہیں کبھی رونے نہیں دوں گا۔ دنیا جو بھی کہے میں تمہارا اعتبار کروں گا۔ تم جانتی ہو رمشا، میں نے ایک چھوٹا سے گھر تمہارے لیے بنایا ہے۔ جو بھلے بہت عالیشان نہیں ہے مگر وہ ہماری محبت کی جنت بنے گا۔ جہاں ہم اپنی آنکھوں کے سب خوابوں کو مجسم دیکھیں گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں رمشا، میں تمہارا یقین بنوں گا۔"

علی نے مضبوطی سے رمشا کے ہاتھ دبا کر یقین دلایا تو رمشا نے روتے ہوئے سر اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ رمشا کے آنسو علی کے ہاتھ بھگو رہے تھے اور علی کے آنسو رمشا کے بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

محبت کچی تھی نا۔ آزمائش کے بغیر کیسے امر ہوتی!

☆☆☆

سکندر خان سادہ سے، ملگجے کپڑوں میں کندھے پر مردانہ شال اوڑھے، پاؤں میں کالی سادہ چپل پہنے، دھیرے دھیرے چلتا جیل کے بڑے سے آہنی گیٹ سے باہر نکلا تو مستعد کھڑا شیر دل تیزی سے آگے بڑھا۔

"صدقے مالک۔"

شیر دل نے سرخ پھولوں کا ہار سکندر خان کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ کالے رنگ کی لینڈ کروزر کے پاس اور بھی لوگ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے بے قرار کھڑے تھے۔ سکندر خان نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کی محبت کا جواب دیا۔ شیر دل نے

www.pklibrary.com

جلدی سے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ سکندر خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکا۔ وہ سکندر خان کی نظروں کی زبان سمجھتا تھا۔ شیر دل سب کو پیچھے کرنے لگا۔ سکندر خان گاڑی کی آڑ سے ہوتا ہوا بڑے بڑے قدم اٹھاتا فٹ پاتھ پار کر کے سفید رنگ کی گاڑی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ سکندر خان نے جھک کر شیشے پر ناک کیا۔ شیشہ نیچے ہوا۔

"دروازہ نہیں کھولو گی؟" سکندر خان نے امید سے پوچھا۔

"آپ پر یہ دروازہ بند ہی کب ہے سکندر خان۔"

حمرہ گل نے کالا چشمہ بالوں میں اٹکاتے ہوئے کہا۔ سکندر خان مسکراتا ہوا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔

"جلدی سے چلو یہاں کوئی آ نہ جائے!" سکندر خان نے گردن موڑ کر پیچھے موجود رش کی طرف دیکھا تھا۔ حمرہ گل نے مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

"اتنا ڈرتے ہیں دنیا سے؟" حمرہ گل نے موڑ کاٹتے ہوئے سوال کیا۔ سکندر خان نے سر کھجایا۔

"کیا نہیں ڈرنا چاہیے؟" سکندر خان نے سوال کیا۔

"سکندر خان کب کسی سے ڈرتا ہے!" حمرہ گل مسکرائی۔

"ڈرتا تو ہے مگر بس دو باتوں سے۔ ایک اوپر والے سے۔" سکندر خان نے انگلی اٹھا کر آسمان کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "اور دوسرا تمہیں کھونے سے۔" سکندر خان نے اطمینان سے کہا۔

"بس؟" حمرہ گل کا انداز پراسرار تھا۔

"ہاں بس۔" سکندر خان نے یقین دہانی کروائی۔

"پھر ٹھیک ہے۔ ڈیش بورڈ میں ہیر برش اور پرفیوم موجود ہے۔" حمرہ گل نے گاڑی کی اسپیڈ تیز کرتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی دولہا کیسے بن جاؤں؟" سکندر خان نے بوکھلا کر ڈیش بورڈ کھولا اور جلدی سے ہاتھ چلاتے ہوئے اپنے بالوں میں کنگھی کی اور پھر ڈھیر سارا پرفیوم خود پر چھڑک لیا۔

"دولہا بننے سے پہلے بابا جان سے رشتہ مانگنا پڑے گا۔" حمرہ گل نے گاڑی اپنے گھر کے سامنے روکتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"اتنی جلدی؟" سکندر خان نے چھیڑا۔

"بڑھی ہوئی شیو میں سفید بال جھلک رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اتنی جلدی؟" حمرہ گل نے شرارت سے کہیں کہیں آئے سفید بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا تو سکندر خان کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"پھر تو مجھے شکر کرنا چاہیے کہ تم مجھے سیدھا شادی کرنے کے لیے میرج کورٹ یا مولوی کے پاس نہیں لے گئیں۔" سکندر خان نے اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"سوچا تو یہ ہی تھا مگر پھر رمشا کی دھمکی یاد آ گئی کہ اسے ہماری شادی دھوم دھام سے کرنی ہے، نہیں تو وہ ہم سے بات نہیں کرے گی!"

حمرہ گل گاڑی کی چابی ہاتھ میں لیے آگے بڑھی۔ کسی گاڑی نے پاس آ کر بریک ماری تو سکندر خان نے گردن موڑ کر دیکھا۔ شیر دل لینڈ کروزر کے پاس مستعد کھڑا تھا۔ سکندر خان مسکرا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں ذیشان حسن بے صبری سے ان دونوں کا منتظر تھا۔

سکندر خان ہی وہ شخص تھا جو اس کی بیٹی کو بے لوث چاہتا تھا۔ جس کے سنگ حمرہ گل اپنے گرہن زدہ وجود کے ساتھ بھی ایک مکمل اور آسودہ زندگی گزار سکتی تھی۔ یہ ہی تو ایک محبت کرنے والے باپ کی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کا نصیب محبت کے سنہری پنوں پر لکھا جائے کیونکہ محبت ہر کسی کا نصیب کب بنتی ہے اور جن کا نصیب بن جائے وہ عام کب رہتے ہیں۔

☆☆

www.pklibrary.com

تیشۂ فرہاد

صبح ہی سویرے خبر دیکھی



ڈاکٹر کے مطب کی انتظار گاہ میں نصب نشستوں پر کئی لوگ بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی کچھ دیر پہلے ہی آئے تھے۔ کونے کی نشست پر ایک بیالیس پینتالیس کے لگ بھگ عمر کی خاتون نو دس سالہ عمر کی بچی کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ نشست کا فاصلہ دے کر ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہوا تھا جو ہر تھوڑی دیر بعد کھانس رہا تھا۔ اور اس کے سامنے والی نشست پر ایک عمر رسیدہ خاتون قدرے میلی چادر میں لپیٹے ہوئے بیٹھی تھیں۔ ان کے بالکل برابر میں ایک پریشان حال لڑکی تھی جس کے چہرے پر بے بسی اور حلیے سے غربت ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے کمرے کے ساتھ ہی جگہ کو کمرے کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔

تین فٹ اونچی دیوار ایستادہ کر کے اوپر شیشہ لگا دیا جبکہ درمیان میں ایک کھڑکی بنا دی گئی تھی شیشے کے پیچھے کھڑے کمپاؤنڈر نے کھڑکی کی اوٹ سے کونے والی خاتون کی طرف دیکھا اور آواز لگائی۔

"نمبر...... ون۔"

خاتون انھیں لڑکی کو ساتھ لے کر کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

بوڑھی خاتون نے چونک کر برابر بیٹھی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور پوچھنے لگیں۔

"کہاں رہتی ہو تم؟"

لڑکی نے ان کی طرف بہت دکھ سے دیکھا اور آہستگی سے بولی۔

"قریب ہی...... دو گلی آگے......"

خاتون چپ ہو گئیں اور دروازے سے داخل ہونے والے نئے مریض کو دیکھنے لگیں جو خالی نشست

www.pklibrary.com

پر بیٹھ گیا۔ وہ پھر لڑکی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"پریشان معلوم ہوتی ہو؟"

لڑکی نے ان کی جانب دیکھا اور پھر رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

خاتون پھر گویا ہوئیں۔ "شادی شدہ ہو؟"

لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

خاتون خود کلامی کے انداز میں کہنے لگیں۔

"اتنی پیاری ہو پھر تو شادی کیوں نہیں ہوئی۔"

لڑکی خاموشی سے زمین کو گھورتی رہی۔

خاتون نے اگلا سوال داغ دیا۔ "ابا کیا کرتے ہیں تمہارے؟"

"وہ چلے گئے ہیں......" لڑکی زمین کو دیکھتے ہوئے بولی "اللہ میاں کے پاس...... ہم بہت چھوٹے تھے...... ہماری امی نے محنت مشقت کر کے ہمیں پالا، پڑھایا۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتی تھیں، ہماری ذمہ داری انہوں نے ہی اٹھائی ہے۔"

خاتون نے شفقت سے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

کمرے میں معائنہ کروانے والی عورت بچی سمیت باہر آرہی تھی۔ کمپاؤنڈر کی آواز بلند ہوئی "نمبر...... نو۔"

کھانسنے والا لڑکا اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے دروازے کی طرف روانہ ہوا، اس کے ہاتھ میں خاکی لفافے تھے یقیناً میڈیکل رپورٹس ہوں گی۔

خاتون نے دوبارہ لڑکی کی طرف دیکھا پھر پوچھنے لگیں "تم کچھ کام کرتی ہو؟"

لڑکی نے سر ہلا کر کہا۔ "ہاں، قریب کے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

خاتون نے سر ہلایا ایک اور سوال پوچھا گیا۔

"اور بہنیں ہیں؟"

"جی......" لڑکی خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولی "مجھ سے چھوٹی دو ہیں۔"

خاتون خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ "تم تین بہنیں ہو...... اچھا......" پھر چونکیں۔ "بھائی نہیں ہے کوئی تمہارا؟"

لڑکی نے ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہے...... مجھ سے چھوٹا اور بہنوں سے بڑا۔"

"اچھا"...... خاتون بولیں "کیا کرتا ہے وہ؟"

لڑکی کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی "میری ماں نے محنت مشقت کر کے ہمیں پالا، مشکلیں جھیل کر ہمیں پڑھایا لکھایا۔ وہ نوکری پر لگا تو شادی کی رٹ لگا لی...... تین بچے ہیں ان کے، الگ رہتا ہے...... ہم سے لاتعلق...... نہ ملتا ہے ہم سے نہ پہچانتا ہے ہمیں...... امی ملنے گئیں تو دروازہ تک نہ کھولا اس کی بدذات بیوی نے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

خاتون کو شدید دکھ ہوا خود کلامی کے انداز میں بولیں۔

"اللہ اللہ کیا زمانہ آگیا ہے...... کیسے نافرمان بچے ہیں آج کل کے......" وہ پھر چونکیں اور لڑکی کی طرف دیکھ کر بولیں۔ "امی اب بھی کام کرتی ہیں تمہاری؟"

"نہیں۔" لڑکی کی آنکھیں بھر آئیں۔ "امی...... وہ تو بیمار ہیں۔"

خاتون خاموش ہو گئیں دکھ بھری نظروں سے لڑکی کا چہرہ تکنے لگیں۔ لڑکی نے آنسو پونچھنے کے لیے اپنے دوپٹے کے پلو کو آنکھوں پر رکھ لیا۔ خاتون نے اس کے گھٹنے پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کر لی۔

"کیا ہوا ہے امی کو؟"

لڑکی سسک اٹھی۔ "وہ خود کو بھول گئی ہیں۔"

"ارے" خاتون کے منہ سے بے ساختہ نکلا "بچی......"

ڈاکٹر صاحب کے کمرے سے کھانسنے والا لڑکا نکل رہا تھا۔ کمپاؤنڈر کی آواز آئی۔

"نمبر...... تھری۔"

اب باری لڑکی کی تھی، اس نے جلدی جلدی دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں، جلدی سے کھڑی ہوئی خاتون کو کہنی سے تھاما اور بولی۔

"چلیے امی اب ہمارا نمبر ہے۔"

☆☆

www.pklibrary.com

شعاع عمیر

کرن کرن خوشبو

القرآن

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس نے کہا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ (اپنے لیے) ضرور لوں گا۔ میں انہیں ضرور گمراہ کروں گا اور ضرور انہیں غلط امیدیں دلاؤں گا اور انہیں ضرور حکم دیتا رہوں گا سو وہ یقیناً جانوروں کے کان چیرا کریں گے اور میں انہیں ضرور حکم دیتا رہوں گا سو وہ یقیناً اللہ کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدلا کریں گے۔ اور جو کوئی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو دوست بنالے تو واقعی وہ صریح نقصان میں رہا۔ (سورۃ النسا آیت 119)

جادوگر

حضرت جندب رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جادوگر کی سزا تلوار سے گردن مارنا ہے۔ (ترمذی)

نصیحت

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اے ابوالحسن! مجھے کچھ نصیحت کرو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: "آپ اپنے یقین کو شک نہ بنائیں (یعنی) روزی کا ملنا یقین ہے اس کی تلاش میں اس طرح اور اتنا نہ لگیں کہ گویا آپ کو اس میں کچھ شک ہے) اور اپنے علم کو جہالت نہ بنائیں (جو علم پر عمل نہیں کرتا وہ اور جاہل دونوں برابر ہوتے ہیں) اور اپنے گمان کو حق نہ سمجھیں (یعنی آپ اپنی رائے کو وحی کی طرح حق نہ سمجھیں) اور یہ بات آپ جان لیں کہ آپ کی دنیا تو صرف اتنی ہے کہ جو آپ کو ملی اور آپ نے اسے آگے چلادیا، یا تقسیم کرکے برابر کردیا یا پہن کر پرانا کردیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اے ابو الحسن! آپ نے سچ کہا۔"

(فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات)

صنعاء کا گدھا

کہا جاتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے ایک سلطان نے صنعاء کا دورہ کیا شہر کے دروازے پر استقبال کرنے والوں میں ایک شخص پر سلطان کی بیوی کی نظر پڑی جس کے پاس سفید رنگ کا ایک خوب صورت گدھا تھا، جس نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس نے اس وقت صنعاء کے گورنر سے کہا کہ وہ اس گدھے کو ہمارے سلطانی قافلے کا حصہ بنادے تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ استنبول لے جائے۔

گورنر گدھے کے مالک کے پاس گیا اس نے سلطان کی بیوی کی خواہش کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ گدھا بطور ہدیہ یا قیمتاً انہیں دے دو۔

گدھے کے مالک نے کہا جناب میں اس گدھے کو ہرگز ہرگز نہیں دوں گا۔ میرے پاس اعلا نسل (اجیاد) کے چھ گھوڑے ہیں۔ ان جیسے گھوڑے پوری سلطنت عثمانیہ میں کہیں نہیں ہوں گے۔ میں بطور تحفہ سلطان کی بیوی کو چھ کے چھ گھوڑے دینے کو تیار ہوں لیکن گدھا کسی قیمت پر نہیں۔

گورنر نے حیرانی سے اس کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیا۔

بادشاہوں کی باتیں اور اور ان کی چیزوں کا

www.pklibrary.com

چرچا سلطنت کے اندر اور باہر ہر جگہ ہوتا ہے ان کے کام تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اگر سلطان کی بیوی اس گدھے کو اپنے ملک لے گئی وہاں یہ بتایا جائے کہ یہ گدھا صنعاء کا ہے تو وہاں کے لوگ سوچیں گے کہ صنعاء میں گدھوں سے بڑی کوئی کام کی چیز ہی نہیں تھی۔ جو سلطان کی بیوی گدھوں کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اور میں نہیں چاہتا کہ تاریخ میں یہ بات میرے شہر کے حوالے سے کی جائے کہ وہاں کی بہترین چیز گدھے تھے۔

سبق: آپ اپنے وطن سے محبت کریں یا نفرت آپ کا پہلا اور آخری حوالہ وطن ہوتا ہے۔ آپ اپنی ذاتی حیثیت میں اس حوالے کی پہچان شناخت، تعارف کیسے کرواتے ہیں یہ سراسر آپ کی صوابدید پر ہے۔

اقصیٰ شہزاد...... تلہ گنگ

محبت

☆ ہر سچی محبت اور دوستی غیر متوقع تبدیلی کی کہانی ہے۔ اگر ہم محبت کرنے سے پہلے اور بعد میں ایک ہی شخص ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے اتنی محبت نہیں کی۔ (ایلف شفق)

☆ جس محبت کی ہم امید کرتے ہیں وہ کبھی نہیں ملتی۔ لوگ ہم سے اپنے طریقے سے پیار کرتے ہیں، اس طریقے سے نہیں جس طرح ہم پیار کرنا چاہتے ہیں۔ (روزا ریگاس)

ظالم حکمران

ارسطو نے ایک دفعہ اپنے شاگردوں سے کہا: حکمران ظالم کب بنتا ہے؟

شاگردوں نے جواب دیا: "استاد محترم آپ بہتر جانتے ہیں۔"

ارسطو نے فرمایا: حکمران خود ظالم نہیں بنتا بلکہ عوام اس کو ظالم بنا دیتی ہے۔ جب ظالم حکمران کے ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھائی جائے گی تو اس کے ظلم کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ ظالم حکمران ایک فرد ہوتا ہے جبکہ اسے تقویت دینے والے کروڑوں ہوتے ہیں۔ اگر یہ کروڑوں مل کر ظلم ختم کرنا چاہیں تو یہ ان کے لیے مشکل کام نہیں۔ پس ظالم حکمران نہیں ہوتا۔ ظالم خود عوام ہوتی ہے۔

نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

زبان

میں نے اپنی بلی مرجینا کو بولنا سکھا دیا ہے۔ طوطے محض رٹے رٹائے جملے بولتے ہیں۔ بلی اگر بولنا سیکھ جائے تو گفتگو کرتی ہے۔ سوال کرتی ہے جواب دیتی ہے۔ لیکن ایک دن میں نے غور کیا کہ مرجینا مجھ سے میری زبان میں بات کرتی ہے لیکن دوسری بلیوں سے اشارے بازی ہی چلتی ہے۔

میں نے پوچھا: "مرجینا! تم بلیوں کو انسانی زبان کیوں نہیں سکھاتیں؟ اشاروں سے کام کیوں چلاتی ہو؟"

مرجینا نے کہا: "کوئی سمجھنا چاہے تو اشارہ کافی ہوتا ہے نہ سمجھنا چاہے تو انسان ہونا اور زبان جاننا بھی کام نہیں آتا۔" (مبشر علی زیدی...... سو لفظوں کی کہانی)

گجرا اور گاجریں

شیخ نے ہاتھوں پر پٹی باندھی ہوئی تھی اور بار بار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو دبا رہا تھا۔

کسی نے حیرت سے پوچھا: "کیا ہوا تجھے۔"

کہتا ہے: کچھ نہیں یار، بیوی نے میسج کیا تھا آفس سے واپسی پر "ہم گجرے" لیتے آنا۔ میں نے سوچا شاید جوس بنانا ہوگا اور جلد بازی میں گاجروں کو گجرے لکھ بیٹھی ہیں محترمہ۔ میں پانچ کلو گاجریں لے گیا۔ دو گھنٹے منہ بنائے رکھنے کے بعد اس نے الگ طریقے سے انتقام لیا...... گاجریں دھلوائیں۔ پھر چھیلنے کو کہا۔ پھر کدوکش کروائیں پھر حلوہ بنوایا۔ اب اس سے کہا ہے آئندہ کچھ بھی منگوانا ہو نا وائس میسج پر کیا کرو۔"

www.pklibrary.com

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

افشاں سمیع کی ڈائری میں تحریر

مظہر الحق کی غزل

ہماری چاہت کا لمحہ لمحہ وصال ہوتا، کمال ہوتا
تمہارا ہم سے بچھڑنا پل بھر محال ہوتا، کمال ہوتا

مری نظر میں ترا سراپا سنور رہا ہے جس طرح جاناں
تری نظر میں بھی گر یہ جمال ہوتا، کمال ہوتا

ہوا کی لہر پہ ڈولتے کچھ خزاں رسیدہ یہ زرد پتے
کسی کی چاہت میں تیرا بھی گر یہ حال ہوتا، کمال ہوتا

مجھے لے ڈوبی انا پرستی، مجھے وفا کا ہنر نہ آیا
جو چھوڑتے دونوں خو ہم اپنی کما ہوتا، کمال ہوتا

اے کاش کہ ہم تمہاری قربتوں کی حدتوں میں پگھلتے رہتے
حقیقتوں میں ڈھلا کبھی یہ خیال ہوتا، کمال ہوتا

تجھے جو معلوم ہوتے جاناں وفا کے رسم و رواج سارے
محبتوں میں ہمارا قصہ مثال ہوتا، کمال ہوتا

یہ رت خزاں کی، یہ شام کے پل، یہ تیری یادیں، یہ میرے آنسو
تمہاری فرقت کا گر کبھی نہ یہ جال ہوتا، کمال ہوتا

ایک خوب صورت نظم

محبت ریت جیسی تھی
مجھے یہ غلط فہمی تھی
کہ محبت ڈھیر ساری تھی
میں دونوں ہاتھوں بھر بھر کر
محبت سنبھالوں گی
زمانے سے چھپالوں گی
کبھی کھونے نہیں دوں گی
مگر، میں نے اسی ڈر سے
کہ محبت ہی نہ کھو جائے
یہ مٹھیاں بند رکھی تھیں
مگر جب مٹھیاں کھولیں
تو دونوں ہاتھ خالی تھے
محبت کیس والی تھے
کیونکہ محبت ریت جیسی تھی

زینب ظفر زریں کی ڈائری میں تحریر

جون ایلیا کی غزل

ہجر کی آنکھوں سے آنکھیں تو ملاتے جایئے
ہجر میں کرنا ہے کیا یہ تو بتاتے جایئے

بن کے خوشبو کی اداسی رہیے دل کے باغ میں
دور ہوتے جایئے نزدیک آتے جایئے

جاتے جاتے آپ اتنا کام تو کیجیے مرا
یاد کا سارا سروساماں جلاتے جایئے

رہ گئی امید تو برباد ہو جاؤں گا میں
جایئے تو پھر مجھے سچ مچ بھلاتے جایئے

آخری رشتہ تو ہم میں اک خوشی کا غم کا تھا
مسکراتے جایئے آنسو بہاتے جایئے

آپ کو جب مجھ سے شکوہ ہی نہیں کوئی تو پھر
آگ ہی دل میں لگانی ہے لگاتے جایئے

آپ کا مہمان ہوں میں آپ میرے میزبان
سو مجھے زہر مروت تو پلاتے جایئے

☆☆

pklibrary.com

www.pklibrary.com

کچھ موتی چنے ہیں...... ادارہ

کالے پانی کی سزا

طلب علمی کے زمانے میں بورڈنگ ہاؤس کی زندگی بسر کرنے کا ہم کو پورا تجربہ ہے مگر قسم لے لیجیے جو بورڈنگ ہاؤس کے ایک قانون کو بھی صحیح سالم چھوڑا ہو۔ اسکول ماسٹروں سے مرعوب ہونا۔ ہمارے نزدیک ہمیشہ ذلت کی بات تھی۔ البتہ ذرا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھنٹہ میں تھوڑی دیر کے لیے دم سادھ کر بیٹھنا پڑتا تھا مگر اب تو یہ حال ہے گویا ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی شادی کرلی ہے کیا مجال کہ بیگم صاحبہ کے ہوتے ہوئے ہم اپنے پیدائشی حق یعنی آزادی سے کوئی فائدہ اٹھاسکیں۔ صبح دیر سے سوکر اٹھیں تو منحوس منہ ہاتھ دھوئے بغیر چائے پی لیں تو اچھوت، دفتر دیر سے جانے کا ارادہ کریں تو کام چور نوالہ حاضر۔ جاڑے کا زمانہ اگر بغیر غسل کے ٹالنا چاہیں تو افیونی، تاش کھیلیں تو جواری، شطرنج سے دل بہلائیں تو نحوست کے ذمہ دار، باہر گھومنے جائیں تو آوارہ گرد، رات کو دیر میں لوٹ کر آئیں تو اعلیٰ درجہ کے بدمعاش، پتنگ اڑانے کا ارادہ کریں تو لوفر اور کچھ بھی نہ کریں یعنی خاموش بیٹھ کر اونگھیں یا منہ اٹھائے محض بیٹھے رہیں تو بے وقوف۔ اب آپ ہی بتایئے کہ یہ زندگی ایک شوہر زندگی ہے یا کالے پانی کی سزا پانے والے مجرم کی زندگی۔ (شوکت تھانوی...... قبطی)

ناشکری

ہمارے لیے چوبیس گھنٹوں میں پانچ بار اللہ کو یاد کرنا بہت مشکل ہے لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ اللہ چوبیس گھنٹوں میں ہر پل ہمارا خیال رکھے۔ ہمیں ہر نقصان سے بچائے، ہمیں ہر اس چیز سے نوازے جس کی ہمیں خواہش ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی نہ ہو تو ہم اللہ سے شکوہ کرنے لگتے ہیں ایسے بتاتے ہیں کہ اس نے ہمیں کتنا بدقسمت بنایا ہے۔ اپنی محرومیوں کا ماتم کرتے ہیں۔ یہاں اسی زمین پر ایسے لوگ ہیں جو اس طرح معذور ہیں کہ ذہن کے علاوہ ان کے جسم کا کوئی حصہ کام نہیں کرتا اور وہ پھر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں یہاں کتنے ہیں جن کے پورے کے پورے خاندان کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں وہ پھر بھی صبر کرتے ہیں۔ (عمیرہ احمد...... حاصل)

(فوزیہ ثمر بٹ...... گجرات)

نیکی اور بدی

یہ عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی اکتاہٹ ہے، بدی میں اتنی ہی رغبت ہے۔ عالم عالم کو دیکھ کر، شاعر، شاعر کو دیکھ کر سادھو، سادھو کو دیکھ کر جلتا ہے۔ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر جواری، جواری کو دیکھ کر شرابی، شرابی کو دیکھ کر، چور، چور کو دیکھ کر ہمدردی جتاتا ہے اور مدد کرتا ہے۔ ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت انہیں اٹھانے کے بجائے دو ٹھوکریں اور لگائیں گے کہ وہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ مگر ایک چور کو آفت میں دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ لیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اس لیے بدوں کی باہمی محبت ہوتی ہے۔ نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے اس لیے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ (پریم چند)

(اقرا اختر جنجوعہ...... تونسہ شریف)

☆☆

فرق

"صبر کرنے" اور "صبر آجانے" میں بہت فرق ہوتا ہے اپنے دل پر جبر کر کے اپنا حوصلہ آزما کر چپ سادھ لینا اول الذکر جبکہ رو دھو کر، اپنا غم منا کر آنکھوں میں آنسوؤں کی قلت ہوجانے کے بعد خاموشی اختیار کر لینا موخر الذکر کے زمرے میں آتا ہے۔ صبر کوئی کوئی "کرتا" ہے۔ صبر ہر ایک کو "آجاتا" ہے۔

(آمنہ ریاض...... مرگ وفا)

www.pklibrary.com

کام اور ورزش ساتھ ساتھ

ورزش بہت ضروری ہے اس لیے آج ایک ایسا طریقہ بتایا جارہا ہے۔ جس کی مدد سے آپ اپنے گھریلو کام کاج کے دوران ہی ورزش کرسکیں گی اور کام بھی مکمل ہوجائیں گے۔

کپڑوں کی دھلائی اور ورزش :ورزش کا فائدہ: کارڈیوویسکولر نظام، بازو کے پٹھے مضبوط ہوں گے۔

کافی اور چائے بناتے ہوئے ورزش: جب تک چائے کا پانی ابل رہا ہے تب تک ورزش کیجیے۔ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر نیچے کی طرف ایسے جھک جایے جیسے کرسی بن گئی ہوں۔ اس پوزیشن کو کم از کم 15 سیکنڈ برقرار رکھیں اور کم از کم ایک منٹ تک کئی بار دہرائیں۔

ورزش کا فائدہ: ران اور اس کے پٹھے مضبوط اور فعال ہوں گے۔

سنک کے پاس: اسکواٹ (Squats) نامی ورزش کے بارے میں جانتی ہیں؟ سنک کو تھام کر جھکیں اور اسکواٹ پوزیشن میں بیٹھ کر اٹھ کھڑی ہوں، ایسے جیسے آپ تصوراتی کرسی پر بیٹھ اور اٹھ رہی ہوں۔ سنک میں کئی برتن موجود ہوں گے، ہر تیسرے برتن کو دھونے کے بعد ایک اسکواٹ کیجیے۔ آپ کی ورزش شان دار انداز میں مکمل ہوجائے گی۔

ورزش کا فائدہ: نچلا دھڑ فعال ہوگا اور اس کو نئی قوت ملے گی۔

ہاتھ دھوتے وقت ورزش: جب ہاتھ دھونے بیسن کے قریب پہنچیں تو کاؤنٹر کو تھام کر اسٹینڈنگ پش اپ کیجیے۔ بیسن سے دو فٹ کی دوری پر کھڑی ہو کر دونوں ہاتھوں سے بیسن کاؤنٹر تھام لیجیے اور تقریباً 20 بار اسٹینڈنگ پش اپس کیجیے۔ دھیان رہے کہ اس دوران آپ کا جسم کسی تیر کی مانند سیدھا ہو۔

اس ورزش کا فائدہ: سینہ اور بازو کے پٹھے مضبوط ہوں گے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے ورزش: سارا دن ڈیسک پر بیٹھ کر کام کرنا آپ کی ذمہ داری ہے؟ اس دوران بھی ورزش ممکن ہے۔ کرسی کو ڈیسک سے قریب کیجیے۔ اپنے دونوں ہاتھ کی ہتھیلی سے ڈیسک کا کنارا تھام لیجیے اور ڈیسک کو اوپر کی جانب کھینچیے جیسے آپ ڈیسک کو اٹھانا چاہتی ہوں۔ یہ ورزش کم از کم تیس سیکنڈ جاری رکھیں۔ درمیان میں 10 سیکنڈ کا وقفہ لیجیے اور پھر دوبارہ دہرائیے۔

ورزش کا فائدہ: یہ جسم کے اوپر حصے کے لیے مفید ہے۔

موبائل پر بات چیت کے دوران ورزش: کسی میز سے ٹیک کر کھڑی ہوجائیں۔ اپنے بائیں پاؤں کو ترچھا، دائیں ٹانگ کو سیدھا رکھیں اور اسے زمین سے اوپر کی جانب اٹھائیں، جس قدر اٹھا سکیں۔ کم از کم 15 سیکنڈ ورزش جاری رکھیں اور ممکن ہو تو 30 سیکنڈ تک دورانیہ بڑھا دیں۔ 10 سیکنڈ کے وقفے کے بعد یہی ورزش دوسری ٹانگ پر دہرائیں یا پھر ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر پاؤں اوپر نیچے کریں ایسے جیسے بھاگ رہی ہوں۔

ورزش کا فائدہ: بازو اور ہاتھ کے لیے مفید ہے۔

کھانا پکاتے ہوئے ورزش: کھانا پکانے کی ابتدائی تیاری ہوجائے اور کچھ فرصت ہو تو باورچی خانے کے بیچ میں کھڑی ہو کر اپنے بازو سیدھے کرلیں، پھر ان کو گھما کر پچھلی جانب لے جائیں۔ اب ایک ہاتھ دوسرے سے ملانے کی کوشش کریں چند سیکنڈ بعد دوبارہ سامنے کی جانب لائیں اور دونوں ہاتھوں سے تالی بجائیں۔ ڈبل تالی نامی اس ورزش کو 50 بار دہرائیں۔ درمیان میں 10 سیکنڈ کا وقفہ بھی لیں اور بہترین نتائج کے لیے ورزش کے 2 راؤنڈ دہرایے۔

ورزش کا فائدہ: سینے اور بازو کی فعالیت بحال ہوگی۔

www.pklibrary.com

"کرن کا دستر خوان"

چکن اسٹیم پکوڑا ◊ مرچوں والے چائنیز آلو

چکن اسٹیم پکوڑا

اجزاء:

چکن (بڑے ٹکڑے)	نو عدد
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کٹا خشک دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
آئل	تلنے کے لیے
لہسن پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت
بیسن	دو کھانے کے چمچے
لیموں	ایک عدد
انڈا	ایک عدد
سفید تل	ایک کھانے کا چمچہ
زرد کھانے کا رنگ	ایک چٹکی
چلی ساس	دو کھانے کے چمچے
سویا ساس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

پہلے چکن پر کٹس لگالیں۔ چکن ایک پیالے میں ڈالیں پھر اس میں پسی لال مرچ، لہسن پاؤڈر، چلی ساس، سویا ساس، نمک ڈال کر پریشر ککر میں تھوڑا پانی ڈال کر پانچ منٹ کے لیے پکالیں۔ پھر چکن کی نکال کر بچے ہوئے پانی کو پکا کر خشک کرلیں، اتنا کہ گاڑھا پیسٹ بن جائے۔ اس پیسٹ کو ایک باؤل میں نکال کر اس میں کٹی لال مرچ، بیسن، سفید تل، زرد کھانے کا رنگ لیموں کا رس اور انڈا ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ چکن کی بوٹیوں پر اچھی طرح آمیزہ لگا کر ڈیپ فرائی کرلیں۔ اور گرم گرم پیش کرے۔

☆☆

مرچوں والے چائنیز آلو

اجزاء:

آلو	چار عدد
میدہ	ایک کھانے کا چمچہ
کارن فلور	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چمچہ
چینی	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
شملہ مرچ	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
ہری مرچیں	چھ عدد
کٹی ہوئی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹو کیچپ	دو چائے کے چمچے
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے اور دو کھانے کے چمچے

ترکیب:

آلوؤں کو اتنا ابالیں کہ ان میں تھوڑا سا کچا پن رہ جائے ان کے لمبائی میں موٹے ٹکڑے کاٹیں، پھر میدہ اور کارن فلور چھڑک دیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور آلو سنہری تل کر جذب کرنے والے کاغذ پر نکال لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے پہلے لہسن بھونیں۔ اس میں شملہ مرچ، پیاز، سویا ساس، سرکہ چینی، لال مرچ، ٹماٹو کیچپ اور نمک ڈال کر تیز آنچ پر بھونیں۔ اس میں پانی ڈال کر ابال آنے دیں، پھر چمچہ چلاتے ہوئے کارن فلور شامل کریں۔ چند منٹ پکا کر اس میں آلو اور ہری مرچیں ملا کر ڈش میں نکال لیں۔

☆☆

2

www.pklibrary.com

گاجر کھائیں صحت بنائیں

گاجر موسم سرما کی ایک مقبول سبزی ہے۔ گاجر کی تمام اقسام میں وٹامن سی پایا جاتا ہے۔

گاجر میں پروٹین، معدنیات اور وٹامنز بہت زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ گاجر اپنی گوں ناگوں خوبیوں کی وجہ سے کسی طرح بھی کاڈ لیور یا ریڈ پام آئل سے کم نہیں۔ گاجر کو صرف دھو کر کھانا چاہیے اسے چھیلنے سے معدنی اجزاء ضائع ہو جاتے ہیں۔

کمزور بچوں کو کھانا کھانے سے پہلے دس گرام گاجر کا جوس خالی معدہ پلایا جائے تو چند دنوں میں وہ صحت مند اور طاقت ور بن جاتے ہیں۔

گاجر کا جوس اسہال کا قدرتی علاج ہے۔ اس کے پینے سے پانی کی کمی دور ہو جاتی ہے۔ جسم میں پیدا شدہ نمکیاں جیسے پوٹاشیم، سلفر، سوڈیم، کیلشیم اور پوٹاشیم کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ گاجر کا جوس پینے سے پیکٹین حاصل ہوتا ہے جس سے آنتوں کی سوزش ختم ہو جاتی ہے۔ اور بیکٹیریا کی افزائش اور نشوونما رک جاتی ہے۔ قے رک جاتی ہے۔ بچوں کے لیے گاجر کا جوس بہت ہی فائدہ مند ہے۔ مشروب تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ آدھا کلو گاجروں کو 150 ملی لیٹر پانی میں اتنا ابالیں کہ گاجریں نرم پڑ جائیں۔ تھوڑی دیر تک ٹھنڈا ہونے دیں۔ پھر پانی کو نتھار لیں۔ اس پانی میں آدھا چمچہ نمک ملا لیں۔ اسہال کے مریضوں کو یہ مشروب آدھے آدھے گھنٹے بعد دیتے رہیں۔ 24 گھنٹے کے اندر اندر مریض میں بہتری کے آثار دکھائی دینے لگیں گے۔

گاجر سے کانجی بھی تیار کی جاتی ہے جو جگر اور قوت ہاضمہ کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہوتی ہے۔ یہ کانجی قبض کشا ہونے کے ساتھ ساتھ مصفی خون اور دل و دماغ کو قوت پہنچاتی ہے۔ گاجر کی کانجی بنانا بہت آسان ہے۔ طریقہ یہ ہے تازہ کالی گاجریں تین کلو لیں۔ چقندر ایک کلو، پانی دس لیٹر، باریک پسی ہوئی رائی 250 گرام، نمک 125 گرام، سرخ مرچ 15 سے 20 گرام، زیرہ سفید بھنا اور پسا ہوا 20 گرام لیں۔

کالی گاجروں اور چقندر کو پانی سے دھو کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ ایک مٹی کا گھڑا لے کر گاجریں اور چقندر گھڑے میں ڈال دیں۔ نمک، مرچ، زیرہ، رائی بھی گھڑے میں ڈال کر ہلائیں، تاکہ مسالا گاجروں میں مل جائے۔ اوپر سے دس لیٹر پانی گرم کر کے گھڑے میں ڈال کر منہ کسی کپڑے سے بند کر کے رکھ دیں۔ تین چار دنوں کے بعد سرخ رنگ کی کانجی تیار ہو جائے گی۔ اسے چھان کر پینا چاہیے۔ ہائی بلڈ پریشر کے مریض اگر یہ کانجی متواتر سے استعمال کرتے رہیں تو ان کا بلڈ پریشر نارمل ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کانجی میں نباتاتی آیوڈین گھلی ہوئی ہوتی ہے جو فشار خون کے عارضے میں مبتلا مریضوں کے لیے مفید رہتی ہے۔ یرقان کے مریض بھی کانجی پیتے رہنے سے شفایاب ہو جاتے ہیں۔ جن کی تلی بڑھ چکی ہو، اس کانجی کے استعمال سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یہ کانجی بہترین مصفی خون ہے۔ بہت زیادہ ہاضم ہے اور قبض کشا ہے اس میں بہت زیادہ فولاد ہوتی ہے جو جسم میں تازہ خون پیدا کرتی ہے۔

گاجر کا اچار بھی بنایا جاتا ہے جو مقوی معدہ اور ہاضم ہے۔ جن کا جگر بڑھا ہوا ہو، تلی (طحال) بڑھی ہوئی ہو انہیں گاجر کا اچار استعمال کرنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ اچار بنانے کے لیے گاجروں کو گول یا لمبائی سے کاٹ لیں، چند منٹ پانی میں ڈال کر گرم کریں پھر ہوا میں پھیلا کر خشک کر لیں۔ پانی خشک ہو جائے تو ان پر نمک مرچ اور دیگر مسالے چھڑک کر مٹی یا چینی کے برتن میں رکھ دیں۔ دن چار پانچ بار ہلاتے رہیں۔ جب ان کی رطوبت (نمی) خشک ہو جائے تو اس میں اتنا سرکہ ڈالیں کہ گاجریں ڈوب جائیں۔ پانچ سات دنوں میں اعلیٰ قسم کا گھریلو اچار تیار ہو جائے گا۔

www.pklibrary.com

موئل کو پتا چلے گا کہ فاطمہ کو یونی سے لینے جو شخص آتا تھا وہ فاطمہ کا شوہر تھا تب اسے اپنی کہی ہوئی باتوں پہ پچھتاوا ہوگا۔ اور اسی لیے وہ معافی مانگنے کے لیے اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ لیکن شمشاد اور فاطمہ کے درمیان ایسا کیا ہوا تھا جو انہیں الگ ہونا پڑا۔ (کہانی تو اچھی ہے لیکن دل کرتا ہے کہ ایک ہی نشست میں بیٹھ کے اینڈ تک پڑھ لوں) ''نسبت'' کیا نسبت سے شادی ہوئی۔ نکاح تو نکاح ہوتا ہے عام مولوی پڑھائے یا خاص......!!!

''دامن سحاب'' اب اسفند پچھتائے گا لیکن اب کیا ہوسکتا ہے جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔ رائٹر جی، اب جلدی سے اینڈ کردیں اور آپی اس کی جگہ مصباح علی سید یا نازیہ کنول نازی سے قسط وار ناول لکھوائیے گا۔ ''روشا اور مشاء کا رشتہ'' یہ ناولٹ بھی اچھا تھا۔ رشتہ نہ ہونے کی وجہ سے لڑکیاں سائیکو بھی ہوجاتی ہیں۔ اللہ کا شکر ہے ابھی تک اپنے ساتھ تو ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ہاں لیکن روشا کی طرح لڑکے بہت ریجیکٹ ہوئے ہیں۔ ہاہاہا کیونکہ میرے گھر والوں کو ابھی تک کوئی رشتہ پسند نہیں آیا۔

''تپتی دھوپ میں گھنی چھاؤں ہو تم'' حقیقت کے قریب تر تھا یہ ناولٹ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی اپنے کی کہانی ہو۔ مرتضیٰ اچھا تھا جو اس نے تارہ کو اپنا لیا۔ اور بھابھیاں تو ہوتی ہی ایسی ہیں لیکن کوئی کوئی۔ میری دو بھابھیاں بہت اچھی ہیں۔ بالکل بہنوں جیسا پیار ہے ہم میں۔ ''ڈگڈگی'' ایسا افسانہ پہلے بھی پڑھا تھا شاید۔ گھر والوں سے زیادہ پیار تو کوئی نہیں کرتا۔ ''سنی سنائی'' حیرت ہے زرینہ کو پہلے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ شگفتہ کس لڑکی کی بات کر رہی ہے۔ (سنی سنائی میں) ایسے ہی اپنی بیٹی کا گھر تباہ کردیا۔ لیکن چلو عقل تو آگئی آگے سے ایسا نہیں کرے گی۔ ''یہ رشتے'' یہ رشتے ہی تو مخلص ہوتے ہیں۔ باقی سب تو ضرورت پڑنے پر صرف مشورہ ہی دیتے ہیں ساتھ نہیں۔

''کرن کتاب'' کا سرورق کدھر گیا۔ ''بیوٹی باکس'' آپی کوئی ایسا ٹوٹکا بتائیں جس سے رنگت صاف ہوجائے۔ پلکیں لمبی ہوجائیں اور بال بھی۔

مُدیرہ کرن

نامے میرے نام

اقصیٰ شہزاد......تلہ گنگ

سرورق بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اداریہ بالکل ٹھیک لکھا آپ نے بس اللہ ہی ہمارے حالوں پر رحم کرے اور یہ سال اور اس سے آگے آنے والا ہر سال ہمارے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ آمین

آپ سب کو بھی نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے انشاء جی اور انیس الرحمٰن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔ ''حمد'' اور ''نعت رسول مقبول'' کو پڑھ کر دل کو سکون ملا۔ ''نیا سال نئی امیدیں'' سب کے جوابات اچھے تھے۔

''میری بھی سنیئے'' جویریہ نیر کو جانتی تو نہیں لیکن پھر بھی سن لی ہے ''تاش گھر'' 20 اقساط ہوگئی ہیں لیکن ابھی تک کوئی گتھی نہیں سلجھی لیکن انجام کسی کا بھی اچھا نہ ہوگا۔ رجبانی اور بستامی سرے کے حرامی ہیں۔ ذرا جو دل میں کسی رشتے کے لیے کوئی جذبات یا احساسات ہوں۔ ''حسن آرا بیگم'' واہ کیا کہنے۔ ذرا جو ٹھیک ٹوٹکا بتایا ہو۔ چٹی کوٹ والا واقعہ پڑھ کے تو ہنسی آگئی ''ابھی شام مت بجھانا'' جو دل کا اچھا ہوتا ہے دنیا اس کے ساتھ اسی طرح کرتی ہے جیسے ذکیہ کے ساتھ ہوا۔ (اسی لیے بندے کو چاہیے کہ اپنے حق میں تو بولے) سرفراز جیسے لوگ کہاں سے ملتے ہیں (مشاء جی) ذرا ہمیں بھی بتانا۔ ''لو اسٹوری'' لو اسٹوری کا تو ستیاناس ہوگیا۔ بیٹا فوت ہونے سے تو کام نہیں چلے گا اب ساسو ماں کو راضی کرنا ہے تو ان کے ساتھ ایسے ہی پیش آنا جیسے شادی میں آئی تھیں۔ ''صنم تراش'' فلک تنویر کا مکمل ناول اچھا تھا۔ (قاسم کو بیماری کون سی تھی) اگر مجسمہ سازی چھوڑنی ہی تھی تو پہلے چھوڑ دیتا، نغمہ سے تو نہ جدا ہوتا۔ ''سپاس گزار'' تو یہ وجہ تھی آئینور فاطمہ کے گم ہونے کی اور جب

www.pklibrary.com

ابھی بھی ہیں تو لبے لیکن دل کرتا ہے اور بھی ہوں۔

"کرن کا دستر خوان" سرائیکی زبان تو سنی تھی سرائیکی اچار کیا ہوتا ہے۔ "صحت" اللہ کا شکر ہے ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ "کرن کرن خوشبو" ہری مرچیں تو نومبر میں بھی تھیں۔ "یادوں کے دریچے" نوشی مغل کی غزل اچھی لگی۔ باقی دو غزلیں تو پچھر بارسی ہیں" کچھ موتی چنے ہیں" پہلا موتی اور نوشی مغل کا موتی اچھا لگا۔ اب آتے ہیں "نامے میرے نام" کی طرف۔ پہلا خط میرا...... بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ فوزیہ ثمر آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں فرمائے آمین۔ خدیجہ تطہیر سینہ فاروق آپ سے جویریہ بھی۔ حیرت ہوئی یہ فقرہ سہ بار پڑھا میں نے (یقین ہی نہیں آ رہا تھا) ام طیفور کو نہ پا کر مایوسی ہوئی لیکن وجہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت نصیب کرے اور ام طیفور اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

آپی اس بار پورا کرن بہت پرفیکٹ تھا۔ پورا پڑھا ہے ایک لائن نہیں چھوڑی۔ ایسے ہی آپ نے بھی نہیں چھوڑنی ہاہاہا۔ آخری بات آج 16 جنوری کو ہمارا چھوٹا بجیل ایک سال کا ہو گیا ہے۔ اللہ اسے صحت والی لمبی زندگی دے آمین۔ اس سے چھوٹے کا تنزیل احمد رکھا ہے۔ اچھا ہے نا۔

ج: اقصیٰ! اللہ تعالیٰ آپ کے گھر میں سب کو خوشیوں بھری عمر عطا فرمائے۔ اور دونوں بچوں کو نیک اور فرماں بردار بنائے۔ آمین

"سرخ" میں زرک خان کو کسی نے محبت سے نہیں سمجھایا تھا۔ باپ بھی سختی سے پیش آیا۔ نغمہ نے بھی بھائی کا ساتھ دیا۔ کچھ لوگ سختی سے ضد میں آجاتے ہیں انہیں صرف محبت کی زبان سمجھ میں آتی ہے۔ بیوٹی باکس میں ہم وقتاً فوقتاً رنگ گورا اور بال بڑھانے کے ٹوٹکے دیتے رہتے ہیں۔

نوشی مغل...... جلال پور بھٹیاں

سب سے پہلے میری طرف سے کرن کی دیوانیوں کو السلام علیکم۔ (کوئی جواب وی دے دتا کرو) نئے سال کی ایک خوشی تو مجھے موصول ہو گئی بس اب اللہ پاک شریروں کے شر سے محفوظ رکھے۔ ماڈل کی اکھیاں ایشوریا رائے جیسی لگیں اور آئی بروز پیارے لگے۔ کوئی ناں اپنا ٹائم آئے گا۔ (ہاہاہا)

"حمد و نعت" پڑھ کر اچھا لگا کیا میں بھی نعت لکھ کر بھیج سکتی ہوں آپی اس کے بعد شاہین جی پوچھ گچھ کر رہی تھیں رائٹر اور ڈرامے بازوں مطلب ڈرامہ نگاروں سے (ہی ہی ہی) میں آگے ٹر پئی تو "جویریہ نیئر" کچھ سنانا چاہ رہی تھیں سوان کی تسلی سے سنیں۔ فرچیچی "تاش گھر" میں چنگا پہلا کمال نیک ہون لگا سی کہ فیر روشن بی بی نے انوں ایلیس دا پوتر ابنا دتا، چول اکھٹے ہو گئے نیں سارے (ہاہاہا) باریشہ میری کم عقل بہن یہ تمہاری خوب صورتی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تو کوجی موجی ہی رہا کر۔ اس کے بعد انکل نفیل احمد کی وفات کا پتا چلا۔ اللہ پاک آپی ام طیفور اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے آمین۔ "حسن آرا بیگم" (ہاہاہا) ایک تو اکٹھے بیٹھ کر گزرے وقت کو یاد کرنا اور واقعات دوبارہ ذہن میں لانا (ہاہاہا) اف سواد آجاتا ہے۔ میں بھی اپنی نانو سے بہت باتیں پوچھتی ہوں پرانے زمانے کی۔ ویسے حسن آرا جی اج دے مشورے اپنے کول ہی رکھے سی ناں (ہاہاہا) "ڈگڈگی" دعا تمہارے دو ہزار فالورز ہوئے تو تم اتنی خوش ہو گئیں۔ میرے تو ایک آئی ڈی کے پچیس سو فالوورز ہیں ایویں تو تر دی پئی ایں۔ لیکن واقعی سوشل میڈیا سب فیک ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی جیسا خیال کوئی بھی نہیں رکھ سکتا کرن نے دعا کو مداری اور بندر والی مثال اچھی دی۔ اگلی کہانی پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ایک شعر لکھنا چاہتی ہوں۔

زندگی تیری ساری چالیں ایک طرف
میرا ہر بات پہ مسکرا دینا کمال رہا

نوشی مغل

ان جے کسی کڑی میرے شعر دی تعریف نہ کیتی تے میں رس پینا اونڈے نال۔ "دائرے" ویلڈن

www.pklibrary.com

عندلیب پرفیکٹ جا رہے او تسی۔ جو عیش و آرام ماں باپ کے گھر میں ہے ناں ں وہ سسرال میں ہرگز نہیں ہوسکتا۔ وہاں تو ہماری نکی نکی گل کو نوٹ کیا جائے گا۔ ماں باپ کے گھر تو ہم بقول "نہ فکر ناں فاقے عیش کر کاکے" موجیں مار رہے ہیں ہی ہی ہی "یہ رشتے" آپی اس سے کیا سبق حاصل کرنا تھا شاید یہ ہی کہ فیملی والے ہی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کا مشکل وقت میں خیال رکھتے ہیں جیسا کہ طاہر نے گھر کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے احساس کیا۔ آیم آئی رائٹ کڑیوں؟ "نسبت" اسامہ نام اب اچھا نہیں لگتا مجھے۔ اسامہ کے ابو اگر مولوی ثناء اللہ ٹائپ بنے ہی تھے تو مکمل بنتا تھا ناں (ہاہاہا) مسجد دے باہر ڈھول باجے آلے کھڑے کر کے چول ہی ماری تو (ہاہاہا) "سنی سنائی" (ہاہاہا) اس لیے کہتے ہیں کہ جب تک آنکھوں سے سن نہ لو اور کانوں سے دیکھ ناں لو یقین نہ کرو کسی پہ۔ او پس الٹا تو نہیں بول دیا میں نے؟ چلو تسی تے سیانے او سمجھ گئے ہونے (سوری فار الٹا بولنگ) ہاہاہا "لو اسٹوری" اس افسانے میں اردو کے اوکھے اوکھے حروف ایڈ تھے سو میں کیڑا اکھی سی (ہی ہی ہی) خیر پڑھی فروی کوئی ناں (ہاہاہا) ناولٹ روشا اور منشاء کا رشتہ ہنسی مذاق پر مبنی یہ کہانی اچھی لگی (ہاہاہا) یہ محاورہ سنا ہوا تھا کہ جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی لیکن جب ان دونوں کے فادرز خود ہی صلاح مشورہ کر کے بات چیت کر کے آئے تو مجھے محاورہ ذہن میں آیا کہ جب باپ باپ راضی تو کیا کریں گے باقی ہاہاہا (واہ واہ واہ) منشا محسن علی کا ناولٹ پڑھا اچھا لگا۔ لیکن آپی یہ بھنبھیریوں کس کو کہتے ہیں؟ بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا ذکیہ جو سب کے ساتھ بھلا کرتی تھی وہ خود ہی اکیلی ہو گئی شکر ہے سرفراز کی ماں جی صاف دل دی نکلی۔ "ام ہانی" کا ناول ٹاپ آف دی منتھ تھا۔ آصف نے چاہے خود ٹائم پاس کیا ہو لیکن ایک لڑکی کے لیے مشکلات تو کھڑی کر دیں ناں اور تارہ کی ماں سب کچھ جانتے ہوئے بھی بیٹی کے حق میں ہاں بول گئی تف ہے ویسے۔ جوانی میں شیطان ہمیں بہکاتا رہتا ہے اس لیے ہی تو اللہ عزوجل نے جوانی کی عبادت کو افضل قرار دیا ہے۔ اور نیلو باجی قسمے میرا دل کر رہا۔ اس ٹھنڈ اچ وی تینوں ای سی چلا کے اگے بٹھا دواں (ڈیگر جئی) اس کے بعد بات ہو جائے "کرن کتاب" کی تو بیوٹی بکس میں جھائیوں سے نجات کے طریقے بتائے جا رہے تھے۔ اس ٹھنڈ وچ میرے جئی کڑی منہ وی دھولوے تے بڑی گل اے (ہی ہی) نو نکے تے دور دی گل۔ "دسترخوان" میں پہنچی تو لائبہ ملک، فوزی آپو، عشو نور پہلے ہی براجمان تھیں۔ (ہاہاہا) سویٹیوں تے کج بچا ئی ای اس واسطے اگے ٹر گئی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" میں ماریہ نذیر کی تحریر سولہ آنے دل کو بھائی۔ اور اپنی تحریر بچے دو ہی اچھے ہاہاہا گل تے بچی ہی کہی میں لیکن ایک ٹمک ٹاک یاد آ گئی جس میں ٹمک ٹاکر کہتا ہے کہ ہے جذبہ جنوں تو ہمت نہ ہار (ھاھاھا) جسٹ آ کڈنگ۔ نامے میرے نام یہاں سب اپنے اپنے تبصرے پیش کر رہی تھیں۔ علینہ بتول دل کی گہرائیوں اور موٹروے کی لمبائیوں سے خوش آمدید آپ کا کیوٹی آپ میری فین نہیں بنو کیونکہ ٹھنڈ بہت ہے بلکہ بہن بنو۔ اس بہانے تین ٹائم چائے تو پلاؤ گی ناں مینوں (ہاہاہا) اور ڈیئر دعائے امید بھی میں ہی ہوں۔ فوزی آپی موبائل لے لیا یا میں اپنا کردہ بھیجوں آئی فون لے لینا فر مینوں وی اپنا نمبر دے ناں (ھی ھی ھی) لائبہ ملک مانا کہ ٹھنڈ کی وجہ سے آپ کے ہاتھ جم گئے ہیں لیکن ہمت کر لو جانی لکھنے کی۔ ویسے سولہ سترہ ماہ ہو گئے مجھے مسلسل لکھتے ہوئے اگر جو میں دو ماہ غائب ہو گئی تو مدیرہ آپی سمیت کیا کوئی مجھے یاد کرے گا یا میری کرن سے گمشدگی کی رپورٹ درج کروائے گا؟ ماہ رخ کیوٹی بس بے ہوش نہ ہونا باقی یاد بھی ان کو ہی کیا جاتا ہے جو دل کو اچھے لگیں ہائے تے کڑی نا نکے گھومن گئی سی فیر ودھیا ہو گیا۔ میرا تو اب نانو گھر جانا منع ہو گیا آھم م م (ہاہاہا) خیر اب وہ میرا ہی تو گھر ہے۔

www.pklibrary.com

ج: نوشی! جو قارئین اس محفل میں شرکت کرتی ہیں ہم ان کو یاد رکھتے ہیں۔ لیکن آپ کو تو آپ دلچسپ خطوط کی وجہ سے خاص طور پر یاد کریں گے۔ نعت آپ لکھ کر بھیج سکتی ہیں۔

"یہ رشتے" میں یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اس مہنگائی کے دور میں متوسط گھرانے کے افراد بے وجہ وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے وقت کو کسی نہ کسی بامقصد کاموں میں صرف کریں۔ جھینگری گوشت خور اڑنے والا کیڑا ہوتا ہے۔

اقرا خضر جنجوعہ...... تونسہ شریف

امید ہے مدیرہ محترمہ اور کرن سے منسلک تمام پیارے لوگ بخیر و عافیت ہوں گے۔ طویل غیر حاضری کے بعد واپس آئی ہوں 2012ء سے کرن پڑھنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ خط مختصر تحریر وغیرہ لکھے عائشہ جنجوعہ کے نام سے پھر گھر کی، مصروفیات و پڑھائی کے باعث رابطہ کٹ گیا تھا۔ اب دوبارہ بحال کیا امید اور کوشش ہے قائم رہے گا ان شاءاللہ۔

تمبر کا شمارہ ابھی مکمل نہیں پڑھا، اداریہ پڑھا اللہ کریم عافیت والا معاملہ فرمائیں۔ "حمد و نعت" سے دل و دماغ منور ہوئے "یادوں کے دریچے" میں جھانکا چنیدہ موتیوں کو پلے باندھ کر "نامے میرے نام" پہنچے۔ بہنوں کے کھٹے میٹھے، محبت بھرے نامے پڑھ کر اپنائیت کا احساس ہوا۔ کہانیاں مکمل نہیں پڑھیں ہمیشہ کی طرح عمدہ۔ سوچا تبصرہ لکھ لوں تاکہ بروقت پہنچ جائے۔

ج: اقرا! امید ہے کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود نامے میرے نام سے سلسلہ جوڑے رکھیں گی۔

لبنیٰ آصف...... کراچی

اللہ سب کو خوش و خرم رکھے اس ماہ کا رسالہ پڑھ کر لگا کہ انیس الرحمن کا اس دار فانی سے کوچ کرنا ادارے کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ پاک ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ اچھے لوگ ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔

اس ماہ کے رسالے میں "نیا سال نئی امیدیں" بہت زیادہ خوش ہوئے پڑھ کر اور ہم نے بھی بہت شکر ادا کیا اپنی کامیابیوں پر اور ناکامیوں کو دل سے نہ لگانے کا پختہ ارادہ کیا۔

افسانوں پر آئیں تو "روشا اور رمشا کا رشتہ" نازمین فردوس کا بہت پسند آیا۔ ام ہانی کا "تپتی دھوپ میں گھنی چھاؤں ہو تم" بہت اچھا سبق دے گیا۔ واقعی زبان کے الفاظ بہت سوچ سمجھ کر نکالنے چاہئیں کبھی کبھی دوسروں کی زندگیوں میں زہر گھولنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ افسانے سب اچھے تھے۔

اپنے افسانوں پر تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ سب حوصلہ بڑھا رہے ہیں۔ "سالگرہ مبارک" اور "لفظوں کی مار" پسند کرنے کا شکریہ سلسلے وار ابھی پڑھے نہیں "کرن کتاب" میں ترکیبیں تو اچار کی تھیں۔ باقی "کرن کرن خوشبو" ہر دفعہ کی طرح بہترین۔

رجب کے مہینے کی برکتیں ہم سب سمیٹیں اس دعا کے ساتھ۔

طیبہ شوکت...... مرید کے

ٹائٹل گرل کافی کیوٹ کیوٹ سی لگی میری دونوں آپیوں کو سلام فوزیہ ثمر اور نوشی مغل کیا حال ہے آپی میں تو دوستی کرنے سے ڈر رہی تھی مگر آپ نے میرا کام آسان کر دیا۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف "دل و جاں گنوا کر" کی قسط نہ پا کر دل تو اداس ہی ہو گیا۔ "دامن سحاب" میں مہوش جی یہ کیا کر رہی ہیں پہلے تو جرار اور حیا کا قصہ اتنی جلدی سیدھا کر دیا اور اب ان کا قصہ ہی نہیں دکھا رہے۔ صرف سلویٰ کا ہی چل رہا ہے۔ سلویٰ بسیط کے ساتھ ہی آئے گی۔ اور میں نے ایک بات پوچھنی تھی یہ احمل جی کون ہیں۔ مکمل ناول کیا کمال کا تھا ناولٹ ہلکا پھلکا پسند آیا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے اور باجی میری آواز

www.pklibrary.com

بہت بھاری ہے اس کا کیا کروں۔

''تاش گھر'' کہیں بورنگ تو کہیں امیزنگ ہو جاتا افسانے سب ہی اچھے تھے۔

ج: طیبہ !اعجل جی (امت المصور) خواتین ڈائجسٹ کی مدیرہ خصوصی ہیں۔اگر آپ کی آواز قدرتی یعنی پیدائشی بھاری ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

حسینہ کرم......لیہ سے

میری طرف سے سب کو سلام۔میرا پہلا سوال افسانہ لکھنے کا مکمل طریقہ بتا دیں۔یعنی کوئی اسپیشل ورق وغیرہ ملیں گے۔اور پوسٹ کا طریقہ بھی بتا دیں دوسرا سوال آپ صرف مشہور شاعروں کی غزلیں چھاپتے ہو کیوں؟ دوسروں کو بھی موقع ملنا چاہیے۔

اب چلتے ہیں اس ماہ کے کرن کی طرف ہاتھ میں آتے ہی دل کی دھڑکنیں بڑھا گیا۔سب سے پہلے نوشی آپی کا خط پڑھا۔نوشی جی ہم نے آمین بولا۔ویسے ہم بھی آپ سے متفق ہیں تین تین بچے پہلی بار سنا ہے۔آپ سے دوستی کرنی ہے۔جواب دیجیے گا۔باقی خط بھی اچھے تھے۔''نامے میرے نام'' میرا فیورٹ حصہ ہے۔

اس کے بعد فہرست پر نظر ڈالی۔ام طیفور کو نا پا کر ہمارا معصوم دل ڈوب سا گیا۔میں وی سارے کرن نوں پٹ مار یاہی ہی۔شاید فہرست میں نام لکھنا بھول گئے ہوں مگر ان کے شوہر کی وفات کا پڑھ کر سچ میں بہت دکھ ہوا۔ام طیفور جی ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اللہ آپ کو اور بچوں کو صبر دے آمین۔

پھر ''دامن سحاب'' پڑھی۔اسفند نے اچھا نہیں کیا سلویٰ کا یقین ہی نہیں کیا جس نے اس کی خاطر سب رشتے گنوائے۔آگے ہادی کی باتوں نے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔بس اینڈ اچھا ہو جائے۔''سپاس گزار'' کی تو کیا ہی بات ہے۔رکیں رکیں مطلب کھڑ جاؤ ماڈل دے مارے تے میں رسناں بھل گئی ساں اتنی سردی میں اوپر شال ہی اوڑھ لیتی۔خیر سرورق کافی پیارا تھا۔یہ تو فاطمہ نے سچ میں نکاح کر لیا مجھے تو لگا تھا کہ عباد کو غلط فہمی ہوئی ہے یہ رطابہ جیسی عورت بھی جھک نہیں سکتی۔

''تاش گھر'' ہر لڑکی کے بعد برا ہی ہو رہا ہے پلیز ایمل جی باریشہ کے ساتھ کچھ برا مت کریں۔ ورنہ میں رو پے ساں۔اس ماہ کی قسط اچھی رہی۔

مکمل ناول اس بار دو تھے ام ہانی آپ نے تو میرا دل چرا لیا انسان تو خطا کا پتلا ہے اتنی سی غلطی پہ اتنی بڑی سزا مجھے اکو زیادہ اچھا لگا مرتضیٰ سے۔ہم لڑکیاں بھی کبھی کبھی رشتوں میں توازن نہیں رکھ پاتیں۔نیلوفر نے اپنی تارہ کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔

''صنم تراش'' فلک جی اس بار اچھا لکھا آپ نے۔اینڈ میں سمجھ میں نہیں آیا وہ کون تھی نغمہ یا زرمینے۔فلک جی ویسے بیچ میں کون سی زبان استعمال کی تھی۔

افسانوں کی تو کیا ہی بات تھی۔ہر ایک اچھا پیغام لیے ہوئے تھا ''لو اسٹوری'' اینڈ نے تو دل کی دیواریں تک ہلا کر رکھ دیں۔عندلیب جی نے تو دل ہی موہ لیا۔بیٹیوں کو صرف ماں باپ کے گھر ہی ہنسنے بولنے کی آزادی ہوتی ہے ان کو سسرال سے ڈرانا بھی نہیں چاہیے۔باقی افسانے بھی اچھے تھے۔

''یادوں کے دریچے سے'' میں زبیر راج کی غزل نمبرون رہی۔حسن رضوی کو سمجھنے کی کوشش کی مگر ناکام ٹھہرے۔

ج: حسینہ کرم !افسانہ آپ کوئی سے بھی صفحات پر لکھ سکتی ہیں۔بس ایک لائن چھوڑ کر لکھیں اور صاف لکھیں کہ آسانی سے پڑھا جا سکے۔بھیجنے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ جیسے آپ نے یہ خط بھیجا ہے اسی طرح لفافے میں رکھ کر پوسٹ کر دیں۔کہانی کے آخر میں اپنا ایڈریس اور فون نمبر لکھیں۔دوسرا طریقہ ای میل کر سکتی ہیں۔کرن ڈائجسٹ پر لکھے ای میل ایڈریس پر۔آخر میں زرمینے تھی زرک کے ساتھ نغمہ نے اسے پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

☆☆